دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۱۶ ویں جلد

جولائی ۱۹۷۵ء تا دسمبر ۱۹۷۵ء

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن   عبد السلام قدوائی ندوی

معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۱۶

(بہ ترتیب حروف تہجی)

ماہ جولائی تا دسمبر ۱۹۷۵ء

شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱۔	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی	۱۶۵، ۲۴۵، ۴۰۵
۲۔	جناب الطاف حسین خان شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ	۲۶۳
۳۔	جناب جگن ناتھ آزاد	۲۵، ۳۳۹
۴۔	جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف دہلی	۳۰۰
۵۔	ریحانہ خاتون صاحبہ ایم اے، ایم فل شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ	۱۱۲
۶۔	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	۲، ۸۲، ۸۱، ۱۶۱، ۱۵۵، ۲۴۴، ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۴۵، ۴۰۰، ۴۷۶
۷۔	ضیاء الدین اصلاحی	
۸۔	عبد السلام قدوائی ندوی	۵، ۸۵، ۱، ۴۹، ۲۴۴، ۲، ۴۲۳، ۴۰۲
۹۔	مولانا عبد السلام ندوی مرحوم	۳۶۱، ۳۶۳
۱۰۔	جناب غلام محمد نظام الدین صاحب مغربی لکچرر وصدر شعبۂ تاریخ اردو آرٹس کالج، حیدرآباد دکن	۴۴
۱۱۔	جناب کبیر احمد صاحب جائسی استاذ شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی	۲۱۶
۱۲۔	جناب مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم مدرسہ جامعۃ الرشاد و یونانی مڈیکل کالج اعظم گڈھ	۴۶۲
۱۳۔	مولوی محمد عزیر صاحب بہاری مرکزی دار العلوم بنارس	۱۸۶، ۲۵۹

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱۴	جناب حکیم مولوی محمد عطاء الرحمٰن صاحب سیوانی ندوی لٹریری ریسرچ یونٹ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ	۴۳۹		**شعراء**	
			۱	جوہر - جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری	۵
۱۵	حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی	۲۰۴، ۲۳۱ ۲۸۶، ۳۴۵ ۱۳۷۶	۲	جناب خسروی صاحب کراچی	۵۳
۱۶	مولوی معین الدین صاحب استاذ اردو فارسی سیوا سدن کالج، برہان پور	۱۲۹	۳	جناب سالک رحمانی	۵
			۴	جناب نضا ابن فیضی	۷
۱۷	جناب ڈاکٹر نور السعید اختر صاحب استاذ فارسی مہاراشٹر کالج بمبئی	۴۴۸			

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۱۶

(بہ ترتیب حروف تہجی)

از جولائی ۱۹۷۵ء تا دسمبر ۱۹۷۵ء

شذرات	۴، ۸۲، ۱۶۲، ۲۴۴، ۳۲۲، ۴۰۲	۱۰۔ حافظ یزید بن ہارون السلمی	۳۴۵
مقالات		۱۱۔ خان آرزو اور نظریۂ توافق لسانین	۱۱۲
۱۔ ابوبکر رازی اور اسکی کتاب الحاوی	۴۲۰	۱۲۔ دنیا پورپ کا تیسرا الٰہی دور	۱۴۵، ۲۴۵
۲۔ استغنا اور بے نیازی	۲۸۶	۱۳۔ عربی شاعری مغلوں کے عہد میں	۳۶۱، ۴۶۳
۳۔ ایک ہندوستانی شاعر حافظ کے دیوان کا ایک نادر مخطوطہ	۲۱۰	۱۴۔ فخر الملک فضل اللہ العمید (توسکی)	۴۴۸
		۱۵۔ کلام اقبال میں عورت کا درجہ	۷۵
۴۔ بنات اسلام کی علمی و دینی خدمات	۴۰۵	۱۶۔ مولانا حبیب الرحمن خان ٹونکی	۸۵، ۵۰۵
۵۔ بھنی عثمانی سفارتی تعلقات	۴۴	۱۷۔ مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی	۱۸۶، ۲۵۹
۶۔ پچاسی سالہ جشن تعلیمی ندوۃ العلماء لکھنؤ	۳۶۹	۱۸۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی	۳۰۰
۷۔ جامع مسجد برہان پور کے کتبات (تعمیر مسجد کا کتبہ)	۱۲۹	۱۹۔ ہندوستان کے ایک قدیم صاحب دیوان صوفی شاعر	۲۷۳
۸۔ جاوید نامہ کے کردار	۴۳۹	۲۰۔ یہود اور قرآن مجید	۳۲۵
۹۔ جرأت حق گوئی	۲۰۴		

استدراک

مولانا شیخ حبیب الرحمن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۴۰۲

تلخیص و ترجمہ

اردو زبان کی عالمگیریت ۶۴

باب التقریظ والانتقاد

آج کا پاکستان ۷۰
دہان زخم ۳۱۲
کتاب النبات ۲۳۱

ادبیات

جذبات سالک ۷۵
غزلیں ۷۵،۱۵۴،۴
قطعات ۱۵۳

مطبوعات جدیدہ

۷۸، ۱۵۵، ۲۴۰، ۳۱۷، ۴۰۰، ۴۷۶

جولائی ۱۹۷۵ء

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۲۰

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

9/18

مرتبہ

سید صـ

معارف

Rs

سالانہ

بزم تیموریہ جلد اول

بزم تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امراء شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء و فضلاء، و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل، [illegible] جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار [illegible] کی جلد زیر ترتیب ہے۔

قیمت :- [illegible] روپے

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۱۶ ماہ جولائی ۱۹۷۵ء مطابق ماہ رجب المرجب ۱۳۹۵ھ عدد ۱

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبدالرحمٰن — ۲-۴

مقالات

مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی — مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی — ۵-۲۴

کلام اقبال میں عورت کا درجہ — جناب جگن ناتھ آزاد — ۲۵-۴۳

بہمنی عثمانی سفارتی تعلقات — جناب غلام محمد نظام الدین صاحب — ۴۴-۶۳
مغربی لکچرر و صدر شعبۂ تاریخ اردو
آرٹس کالج، حیدرآباد دکن،

تلخیص و ترجمہ

اردو زبان کی عالمگیریت — محمد نعیم صدیقی ایم اے علیگ — ۶۴-۶۹

باب التقریظ والانتقاد

"آج کا پاکستان" — ضیاء الدین صلاحی، — ۷۰-۷۷

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۷۸-۸۰

شذرات

دینی تعلیمی کاؤنسل اترپردیش گذشتہ سولہ سال سے کام کر رہی ہے، اس کا مقصد مسلمان بچوں اور بچیوں کیلئے اُردو کے ذریعہ ایسی دینی تعلیم کا انتظام کرنا ہے جس سے وہ اچھے شہری ہونے کے ساتھ اچھے مسلمان بن کر اپنی ایمانی، رُوحانی اور تہذیبی خصوصیات کو باقی رکھیں،

اس کی ابتدائی تحریک ۱۹۵۹ء میں مشرقی یو۔ پی کے ایک ضلع بستی میں ہوئی، مگر اس کے کچھ مخلص کارکنوں کی قوت ارادی کی بدولت اب یہ پورے اترپردیش کی ایک منظم جماعت بن گئی ہے۔ اس کی طرف سے اب تک یو۔ پی کے مختلف حصوں میں ہزاروں خودکفیل مکاتب کھولے جا چکے ہیں جن میں تقریباً سات لاکھ بچے اور بچیاں اس کی تیار کردہ درسی کتابوں کے ذریعہ زیر تعلیم ہیں اس وقت اترپردیش میں ۳۶ لاکھ مسلمان بچے اور بچیاں ہیں جن کیلئے بھی ایسے مکاتب کھولنے کی ضرورت ہے مگر یہ کام مالی وسائل کی کمی اور قانونی دقتوں کی وجہ سے آسان نہیں مگر اس کے کارکنوں کا اخلاص اور عزم کی پختگی اس نسل کا اصلی سرمایہ ہے، امید ہے کہ وہ ساری مشکلات پر قابو پالیں گے، مولانا ابوالحسن علی ندوی اس کے دل، جناب قاضی عدیل عباسی صاحب اس کے دماغ، جناب ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر اشتیاق قریشی، جناب ریاض الدین احمد اور مولوی محمود حسن اس کے اعضا ہیں، انہی کی بدولت یہ سرگرم عمل ہے اس سے متاثر ہو کر بہار، کرناٹک، آندھرا اور مدھیہ پردیش میں بھی اس قسم کی سرگرمیاں جاری ہو چکی ہیں، اس کے کارکن اپنی مخلصانہ کوششوں کے لئے تعریف و مبارکباد کے مستحق ہیں،

یہ کاؤنسل کچھ وقفے کے بعد اپنی ریاستی کانفرنس بھی کر لی ہے، اس کی چوتھی کانفرنس ۲۲، ۲۳ جون کو لکھنؤ میں ہوئی، اس کے کھلے اجلاس سے پہلے ایک سیمینار بھی ہوا جس میں اردو کی اہمیت اور افادیت پر مفید مقالے پڑھے گئے، مگر اردو زبان اب مقالہ نگاری کی خواہاں نہیں، وہ اپنے بولنے والے اور حامیوں سے ایسی عملی قربانی اور خون جگر کی طالب ہے جو اس کو وہ مقام دلا سکے جس کی وہ مستحق ہے آج پیش کرنا [illegible]

گئے۔ اجلاس میں بڑی تعداد میں مسلمان شریک ہوئے، اس کا افتتاح مولانا منت اللہ رحمانی صاحب امیر شریعت بہار نے کیا، انھوں نے اپنے پُرمغز اور کارآمد خطبہ میں مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ اُن کے بچوں کا اپنے دینی تصورات اور اعتقادات پر قائم رہنا اُن کا فطری حق ہے جو چھینا نہیں جا سکتا ہے، اس کو حاصل کرنا اُن کا فریضہ ہے۔ امید کہ یہ پیغام ہندوستان کے ہر حصہ میں پہونچے گا۔

اس کانفرنس کی صدارت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کی، اپنے خطبۂ صدارت میں اُن کی جراحتِ دل کا درد تھا، بڑی تلخ نوائی سے اپنی ملت کا بھی احتساب کیا کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ اس نے اپنی دینی، روحانی، اخلاقی اور لسانی امنگوں کی تکمیل کرنے میں کون سی جدوجہد کا ثبوت دیا، انھوں نے اس اجلاس کے آخر میں ایک بہت ہی مؤثر اور مدلل تقریر میں یہ بھی کہا کہ اگر مسلمان اپنی غفلت اور بے عملی سے اپنی ملی صحت خود بگاڑ چکیں گے تو پھر پڑے سے بڑے صلحا، اور اتقیا بھی زندہ ہو کر اس کو توانا اور صحت مند نہیں بنا سکتے، اُن کا یہ احتساب اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے، اس وقت تو صرف ع تقدیر کو روتا ہے مسلمان تہ محراب لیکن تقدیر ہی تدبیر سے ہر زمانہ میں بنتی رہی ہے،

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

مگر یہ بھی صحیح ہے کہ سامعین کی خاموش نگاہیں یہ کہہ رہی تھیں،

خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد

اس وقت مسلمان ایسے معمار کے منتظر ہیں جو اپنے خونِ رگ کی گرمی سے ان کی زندگی کی تعمیر از سرِ نو کر دے، وہ بے عمل ضرور ہو چکے ہیں، مگر ان کا نفسیاتی ذہن بہت زیادہ نہیں بگڑا ہے، وہ ایمان کے جوہرِ لازوال سے یکسر محروم نہیں ہوئے ہیں، اُن کی اکثریت اس کی خواہاں ہے کہ وہ اپنے اخلاق و کردار سے اچھے شہری اور محبِ وطن بھی بنیں اور اُن کے ذہنی حصار کی سرحدیں بھی ہر طرح کے جارحانہ یلغار سے محفوظ رہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں کیسے حاصل ہوں، قیادت مقتدیوں میں حرکت چاہتی ہے، مقتدی

قیادت کی دست گیری کے طلب گار ہیں، اگر دونوں طرح طرح کی مشکلات میں محصور ہیں جن سے دونوں کی تعمیری اور عملی قوتیں دبتی چلی جاتی ہیں، دونوں کی نگاہیں غیر شعوری طور پر ایک دوسرے سے پوچھ رہی ہیں، کہ دبی قوتیں کیسے ابھریں اور کیونکر ابھاری جائیں، ابھرنے اور ابھارنے کی اس کشمکش میں زیادہ ذمہ داری قیادت پر آتی ہے "۔

جو دلوں کو فتح کرے وہی فاتح زمانہ

دار المصنفین میں تصنیف و تالیف اور طباعت کا کام حسب دستور جاری ہے، مگر بجلی کی دائم کمی کی وجہ سے اس کے پریس کی طباعت کی کارگذاری خاطر خواہ نہیں، وقت پر بجلی نہ ملنے کی وجہ سے اس کے کارکن اکثر بیکار بیٹھے رہتے ہیں، اس لئے پرانی اور نئی کتابوں کی طباعت میں غیر معمولی تاخیر ہو جاتی ہے، پھر بھی اس سال اب تک تین نئی کتابیں خریطۂ جواہر، ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں جلد دوم، اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری جلد اول چھپ چکی ہیں، غالب: مدح و قدح کی روشنی میں، جلد اول کا نصف حصہ چھپ چکا ہے، پوری کتاب جلد چھپ کر ناظرین کے ہاتھوں میں آجائے گی،

کاغذ کی گرانی اور طباعت کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے یہاں کی مطبوعات کی قیمت میں نظر ثانی کر کے اس میں ۲۵ فی صدی کا اضافہ کر دیا گیا ہے، پھر بھی دوسری جگہوں کی کتابوں کے مقابلہ میں ہماری مطبوعات سستی ہیں، علمی جواہر پاروں کا ایک قدرداں ان کی قیمت کا خیال نہیں کرتا، بلکہ ان کو خریدتے وقت خوش ہو کر یہ کہتا ہے،

جاں دے چند داد م جاں خریدم

مقالات

مولانا حیدر حسن خان ٹونکی

از
جناب مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

(۲)

نواب صاحب نے سید صاحب اور ان کے رفقاء کے حالات اور جہاد کے واقعات مستند عینی شاہدوں سے بڑی تفصیل سے لکھوائے تھے، جو سید صاحب اور ان کی تحریک جہاد کے بارہ میں لکھنے والوں کے لیے اہم ماخذ ہے۔ نواب صاحب کی دینداری کا اثر ان کے سارے خاندان پر تھا، اور سب عقیدہ کی صحت، عمل کی درستی، علم کی قدر، اور علماء کی عقیدت میں ممتاز تھے، مولوی صاحب کے زمانہ میں نواب وزیر الدولہ تو نہ تھے مگر ان کے جانشین اور اہل خاندان علم کی اشاعت اور علماء کی قدردانی کا وہی جذبہ رکھتے تھے۔

ٹونک کے مدارس، نواب ابراہیم علی والی ریاست تھے اس زمانہ میں ٹونک میں دو اہم درسگاہیں تھیں ایک کا نام مدرسۂ خلیلیہ تھا، اور دوسرے کا ناصریہ۔ مدرسۂ خلیلیہ کے صدر المدرسین مولانا عبدالحق خیرآبادی کے نامور شاگرد حکیم برکات احمد صاحب تھے اس کے سرپرست نواب ابراہیم علی خاں تھے، اور مدرسۂ ناصریہ کے سرپرست نواب صاحب کے بھائی صاحبزادہ عبدالرحیم صاحب تھے، ٹونک کے امراء میں جتنی دینداری اور خاکساری تھی اس کا

یقین کرنا دشوار ہوتا۔ اگر اپنی آنکھوں سے اس دور کی جھلک نہ دیکھی ہوتی، میں اودھ کے تعلقداروں کے جاہ و جلال کو دیکھ چکا تھا، ٹونک جب گیا اور وہاں کے جاگیرداروں اور نواب صاحب کے اہل خاندان سے ملنے کا اتفاق ہوا تو ان کے انکسار اور سادگی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔"

ملازمت | صاحبزادہ عبدالرحیم کے جذبۂ دینی نے مدرسہ ناصریہ کو علوم دینیہ اور فنون عقلیہ کا مرکز بنا دیا، ان کی قدر دانی سے یہاں بہت سے ذی استعداد مدرس جمع ہو گئے، مولانا حیدر حسن خان تکمیل علوم سے فارغ ہو کر ٹونک پہونچے تو صاحبزادہ صاحب کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور انھیں بھی تدریس کی خدمت سپرد کر دی، مولوی صاحب ابھی نو وارد تھے مگر جلد ہی ان کی صلاحیت و استعداد کے جوہر کھلنے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کی مہارت فن اور قوت تدریس کی دھوم مچ گئی، ٹونک اہل کمال کا مرکز تھا، بڑے بڑے جید علماء کی مسندیں بچھی ہوئی تھیں، خود مدرسہ ناصریہ میں بھی اہل کمال کا مجمع تھا، اور مولانا سیف الرحمٰن[1] جیسے ذہین و طباع، صاحب فکر و نظر اور نکتہ سنج و خوش بیان استاد موجود تھے، ایسے حالات میں کسی نئے آدمی کی دال گلنا مشکل تھی مگر چند ہی مہینے میں سربرآوردہ علماء اور برسوں کے منجھے ہوئے اساتذہ ان کی استعداد کے قائل ہو گئے اور طلبہ کھنچ کھنچ کر ان کے درس میں جمع ہونے لگے۔

---

[1] مولانا سیف الرحمٰن اصلاً افغانستان کے باشندہ تھے، وہیں پڑھے اور متوسطات تک تعلیم حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستان آئے اور مولانا لطف اللہ سے علی گڑھ میں رہ کر استفادہ کیا، پھر مولانا رشید احمد گنگوہی سے حدیث شریف کی تکمیل تعلیم حاصل کی، اور ان کی خدمت میں کچھ عرصہ رہ کر کسب فیض کیا، پھر ٹونک آئے، وہاں قاضی محمد دست کابلی کی صاحبزادی سے شادی ہوئی اور وہیں آباد ہو گئے، مدرسہ ناصریہ میں مدرس مقرر ہوئے، بہت عرصہ تک وہاں درس دیتے رہے، پھر دہلی آئے اور مدرسہ فتحپوری میں استاد ہو گئے، ان کو انگریزوں کا تسلط ناپسند تھا، اور ان سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جذبہ جہاد دل میں رکھتے تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن کی صحبت میں اس جذبہ کو

(بقیہ حاشیہ ص ۵)

سفرِ حج اور بیعت مدرسہ ناصریہ کی ملازمت کے زمانہ میں مولانا کو حج کا موقع مل گیا، اور فریضۂ حج کی ادائیگی اور مدینہ منورہ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس سلسلہ میں حرمین شریفین کے فیوض و برکات سے مستفید ہونے کے علاوہ بہت سے علما و مشائخ سے ملاقات کا موقع بھی ملا، ان سے تفسیر و حدیث، فقہ و اصول اور اخلاق و تصوف کے بہت سے مسائل پر گفتگو ہوئی بہت سی نایاب کتابیں نظر سے گزریں جن سے علم و فن کے نئے نئے گوشے سامنے آئے علمائے حرمین کی مجالس درس میں بھی شریک ہوئے اور ان کے افکار و خیالات اور ان کے طریقۂ درس سے واقفیت حاصل کی۔

مولانا کو ایک عرصہ سے خیال تھا کہ کسی صاحب نسبت بزرگ سے بیعت ہو جائیں، ہندوستان میں بہت سے بزرگ موجود تھے، بعض بزرگوں سے ملاقات بھی کی تھی مگر ابھی تک کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیا تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بچپن سے کان میں پڑا تھا۔ مکہ معظمہ پہونچے تو ان کی زیارت کی خواہش ہوئی، حاضر خدمت ہوئے تو بہت متاثر ہوئے، اور دل نے کہا کہ اسی آستانہ کو عقیدت کا مرکز بنانا چاہئے، حاجی صاحب سے درخواست کی کہ داخل سلسلہ فرما لیجئے، ان کو بھی ان کے اندر طلب صادق نظر آئی، اور حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا۔ ایک سال تک مولانا جم کر، حاجی صاحب کی خدمت میں رہے اور ان کی

(بقیہ حاشیہ ص ۔) تقویت ہوئی، اور ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) میں ان کے اشارہ سے سرحد پہنچ گئے، اور حاجی ترنگ زئی کے ساتھ مل کر انگریزوں سے جہاد شروع کر دیا، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو کابل چلے گئے، انگریزوں نے ان کو حوالہ کرنے کے لئے امیر حبیب اللہ خاں پر دباؤ ڈالا تو یاغستان چلے آئے، امان اللہ خان بادشاہ ہوئے تو کابل واپس آگئے، اور معزز خدمات پر مامور رہے، ہندوستان کی آزادی کے بعد پشاور چلے گئے، اور وہیں اپنے گاؤں متھرا میں ۱۳۶۹ھ (۱۹۴۹ء) میں وفات پائی، مولوی صاحب ان کی ذہانت، علمی قابلیت اور مجاہدانہ جذبات کا بہت ذکر کرتے رہتے تھے۔

ہدایت کے مطابق اذکار و اشغال میں مصروف رہے، اور اس راہ میں ایسی صلاحیت پیدا کر لی کہ حاجی صاحب نے خلافت سے سرفراز فرمایا، مولوی صاحب نے اس موقع پر عرض کیا کہ حضرت میں تو درس تدریس میں مشغول رہتا ہوں، اس بارہ میں آپ کا کیا حکم ہے؟ حاجی صاحب نے فرمایا آپ بہت اچھا کام کر رہے ہیں اس مبارک مشغلے میں لگے رہیے، اس کے ساتھ کچھ اور اذکار کی تلقین کی اور ایک خاص نصیحت یہ کی کہ امرا سے تعلق نہ رکھئے اور انکی صحبت سے دور رہیے۔

مرشد کی ہدایت پر عمل مولوی صاحب نے مرشد کی یہ ہدایت گرہ میں باندھ لی، اور ساری زندگی اس پر عمل کرتے رہے، سفر و حضر، آرام و تکلیف کسی حال میں تہجد کی نماز ترک ہونے دی، نہ ان اوراد و اشغال میں کبھی فرق آنے دیا، جن کی بجا آوری کی حاجی صاحب نے تاکید کی تھی، کچھ رات رہے بیدار ہو جاتے، بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ تہجد پڑھتے اس میں ان کی قرات بڑی موثر ہوتی، طویل قیام کے ساتھ رکوع و سجود بھی طویل کرتے، رکعتیں پوری کرنے کے بعد صبح تک وظائف میں مشغول رہتے، صبح کی نماز اول وقت، اندھیرے (غلس) میں پڑھتے، اس میں بھی طویل سورتیں پڑھتے اور انھیں کی مناسبت سے رکوع و سجود بھی دیر تک کرتے رہتے، اگر کوئی رکوع کی حالت میں پہونچتا تو اطمینان سے ستین پڑھ کر رکوع میں شریک ہو جاتا اور تیز رفتار اشخاص تو وضو بھی کر لیتے، صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک چہرہ پر ایک کپڑا ڈال لیتے اور حاجی صاحب کے تلقین کردہ ایک خاص وظیفہ میں مصروف رہتے پھر اشراق کی نماز پڑھ کر اپنے کاموں میں لگتے۔

امراء و حکام سے احتراز حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ امیروں سے تعلق نہ رکھنا ان سے بڑا دین کا ضرر ہوتا ہے، اس ارشاد پر اس شدت سے عمل کیا کہ کبھی کسی امیر یا والی حکومت کا

منہ بھی نہیں دیکھا، مولانا ٹونک کے باشندہ تھے، ریاست کے حالات سے جو لوگ واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہاں اس ہدایت پر عمل کتنا خطرناک ہو سکتا تھا، ۱۹۲۱ء میں جب ہندوستان میں آزادی کی تحریک کا زور تھا تو ٹونک کے باشندوں نے بھی آزادی کا مطالبہ کیا، اس تحریک میں سادات قافلہ پیش پیش تھے، چند دن آزادی پسندوں کا زور رہا، پھر نواب نے اپنی وفادار فوج کی مدد سے اپنے اقتدار کو مستحکم کر لیا، سادات کی جائیدادیں ضبط ہوئیں، اور انھیں ریاست سے خارج کر دیا گیا۔ مولوی صاحب کے سادات سے دیرینہ تعلقات تھے، ان میں ان کے دوست اور عزیز شاگرد تھے، اس بنا پر ان کو بھی شبہہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، شہر کے دوسرے مشتبہ لوگوں نے نواب صاحب اور ان کے متوسلین سے مل کر اپنی صفائی پیش کی اور وفاداری کا یقین دلایا، مگر مولوی صاحب نواب صاحب کی خدمت میں نہ گئے، ان کے ہمدردوں نے ان کی طرف سے صفائی پیش کی، نواب صاحب نے کہا اچھا انھیں میرے پاس لے آؤ، ان لوگوں نے بڑی منت سماجت کی، اور عرض کیا کہ اس وقت نواب صاحب سے ملاقات ضروری ہے، ورنہ وہ بدظن ہو جائیں گے، مگر مولوی صاحب مرشد کی نصیحت کو نظر انداز کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے، جتنی تاخیر ہوتی جاتی تھی اسی قدر بدظنی میں اضافہ کا امکان بڑھتا جاتا تھا، نواب صاحب کے مقربین میں جو لوگ مولوی صاحب کے ہمدرد تھے انھوں نے نواب صاحب کو ان کی خیر خواہی کا یقین دلایا لیکن نواب صاحب نے کہا کہ یہ کیسا خیر خواہ ہے، جو میری صورت سے بیزار ہے، حالات بے حد خطرناک تھے، مگر مولوی صاحب حاجی صاحب کی ہدایت پر جمے رہے، بالآخر ان کے بھائیوں اور عزیزوں نے مشورہ دیا کہ نواب صاحب سے نہیں ملتے ہو تو پھر گھر بار چھوڑ کر ریاست سے باہر چلے جاؤ، چنانچہ وہ کئی برس تک ٹونک

نہیں گئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ نواب صاحب بہت بیمار ہوئے مشیروں نے مشورہ دیا کہ ریاست کے تمام علماء و مشائخ آیات شفاء پڑھ کر نواب صاحب پر دم کریں، اس موقع پر بھی مولوی صاحب نے گریز کرنا چاہا مگر دوستوں نے سمجھایا کہ یہ بڑا نازک وقت ہے سب لوگ دم کرنے جارہے ہیں آپ نہ گئے تو بدگمانی ہوگی، جب لوگوں نے بہت سمجھایا تو گئے اور آیتیں پڑھ کر دم کر دیں مگر نواب کے چہرہ پر نظر نہیں ڈالی۔

نواب ابراہیم علی خاں کے انتقال کے بعد نواب سعادت علی خاں ان کے جانشیں ہوئے تو ان کے ساتھ بھی مولوی صاحب کا یہی معاملہ رہا۔ بے تعلقی کی وجہ سے مولوی صاحب ان کو پہچانتے نہ تھے، ایک تقریب میں مولوی صاحب شریک تھے نواب صاحب بھی آ گئے، مولوی صاحب نے پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا اس لیے پہچان نہ سکے مگر جب صاحب خانہ نے بتلایا تب بھی ملنے کی کوشش نہیں کی، مولوی صاحب کا زندگی بھر یہی معمول رہا، اور اس بارہ میں کسی مصلحت یا خوف کی کبھی پروا نہیں کی، اگر کسی دوسرے میں بھی یہ بات دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی امراء اور والیان ملک سے ربط ضبط پسند نہیں کرتے تھے، دارالعلوم دیوبند انھیں بہت عزیز تھا، اس کی خدمت میں انھوں نے اپنی زندگی لگا دی تھی، اس کے مصارف کے لیے سرمایہ کی فراہمی کی بڑی کوشش کرتے تھے، مگر اس غرض سے امیروں اور حکمرانوں کے در دولت پر دستک دینے کے بجائے عوام سے چندہ مانگنا پسند کرتے تھے، اور اس کو باعث خیر و برکت سمجھتے تھے، مولوی صاحب ان کی اس روش سے بہت خوش تھے، فرماتے تھے کہ ایک بار وہ رام پور آئے، شہر میں ان کا بڑا اثر وعظ ہوا جس میں بکثرت لوگ شریک ہوئے، اس موقع پر دارالعلوم کے لیے عوام سے چندہ

کی رسیل کی اور خاصی رقم جمع ہو گئی۔ نواب کلب علی خاں اس وقت زندہ تھے، ان کی داد و دہش کا بڑا شہرہ تھا، لوگوں نے توجہ بھی دلائی، بلکہ شاید یہ بھی کہا کہ نواب صاحب ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے مگر مولانا محمد قاسم نے معذرت کر دی مولوی صاحب اس واقعہ کو بیان کرتے تو بہت خوش ہوتے

صاحبان جاہ و تمکنت سے اعراض

مولوی صاحب والیان ملک کے علاوہ دوسرے اغنیاء، اہل ثروت اور اصحاب جاہ و حشم سے بھی راہ و رسم پسند نہیں کرتے تھے، والیان ملک کی طرح ان کی صورت دیکھنے سے احتراز تو نہ تھا، مگر ربط ضبط کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، علما رنامدار اور مشائخ ذی شان کی ملاقات سے بھی حتی الامکان اجتناب کرتے تھے کہتے تھے کہ یہ لوگ ہمہ وقت اپنے کو لئے دیئے رہتے ہیں نشست و برخاست، چال ڈھال اور بات چیت سب میں انکی ایک خاص شان ہوتی ہے، ایسے لوگوں سے مل کر مجھے خوشی نہیں ہوتی لیکن جو لوگ تمکنت سے پاک ہوتے اور خلوص سے ملتے ان کی قدر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی کام سے رامپور تشریف لے گئے۔ سامان سرائے میں رکھ دیا۔ پھر مولانا فضل حق[۱] سے ملنے مدرسہ عالیہ گئے،

۱؎ مولانا فضل حق رامپوری اپنے زمانہ میں بڑے صاحب علم و کمال اور چوٹی کے مدرس سمجھے جاتے تھے۔ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں رامپور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی پھر علی گڑھ اور دہلی میں مولانا لطف اللہ اور مولانا ہدایت علی سے متاخرین اور متقدمین کی اونچی کتابیں پڑھیں پھر مولانا عبدالحق خیرآبادی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے اور علوم عقلیہ میں کمال حاصل کیا، حدیث شریف کی تعلیم شیخ حسین یمانی سے حاصل کی تھی، وہ عقلی اور نقلی دونوں علوم سے واقف تھے لیکن معقولات سے زیادہ اشتغال رہا اور ان فنون میں صاحب نظر سمجھے جاتے تھے،

پہلے بریلی کے مدرسہ طالبیہ میں ملازم ہوئے، پھر بھوپال، رامپور اور کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰)

وہ بڑے تپاک سے ملے پھر پوچھا سامان کہاں ہے، یہ سن کر کہ شہر میں ہے کہا مجھ سے زیادہ آپ کی میزبانی کا مستحق اور کون ہوسکتا ہے پھر آدمی بھیج کر فوراً سامان منگوایا، مولوی صاحب نے کہا میں مولویوں سے مل کر کم ہی خوش ہوتا ہوں مگر آپ سے مل کر جی خوش ہوگیا، یہ حسن اخلاق کہاں سے آیا، فرمایا کہ میں نہ پیر ہوں نہ بڑا آدمی پھر رامپور کا پانی بھی اخلاق گر ہے۔ اس ملاقات کے بعد مولوی صاحب مولانا فضل حق کے گرویدہ ہوگئے اور زندگی بھر ان کی خوبیوں کا ذکر کرتے رہے،

تدریس کی شہرت سفر حج سے واپسی کے بعد حسب سابق مدرسہ ناصریہ میں پڑھانے لگے لیکن اب ان کی شہرت ٹونک ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ دور دور ان کا نام پہونچ گیا تھا۔ اور ملک کے دوسرے مدارس کے منتظمین کی ان پر نظر پڑنے لگی، اور زیادہ مشاہرہ پر طلب کئے جانے لگے، لیکن ان کی وفاداری اور قناعت پسندی نے ٹونک سے باہر قدم نکالنے کی اجازت نہ دی، ناظم ندوۃ العلماء حکیم سید عبدالحی صاحب کی جوہر شناس نگاہ نے ان کی صلاحیت کا پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا، وہ بھی مولانا لطف اللہ، مولانا غلام احمد اور شیخ حسین کے حلقۂ درس میں بیٹھ چکے تھے، انھیں مولانا کی لیاقت کا پورا علم تھا، اس لئے ان کی خواہش تھی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسند درس کو زینت

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱) تدریس کی خدمت انجام دی آخر میں مدرسہ عالیہ رامپور میں صدر المدرسین کے عہدہ پر فائز ہوئے اور آخر تک یہیں رہے، ان کی تصانیف میں ظفر جادی اور فصل التحقیقات فی مسئلۃ الصفات کے علاوہ تلویح حمد اللہ میرزاہد اور سید شریف پر حواشی، اور دروس البلاغہ کی شرح قابل ذکر ہیں علم و فضل میں اس کمال کے باوجود بڑے خلیق سادگی پسند اور خاکسار تھے ۱۳۵۸ھ (۱۹۳۹ء) میں رامپور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر)

بحیثیت حکیم صاحب مرحوم کی ٹونک میں عزیزداری تھی، ان کے عزیزوں سے مولانا کے گھرے روابط تھے، انھوں نے ان سب وسائل سے کام لیا لیکن صاحبزادہ عبدالرحیم سے مولانا کو ایسا تعلق خاطر تھا، اور ان کے دینی جذبہ، مذہبی شوق اور علمی قدردانی سے اتنے متاثر تھے کہ کسی طرح مدرسہ ناصریہ سے علحدہ ہونے اور ٹونک چھوڑ کر باہر جانے پر آمادہ نہ ہوئے لیکن حکیم صاحب کا اصرار جاری رہا۔

ناظم ندوۃ العلماء کا اصرار

۱۰ مئی ۱۹۲۱ء (یکم رمضان ۱۳۳۹ھ) کو صاحبزادہ عبدالرحیم کا انتقال ہوگیا، ادھر ندوہ میں شیخ الحدیث کی جگہ خالی تھی مولانا سید امیر علی[1] کی وفات ہوچکی تھی اور شیخ محمد عربؒ بھی جاچکے تھے، اس موقع پر حکیم صاحب کو پھر مولانا کا خیال آیا، اور بڑے اصرار سے بلایا اس مرتبہ وہ انکار نہ کرسکے، اس موقع پر ان کو اپنے محبوب استاد مولانا غلام احمد کی وصیت یاد آئی جو انھوں نے آخری بار بڑی تاکید کے ساتھ کی تھی مولوی صاحب

[1] مولانا سید امیر علی ملیح آباد ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے، علم وفضل میں بہت ممتاز تھے، خاص طور سے تفسیر وحدیث اور فقہ و اسماء الرجال پر ان کی نظر بڑی وسیع تھی تیس جلدوں میں مواہب الرحمٰن کے نام سے انھوں نے ایک بڑی جامع تفسیر لکھی فتاویٰ عالمگیری کی ضخیم جلدوں کا ترجمہ کیا عین الہدایہ کے نام سے ہدایہ کی شرح لکھی، یہ کتابیں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوچکی ہیں جہاں انھوں نے مدتوں عربی کتابوں کی تصحیح کا کام کیا تھا، مذکورۂ بالا کتابوں کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی لکھی تھیں جو زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکیں ان میں صحیح بخاری کی اردو شرح جو کئی جلدوں میں تھی نیز اسماء الرجال اور اصول فقہ پر چند کتابیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں، پتہ نہیں ان کتابوں کے مسودے اب کہاں ہیں۔

نول کشور پریس کی ملازمت کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس مقرر ہوئے پھر ارکان ندوۃ العلماء نے

کا بیان ہے کہ میں جب واپس آنے لگا تو حسب معمول کچھ دور تک ساتھ آئے جب رخصت ہو کر آگے بڑھا تو پھر آواز دی میں حاضر ہوا تو فرمایا مولوی جی ایک نصیحت کرتا ہوں اسکا خاص خیال رکھنا، دیکھو حدیث شریف سے زیادہ اشتغال رکھنا، اور اس کے درس کو سرمایۂ سعادت سمجھنا۔ ناظم ندوۃ العلماء نے دارالعلوم آنے کی دعوت دی اور خاص طور سے درس حدیث کی درخواست کی تو مولوی صاحب کو خیال ہوا کہ یہ خدا کی طرف سے استاد کی وصیت کی تعمیل کا موقع مل رہا ہے۔ یہ سوچ کر راضی ہوگئے اور منظوری کا خط لکھ دیا۔

ندوہ میں شیخ الحدیث | ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (اگست ۱۹۲۱ء) میں لکھنؤ تشریف لائے اور ندوہ میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے، اہل وعیال ساتھ نہیں تھے، سامان بھی زیادہ رکھنے کے عادی نہیں تھے، فرمایا کرتے تھے کہ آدمی کو ہلکا پھلکا رہنا چاہئے ملازمت کا کچھ اعتبار نہیں معلوم نہیں کس دن ملازم رکھنے والوں کا دل پھر جائے یا اپنا ہی جی نہ لگے آدمی کے ساتھ زیادہ جھمیلا نہ ہوگا تو آسانی سے اٹھ کھڑا ہوگا ورنہ زحمتیں پیش آئیں گی۔ ناظم صاحب نے درسگاہ ہی کے ایک

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳) انھیں دارالعلوم کا مہتمم (پرنسپل) اور صدر المدرسین بنایا وہیں ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) میں ان کا انتقال ہوا، ایک صاحبزادی تھیں، جن کی شادی اپنی زندگی ہی میں شیخ خلیل بن محمد عرب سے کر دی تھی، رقیہ اور عطیہ انھیں کی یادگار ہیں، جو علمی اور ادبی صلاحیت میں امتیاز رکھتی ہیں، ؎ شیخ محمد محدث کبیر شیخ حسین یمانی کے صاحبزادہ تھے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) میں یمن کے شہر حدیدہ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۵ء) میں بھوپال میں وفات پائی حدیث شریف اور عربی ادب میں خاص امتیاز تھا، ندوہ میں عرصہ تک استاد رہے، عربی کے بہترین قادر الکلام شاعر تھے الطراز الموشی فی فوائد الانشاء، اور المورد الصافی فی العروض والقوافی، ان کی قابل ذکر تصانیف ہیں جس طرح وہ ایک عظیم باپ کے بیٹے تھے اسی طرح ایک لائق بیٹے شیخ خلیل بن محمد عرب سابق لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی متوفی (۱۳۹۹ھ، ۱۹۷۹ء) کے باپ بھی تھے جنھوں نے باپ دادا کا نام بلند رکھا۔

حصہ میں قیام کا انتظام کر دیا، اور حدیث کی اونچی کتابوں کی تعلیم ان کے سپرد کر دی۔

اس زمانہ میں ندوہ کے مہتمم (پرنسپل) مولانا حفیظ اللہ صاحب[1] تھے، ان کو حدیث پڑھانے کا شوق تھا، صحیح مسلم ان کے پاس رہتی تھی، ان کا درس سادہ ہوتا تھا، حدیث کا مطلب بتا دیتے تھے لیکن مختلف فقہاء کے مذہب بیان کرنے اور ان کے دلائل فراہم کرنے سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ صحیح مسلم کے علاوہ صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داود مولانا حمید حسن خاں کے سپرد ہوئیں۔

---

[1] مولانا حفیظ اللہ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے نامور شاگرد تھے، بندی گھوڑ ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم غازی پور میں مولانا عبداللہ غازی پوری اور دوسرے علماء سے حاصل کی پھر لکھنؤ آکر مولانا عبدالحئی کے حلقہ درس میں شریک ہوئے، اور سند فراغت حاصل کی کچھ عرصہ تک کاکوری کے ایک اسکول میں مدرس رہے، پھر مولانا عبدالحئی نے لکھنؤ بلا کر اپنے داماد مولوی محمد یوسف کی تعلیم کی خدمت سپرد کی اس کے بعد رام پور گئے اور مدرسۂ عالیہ میں استاد مقرر ہوئے وہاں نو سال نیک نامی کے ساتھ تعلیمی خدمات انجام دیں قیام رامپور کے زمانہ کے بہت سے واقعات سنایا کرتے تھے جنرل عظیم الدین خاں کی شجاعت و بہادری سے بہت متاثر تھے ان کے علاوہ دوسرے اعیان شہر کے حالات بیان کیا کرتے تھے ایک مرتبہ مولانا عبدالحق خیرآبادی سے مناظرہ بھی کیا تھا، اس کی روداد مزے لے کر سناتے تھے، رام پور میں تھے کہ ندوہ میں ان کی ضرورت محسوس ہوئی وہ ندوہ کی تحریک سے شروع ہی سے تعلق رکھتے تھے اس کی حمایت میں ارشاد الکلام ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں ندوہ کے مقاصد کی تائید اور مخالفین کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا تھا۔ ناظم ندوۃ العلماء کی طلب پر وہ رام پور سے ندوہ آگئے اور بہت عرصہ تک وہاں درس دیتے رہے، اس کے بعد ڈھاکہ کو طلبی ہوئی اور مدرسہ عالیہ میں استاد مقرر کیے گئے، نواب سلیم اللہ خاں سے بڑے تعلقات تھے، اسی زمانہ میں شمس العلماء کا خطاب ملا ۱۳۳۹ھ

مام ابوحنیفہ سے
برمعمولی عقیدت

جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے، مولوی صاحب حنفی تھے، امام ابوحنیفہ سے ان کی عقیدت عشق کے درجہ تک پہونچ گئی تھی، اکثر خواب میں امام صاحب

بقیہ حاشیہ ص ۱۵) (۱۹۲۰ء) میں ریٹائرڈ ہوگئے، اسی دوران حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ
مند ہوے۔ اس زمانہ میں مولانا امیر علی کی وفات کے بعد ندوہ میں مہتمم اور صدر مدرس کی جگہ خالی
ھی، ارکان ندوۃ العلما، نے اس منصب کے لیے مولانا حفیظ اللہ سے درخواست کی انھوں نے
پیشکش منظور کرلی اور لکھنؤ آگئے، اور دس سال کے قریب ندوہ کے پرنسپل رہے ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۱ء)
یں کبرسنی کی وجہ سے اس خدمت سے علحدہ ہوگئے،

راقم الحروف ان کے آخری دور اہتمام میں ندوہ میں پڑھتا تھا، حجۃ اللہ البالغہ، صحیح مسلم اور
تصریح الافلاک ان سے پڑھی تھیں، تصریح پر ان کا حاشیہ مشہور ہے، اور طلبہ کو اس سے بڑی امداد
ملتی ہے۔ حدیث شریف سے ان کو دلی لگاؤ تھا، مولانا عبدالحیؒ سے حدیث کی کتابیں بھی پڑھی تھیں،
ان کے یہاں بڑا توسع تھا، وہ حنفی تھے، مگر مقلد جامد نہ تھے، بلکہ دلائل پر نظر رکھتے تھے، اور
جانب راجح کو ترجیح دیتے تھے، بعض مسائل میں حنفی مسلک سے ہٹ کر رائے قائم کی تھی، مولانا
حفیظ اللہ کا ابتدائی تعلیمی ماحول بھی عدم تقلید کا تھا، مولانا عبدالحیؒ کی وسعت نظر اور ذوق تحقیق نے
اور سہارا دیا، اور وہ بڑی حد تک اہل حدیث ہوگئے، لیکن اس بارہ میں بہت زیادہ شدت نہیں تھی،
حنفیوں سے بھی حسن اخلاق کے ساتھ ملتے تھے، ان کے بہت سے دوست اور شاگرد حنفی تھے،

میں نے جس زمانہ میں ان سے پڑھا ہے، وہ خاصے سن رسیدہ ہوچکے تھے، لیکن قویٰ
زیادہ کمزور نہیں تھے، بڑی سی داڑھی تھی لانبا قد چوڑا سینہ اور رنگ سانولا تھا، شیروانی پہنتے
تھے، بڑے خوش پوش اور جامہ زیب تھے، دیکھنے میں بڑے وجیہ اور بارعب معلوم ہوتے تھے
معقولات پر خاص نظر تھی، بعض شوقین طلبہ کو فلسفہ اور منطق کی اونچی کتابیں پڑھاتے تھے،

کی زیارت سے مشرف ہوتے رہتے تھے، کسی پیچیدہ مسئلہ میں جب دلائل خاطر خواہ سمجھ میں نہ آتے اور اس اُدھیڑبن میں آنکھ لگ جاتی تو امام صاحب کو دیکھتے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶) حجۃ اللہ البالغہ بھی پڑھاتے تھے، مگر شاہ ولی اللہ کے حکیمانہ رنگ اور صوفیانہ ذوق سے زیادہ مناسبت نہیں تھی، کبھی کبھی مولانا اسمٰعیل شہید کی عبقات بھی ان کے سپرد ہو جاتی، مگر تصوف سے انھیں دلچسپی نہیں تھی کہتے تھے مجھے تو محدث دہلوی اور مجاہد شہید اسمٰعیل سے عقیدت ہے۔ حدیث کا درس سادہ ہوتا تھا، مباحث میں زیادہ نہیں پڑتے تھے، طلبہ مولانا حیدر حسن خان کے یہاں سے صحیح بخاری پڑھ کر آتے تھے اور حدیث و رجال کے فنی مباحث میں انھیں الجھانا چاہتے تھے، ان کو فقہاء احناف کے دلائل سنا کر محدثین کی طرف سے مدافعت پر مجبور کرتے تھے، مگر وہ ان جھمیلوں میں نہیں پڑتے تھے، اور مختصر جواب دے کر اگلی حدیث پڑھانے لگتے تھے، ندوہ کی تحریک میں شروع سے شریک تھے، لیکن قدیم نصاب تعلیم میں زیادہ قطع و برید کے موافق نہیں تھے، اسلئے مولانا شبلی سے اختلاف رکھتے تھے، ان کی عقلیت پسندی کو بھی پسند نہیں کرتے تھے، کبھی کبھی درجہ میں ان پر سخت تنقید کرنے لگتے تھے، تو ہم لوگوں کو ناگوار ہوتا تھا، ہمارے ایک دوست نیاز احمد مولانا شبلی کے عزیز اور ہم وطن ہیں، ایسے مواقع پر وہ زیادہ مدافعت کرتے تھے، تو فرماتے تم کیوں نہ بولو گے تم تو ہیڈ کوارٹر کے ہو، ہم لوگ مولانا شبلی کی حمایت میں زیادہ حصہ لیتے تو کہتے وہ میرے دوست تھے، میں جو چاہوں کہوں تم لوگوں کو دخل دینے کا کیا حق ہے، لیکن اعتراض و تنقید کے باوجود مولانا شبلی کی اسلامی حمیت کی قدر کرتے تھے، ان کے بعض اشعار پڑھ کر کہتے کہ یہ ان کے لیے باعث مغفرت ہوں گے، ندوہ کے ارکان میں منشی احتشام علی مرحوم رئیس کاکوری ضلع لکھنؤ سے بڑا تعلق تھا،

اور کچھ ایسی باتیں ہوتیں یا ایسے حالات سامنے آتے جن سے ان کی الجھن دور ہو جاتی،
اور حنفی مسلک کی صداقت عیاں ہو جاتی، پھر بیدار ہوتے تو کتب حدیث میں دلائل
بھی نظر آجاتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل
ہوتا، اور آپ کے ارشاد یا طرز عمل سے مسئلہ کی وضاحت ہو جاتی، بیداری کے بعد
کتابوں میں تائیدی روایتیں بھی مل جاتیں۔ اس قسم کے واقعات بہت کم بیان

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷) جب تک لکھنؤ میں رہے ہر ہفتہ منشی صاحب کی کوٹھی ضرور جاتے،
منشی صاحب مرحوم بھی ان کا بڑی عزت کرتے تھے، اپنے استاد مولانا عبدالحئی فرنگی محلی سے بڑی
عقیدت تھی کنز البرکات کے نام سے ان کی ایک سوانح عمری بھی لکھی تھی، ان کا ذکر بڑی محبت
اور عظمت کے ساتھ کیا کرتے تھے، نواب صدیق حسن خاں ان کے ہم مسلک تھے، مگر مولانا عبدالحئی
صاحب سے ان سے جو تحریری مناظرہ ہوا تھا اس میں مولانا کو غالب سمجھتے تھے، استاد کی
محبت کا یہ حال تھا کہ جب ان کے نواسہ مولانا محمد ایوب صاحب ان سے ملنے کے لئے آتے تو
دیکھتے ہی کھڑے ہو جاتے، اس زمانہ میں استاد کی عزت و عظمت شاگرد کے دل میں پیوست
ہوتی تھی آج کی طرح تنخواہ دار ملازم نہیں سمجھا جاتا تھا۔

مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سے بھی عقیدت تھی، ان کے جذبۂ اتباعِ سنت کی
بڑی قدر کرتے تھے طالب علمی کے دور میں ملاقات کے لئے گنج مراد آباد بھی گئے تھے، اپنا ایک
قلمی رسالہ نذر کیا تھا، جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ وضو کے بعد رومال سے پانی پوچھنا نہ چاہئے،
مولانا نے رسالہ پر ایک نظر ڈالی، اور فرمایا کچھ حرج نہیں، پھر فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
تشریف فرما ہیں اور فرما رہے ہیں کہ کوئی حرج نہیں ہے، مولانا حفیظ اللہ صاحب نے عرض
کیا، حضرت یہ آپ کا کشف ہے، یہ ہمارے لیے حجت نہیں ہے کہتے تھے اس جواب سے مولانا

... تھے، زیادہ تر اخفائے حال کی کوشش کرتے تھے، مگر کبھی کبھی درس میں بحث کے ... ان کسی خواب یا مکاشفہ کا ذکر آجاتا۔

... مولانا نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی وہ حنفی نہ تھے، میاں نذیر حسین تو کھلے غیر مقلد تھے، لیکن شیخ حسین بھی حنفی مسلک سے تعلق نہ رکھتے تھے، وہ ائمۂ مذاہب کا ... کرتے تھے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام ادب سے لیتے تھے، مگر خود شافعی تھے، ... لئے ان کے درس میں احناف کے دلائل کا وہ زور نہ تھا، جس کی ایک حنفی سے توقع ... تی ہے۔ حدیث کی درسی کتابیں بھی عموماً محدثین یا شوافع کی لکھی ہوئی ہیں، ان کے ... ین کو حنفیوں کے دلائل جمع کرنے کی کوئی خاص فکر نہیں تھی، ان کے سادہ مطالعہ ... یہی ہوتا ہے کہ احناف کا مسلک کمزور معلوم ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے لاہور ... ولانا غلام احمد سے فقہ و اصول فقہ کی کتابیں توجہ سے پڑھی تھیں، بچپن سے جن بزرگوں ... ستادوں کی خدمت میں رہے وہ بھی حنفی تھے۔ اس خاندانی اور تعلیمی ماحول نے ... کے دل میں امام ابو حنیفہؒ سے غیر معمولی محبت و عقیدت پیدا کر دی تھی اور انھیں ... اف کی صداقت اور ان کے مسلک کی قوت کا یقین ہو گیا تھا، اگر حدیث کے اساتذہ ... ہوتے تو ان کی زبان سے اپنے خیالات کی تائید سن کر مطمئن ہو جاتے اور خود کسی کا دش

... یہ حاشیہ ص ۱۸) فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ بہت خوش ہوئے، اور فرمایا تم نے ٹھیک کہا تم کو ... کہنا چاہئے تھا۔

... اتباع سنت کا خاص اہتمام تھا، نماز بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے، فجر کی نماز اول وقت ... ھیرے میں شروع کرتے، قرارت طویل ہوتی، اور رکوع سجدہ اتنی دیر تک کرتے کہ لوگ ... حالت میں وضو کرتے پھر بھی رکوع مل جاتا، عصر کی نماز ایک مثل پر پڑھتے مغرب میں عجلت سے

میں مبتلا نہ ہوتے، مگر غیر حنفی اساتذہ کے درس میں ان کے سامنے حنفیوں کے جو دلائل آتے وہ زیادہ مضبوط نہ ہوتے۔ امام ابوحنیفہ کے ساتھ انھیں جو والہانہ عقیدت تھی وہ مجبور کر دیتی کہ خود ان کی تائید میں دلائل تلاش کریں، ان دلائل کو محدثین کے معیار پر جانچیں، اور ائمہ جرح و تعدیل کے بیانات سے راویوں کی ثقاہت ثابت کریں، بھوپال میں شیخ حسین کے یہاں انھیں اس کا پورا موقع ملا، حدیث کے متون اور ان کی مفصل شرحیں وہاں موجود تھیں، اسماء الرجال کی کتابوں کا بھی کافی ذخیرہ تھا، اور اصول حدیث کی متداول کتابوں کے علاوہ نادر مخطوطے بھی موجود تھے۔ کہیں مطالب کے سمجھنے میں اشکال ہوتا تو وسیع النظر اور شفیق استاد کی اعانت ہر قدم پر حاصل تھی، میاں صاحب کے درس میں مولوی صاحب نے جو یہ دعویٰ کیا تھا، کہ میں عالم پٹھان ہوں، اس کو انھوں نے بھوپال کے قیام کے زمانہ میں صحیح ثابت کر دیا۔

طریقۂ درس عموماً حدیث شریف کے درس میں طلبہ عبارت پڑھتے ہیں، پھر استاد مطالب و مباحث پر مفصل و مدلل تقریر کرتا ہے، اور اپنے بیان کے ثبوت میں جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے کتابوں کے حوالے دیتا ہے، کبھی کبھی کسی کتاب کو کھول کر دکھا بھی دیتا ہے، طلبہ استاد کی تقریر توجہ سے سنتے ہیں، جو بات سمجھ میں نہیں آتی اسے استاد کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، اگر کوئی بات وضاحت طلب ہوتی ہے تو استاد اسے واضح کر دیتا ہے، لیکن مولانا کا طریقۂ درس اس سے بالکل مختلف تھا، طلبہ کے سامنے عبارت کی تشریح، مطالب کی توضیح اور مباحث کی تفسیر ہی نہیں پیش کرتے تھے،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹) کام لیتے، ان کا یہ معمول زندگی بھر رہا، اور ضعف و کبرسنی کے زمانہ میں بھی اس میں فرق نہیں آیا۔

بلکہ طلبہ کو مآخذ سے بھی واقف کراتے تھے، ان کے مراتب ذہن نشین کراتے، ان کے مطالعہ کے آداب بتاتے، اور ان سے استفادہ کا سلیقہ سکھاتے تھے، مآخذ و مراجع پورے طور پر ان کی نظر میں ہوتے تھے، درسگاہ میں اپنے قریب حوالہ کی کتابیں رکھ لیتے، اور جب مسئلہ پر بحث شروع ہوتی، تو وہ اپنی تقریر کے ساتھ ساتھ یہ کتابیں طلبہ کے حوالہ کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ انھیں خود پڑھو، اس سلسلہ میں صرف شروح پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اونچے سے اونچے مآخذ طلبہ کے سامنے پیش کر دیتے تھے، مثلاً صحیح بخاری میں اگر کوئی اختلافی مسئلہ آجاتا تو صرف فتح الباری اور عینی ہی پر بس نہ ہوتی بلکہ امام شافعی کے نقطۂ نظر کو سمجھانے کیلئے ان کی کتاب الام پڑھاتے۔ امام مالک کے دلائل کے لئے مدونہ اور اس کی شرح پیش کرتے اگر کبھی کوئی طالب علم درمیان میں کسی متاخر مصنف کا حوالہ دیتا مثلاً کہتا کہ اس بارے میں شاہ ولی اللہؒ نے یہ لکھا ہے یا مولانا عبد الحیؒ کی یہ رائے ہے، شاہ عبد الحق نے یہ کہا ہے تو فرماتے کہ متاخرین کا ذکر اس موقع پر کیوں کر رہے ہو، صحیح بخاری ہمارے سامنے کھلی ہے، کتاب الام اور مدونہ یہ رکھی ہیں، متقدمین کی ان کتابوں کی موجودگی میں پچھلے آدمیوں کے حوالہ کی کیا ضرورت ہے۔ مولوی صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ جس وقت دلائل پیش کئے جارہے ہوں اُس وقت اشخاص کا نام نہ لیا کرو، حنفی مسلک کی تائید کے لیے وہ کبھی کسی حنفی مصنف کا حوالہ نہیں دیتے بلکہ عموماً محدثین کی کتابوں ہی سے دلائل فراہم کرتے۔ نکات اور توجیہات کی طرف زیادہ میلان نہیں تھا، بلکہ انداز بحث بالکل محدثانہ ہوتا تھا۔ مطالعہ اتنا وسیع اور عمیق تھا کہ جن ابواب میں گمان بھی نہیں ہوتا تھا، ان سے وہ اپنے مسلک کی تائید میں روایت نکال لیتے تھے، نماز کے اوقات، صلح حدیبیہ میں صحابہ کی تعداد، تراویح کی رکعات، صاع کی مقدار، تین طلاقوں کے حکم اور اسی طرح کے

بیسیوں مسائل میں ان کی تلاش وتحقیق ان کی وسعت نظر کا پتہ دیتی تھی، تحقیق کے میدان میں اپنے ہوں یا غیر کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے، اور نہ عقیدت کی بنا پر بے دلیل کسی کا دعویٰ تسلیم کرتے تھے، امام شوکانی ان کے سلسلۂ سند میں تھے، صرف دو واسطوں سے شاگرد تھے، لیکن باایں ہمہ ان سے بالکل مرعوب نہیں تھے، مذاہب کے بیان میں دلائل پر ایک نظر پڑ جانے کے بے نیل الاوطار طلبہ سے پڑھاتے، لیکن ساتھ ساتھ اسکی کمزوریاں بھی واضح کرتے جاتے۔

سلسلۂ بحث میں اصول حدیث کے مباحث بھی زیر بحث آجاتے، اس بارے میں بھی ان کا ذوق بہت بلند تھا، اصول حدیث کی متداول کتابوں کے علاوہ نادر قلمی نسخے بھی ان کے پیش نظر ہوتے اصولی مسائل مین بھی ان کا طریقہ وہی تھا کہ طلبہ کو خود سمجھنے اور رائے قائم کرنے کا موقع حاصل ہونا چاہئے، کہا کرتے تھے کہ پہلے مخالف کے دلائل پورے طور پر سمجھ لو، اور انھیں دوسروں کی زبان سے سننے کے بجائے خود مخالفین ہی سے معلوم کرنا چاہئے، فرماتے تھے کہ براہ راست ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بجائے جو لوگ ثانوی ذرائع سے معلومات حاصل کرتے ہیں بسا اوقات انھیں دھوکا ہوتا ہے، اور وہ مخالفین کی طرف ایسے خیالات منسوب کر دیتے ہیں جنھیں وہ تسلیم نہیں کرتے طلبہ کو بڑی تاکید کرتے تھے کہ جس شخص کی تردید کر رہے ہو پہلے خوب تحقیق کر لو کہ اس کے اصل خیالات کیا ہیں، اسی بنا پر انھیں اپنے مسلک سے اختلاف رکھنے والوں کی تصانیف کی زیادہ فکر رہتی تھی، جہاں تک ممکن ہوتا، ان کی کتابیں حاصل کرتے اور شاگردوں کو ان کے مطالب اور دلائل سے مطلع کرتے، فرمایا کرتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ تمھارے سامنے مخالفین کے دلائل اور ان کے مآخذ وضاحت کے ساتھ آجائیں تاکہ تمھیں کبھی یہ گمان نہ ہو کہ مولوی صاحب

اپنے مسلک کی کمزوری کی وجہ سے مخالفین کے دلائل چھپا گئے، ان کی اس نصیحت سے ان کے شاگردوں کو بے حد فائدہ پہونچا، اور بے تحقیق بات کہنے کی عادت نہیں پڑی، مولانا کے درس میں عجیب سماں ہوتا تھا حدیث کے بڑے بڑے ائمہ کے خیالات سامنے آتے تھے، اور ان کی اہم تصانیف اور ان کے طرز استدلال سے واقفیت ہوتی تھی، وہ حنفی مسلک کو اتنا مدلل کر دیتے کہ پھر کسی دوسرے کی تحقیق نگاہ میں جچتی نہیں تھی،

اسمار الرجال کی کتابوں پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی، یہاں بھی وہ متقدمین کی تصانیف کی فکر میں رہتے تھے، میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب، تذکرۃ الحفاظ اور لسان المیزان کے اقوال تنقیدی نظر سے پڑھتے تھے، اور متقدمین کی کتابوں میں ان کی سند تلاش کرتے تھے، کہتے تھے کہ آٹھویں نویں صدی کے آدمیوں کا بیان پہلی اور دوسری صدی کے اشخاص کے بارہ میں اسوقت قابل قبول ہوسکتا ہے جب اسکا ثبوت معاصرین کے یہاں مل جائے، فرماتے تھے، کہ راوی کی توثیق و تضعیف اور حدیث کی صحت وضعف خود ایک اجتہادی مسئلہ ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی راوی کو ایک محدث کسی وجہ سے ضعیف سمجھتا ہو، اور دوسرے کے نزدیک وہ وجہ باعث ضعف نہ ہو، یہی حال حدیث کی صحت وضعف کا ہے، اس لیے اسمار الرجال کی کتابوں میں صرف قوی وضعیف اور ثقہ وغیرہ ثقہ دیکھ کر فیصلہ کر دینا محقق کی شان نہیں ہے، بلکہ راوی کے حالات کا تفصیل سے مطالعہ ضروری ہے، اسی طرح علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر کے نزدیک اگر کوئی راوی مجہول ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو متقدم مجتہد اس سے روایت کر رہا ہے، وہ بھی اس سے ناواقف ہو، ایک صاحب علم و نظر مجتہد جب کسی روایت پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھتا ہے تو وہ روایت اس کے نزدیک ضرور صحیح ہوگی،

ورنہ وہ اسے اپنے استدلال کی بنیاد کیوں بناتا، جان بوجھ کر ایک ضعیف روایت کو ماخذ بنانا، اور ایک غیر معتبر راوی پر اعتبار کرنا مجتہد کی شان ہی کے خلاف نہیں ہے، بلکہ دیانت کے بھی خلاف ہے۔ فرمایا کرتے تھے، کہ بسا اوقات لوگ اشخاص کے علم سے مرعوب ہو کر تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھتے یا فرطِ عقیدت کی بنا پر بے چون وچرا اس کی بات مان لیتے ہیں، اس لیے غلطی کا ازالہ نہیں ہو پاتا۔ مثلاً صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرہ رضؓ کی ایک روایت ہے،

لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتھا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں
من رسول اللہ علیہ وسلم	نے ایک بات سنی تھی، اس نے مجھے
ایام الجمل بعد ما کدت	جنگ جمل کے زمانہ میں فائدہ پہنچایا
ان الحق باصحاب الجمل فا	قریب تھا کہ میں جمل والوں کے
قاتل معھم قال لما بلغ	ساتھ شامل ہو جاؤں اور ان کے
النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ساتھ جنگ میں شریک ہو جاؤں،
ان اھل فارس قد ملکوا	(وہ بات یہ ہے) کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم
علیھم بنت کسری قال	کو اطلاع ملی کہ اہلِ فارس نے کسریٰ
لن یفلح قوم ولوا امرھم	کی لڑکی کو اپنا حکمران بنایا ہے تو فرمایا
امرءۃ[1]	وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے
	اپنا حکمران ایک عورت کو بنایا۔

[1] صحیح بخاری ابواب المغازی۔ کتاب الفتن میں بھی یہ روایت الفاظ میں کسی قدر فرق کے ساتھ موجود ہے صحاح کی دوسری کتابوں میں بھی مذکور ہے، لیکن بخاری کی اہمیت سب سے زیادہ ہے،

(باقی)

کلامِ اقبال میں عورت کا درجہ

از

جناب جگن ناتھ صاحب آزاد

صنفِ نازک کے بارے میں اقبال کے نظریات اقبال کے اس نظامِ فکر کا ایک حصہ ہیں، جو سارے سماج کے بارے میں اقبال نے پیش کیا ہے۔ ہم اقبال کے نظریے سے متفق ہوں یا نہ ہوں، یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال نے سماج کے ایک مضبوط کردار پر زور دیا ہے، اور اس مضبوط کردار کے سارے قلعہ کا سنگِ بنیاد اقبال نے عورت کے کردار کو قرار دیا ہے۔ لہٰذا کلام اقبال میں عورت کی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے اس قسم کے جملے قطعاً بے معنی ہیں کہ عورت کے بارے میں اقبال کے نظریات رجعت پسندانہ ہیں، یا ترقی پسندانہ، جدید ہیں یا قدیم۔ اقبال سماجی نظام کے بارے میں جو نظریات ۱۹۳۸ء میں پیش کرکے دنیا سے رخصت ہو گئے، انھیں ۱۹۵۵ء کے پیمانے سے ناپ کرکے صحیح یا غلط قرار دینا اتنی ہی لغو بات ہے، خاص طور پر یہ دیکھتے ہوئے، کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد حالات کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے، کہ اس جنگ کے بعد کی چوتھائی صدی نے اس سے قبل کی ایک صدی کے مقابلہ میں زیادہ منزلیں طے کی ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت مجھے اس لئے بھی پیش آئی ہے کہ آج کل ہندوستان میں بعض نقادِ اقبال کو سیکولرزم اور متحدہ قومیت کا علمبردار ثابت کرتے ہوئے شعوری یا غیر شعوری طور پر اقبال کو اس کے بنیادی سرچشمۂ افکار ــ اسلام ــ سے بے تعلق ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف

نظر آتے ہیں، ان نقادوں کو اس بات سے سروکار نہیں کہ یہ عمل جائزہ و تحقیق کی پختگی یا خامی کو ظاہر کرتا ہے، اس کاوش کا دوسرا ضرر رساں پہلو یہ ہے کہ اقبال کی شاعری جو ہمارے مطالعے کا موضوع ہونا چاہئے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی جارہی ہے، اور توجہ صرف اس بات پر مرکوز ہو رہی ہے، کہ اقبال جس نے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا ترانہ لکھا مشترکہ قومیت کا علمبردار ہے، اور اسے ہندوستان میں اپنا کھویا ہوا مقام واپس ملنا چاہئے، چاہتا میں بھی یہی ہوں لیکن اپنے مطالبے میں اتنا اضافہ ضرور کروں گا کہ اقبال مشترکہ قومیت کے علمبردار ہوں یا نہ ہوں (اور غالباً مشترکہ قومیت سے ہم آج جو کچھ مراد لے رہے ہیں' اقبال اس کے علمبردار نہیں ہیں) ان کو اس لئے ہندوستان میں کھویا ہوا مقام واپس ملنا چاہئے' کہ وہ ہمارے ایک عظیم شاعر ہیں، اور عظیم شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کو ہماری اس وکالت کی قطعاً ضرورت نہیں کہ انھوں نے ع

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

لکھا ــ انھوں نے

"مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

بھی لکھا، اور یہ بھی لکھا

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا بت گری پیشہ کیا بُت شکنی کو چھوڑا؟

ہم نشیں مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں

اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں

اور یہ بھی اقبال کی ساری شاعری کی طرح عظیم شاعری کی مثالیں ہیں، اور چونکہ انھوں نے ہمیں عظیم شاعری دی ہے، اس لئے ہماری زبان اور ادب میں ان کو ایک

رفیع مقام حاصل ہے، ان سے اس مقام کو چھیننے کی کوشش کرنا ہماری ادب شناسی پر نہیں اوب ناشناسی پر دلالت کرتا ہے،

(۲)

آخرالذکر دو اشعار کا ذکر اس مقالے میں اس لئے بھی ضروری ہے کہ کلام اقبال میں عورت کی حیثیت پر بحث کرنے کے لئے اس ماحول کا تعین ضروری ہے، جس میں اقبال کے سماجی نظریات وافکار نے پرورش پائی،

ترک شاعر ضیا، اقبال کے محبوب شاعر تھے، اور کئی محفلوں میں انھوں نے اس کا کلام بڑے والہانہ انداز سے پڑھا (اگر میں غلطی نہیں کرتا تو انھوں نے جامعہ ملیہ کی ایک محفل میں بھی جب کہ وہ پروفیسر مجیب کے مہمان تھے، ضیا، کا کلام سنایا تھا)، ضیا، کے قومی افکار کی تعریف انھوں نے اپنی اکثر تحریروں میں جی بھر کر کی ہے، لیکن "اسلام میں افکار الہیہ کی تشکیل جدید" میں عورت کے متعلق ضیاء کے نظریات پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں،

"مرد اور عورت میں مساوات دیکھنے کے شوق میں، وہ (ضیا،) احکام اسلام کے خاندانی نظام میں جو آج مروج ہے، انتہا پسندانہ تبدیلیاں دیکھنے کا متمنی ہے،

وہ لکھتا ہے:-"

"عورت میری ماں ہے، میری بہن یا میری بیٹی ہے، یہ عورت ہی ہے جو میری روح کی گہرائیوں میں انتہائی پاکیزہ جذبات ابھارتی ہے، ؛

"عورت میری محبوبہ بھی ہے، میرا سورج، میرا چاند اور میرا ستارہ ہے،"

"یہ عورت ہی ہے جس کے طفیل میں زندگی کی شاعری کو سمجھتا ہوں، یہ کیسے ممکن ہو کہ خدا کا مقدس قانون اس خوبصورت مخلوق کو ذلیل اور حقیر سمجھے، یقیناً علما نے قرآن کی تفسیر میں کوئی نہ کوئی غلطی کی ہے۔"

قوم اور ملک کی بنیاد خاندان ہے۔

"جب تک کسی قوم کو عورت کی پوری قدر و قیمت کا احساس نہیں ہو جاتا، قومی زندگی نامکمل ہی رہتی ہے،

خاندان کی تربیت اور پرورش منصفانہ انداز سے ہونا چاہئے،

اس لئے تین چیزوں میں مساوات کا ہونا ضروری ہے، اور وہ ہیں ــــ طلاق، علیحدگی اور وراثت،

جب تک وراثت کے قانون کی رو سے عورت مرد کا نصف اور شادی کے قانون کی رو سے مرد کا ایک چوتھائی تصور کی جاتی رہے گی، اس وقت تک نہ تو خاندان ترقی کر سکے گا، اور نہ ملک، جہاں تک دوسرے حقوق کا تعلق ہے، ہم نے قومی عدالتیں قائم کر دی ہیں، دوسری طرف خاندان کو ہم نے اسکول کے حوالے کر رکھا ہے،

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم نے عورت کو کیوں فراموش کر دیا ہے؟ کیا وہ ملک کے لئے کام نہیں کرتی، ؟ کیا ہم اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب وہ اپنی (کپڑے سینے والی) سوئی کو ایک سنگین میں تبدیل کر کے ایک انقلاب پیدا کرے، اور اس سنگین کے زور سے اپنے حقوق ہمارے ہاتھوں سے زبردستی چھین لے"

ضیا کے یہ افکار نقل کرنے کے بعد اقبال ان افکار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"میں یہ پوچھتا ہوں کہ جس مساوات کا مطالبہ ضیا نے کیا ہے یعنی طلاق، علیحدگی اور وراثت میں مساوات، کیا وہ مساوات شریعتِ محمدی کی رو سے بھی ممکن ہے، میں نہیں جانتا کہ کیا ترکی میں عورتوں کی بیداری نے ایسے مطالبات پیدا کر دیئے ہیں جو بنیادی اصولوں کی از سرِ نو تفسیر کئے بغیر پورے نہیں ہو سکتے، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ پنجاب میں ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جب کہ وہ مسلمان عورتیں جو اپنے غیر پسندیدہ شوہروں سے نجات پانا چاہتی تھیں، اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور ہو گئیں، یہ صورتِ حال ایک تبلیغی مذہب کے مقاصد کے ساتھ قطعاً ہم آہنگ نہیں، ......

جہاں تک ترک شاعر کے مطالبات کا تعلق ہے، غالباً احکامِ اسلام کے خاندانی نظام سے متعلق اس کی واقفیت زیادہ نہیں ہے، نہ ہی غالباً وہ وراثت کے قرآنی حکم کی اقتصادی اہمیت کو سمجھتا ہے،

اس کے بعد اقبال نے اس بحث میں شریعت کے ان پہلوؤں پر مفصل روشنی ڈالی ہے، جن کا تعلق اسلام میں عورت کی حیثیت کے بارے میں ہے۔

تو گویا اقبال نے اپنی نظم و نثر میں عورت کا سماجی مقام متعین کرنے میں بنیادی طور پر اپنے افکار کو اس نظام کے تابع رکھا ہے، جو انھیں احکامِ قرآنی میں نظر آیا ہے کیونکہ اقبال کے نزدیک عورت کی یہی حیثیت برقرار رکھنے ہی سے ہمارا معاشرہ ان تمام عیوب سے پاک ہو سکتا ہے، جو موجودہ دور نے عورت کے نئے کردار کی صورت میں ہمارے معاشرے کو دیئے ہیں،

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے　　روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدّر

بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر و لیکن خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسّر

اقبال کے قلم سے ترک شاعر ضیا کے افکار کی تردید جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء کی بات ہے، اس سے دس برس قبل ۱۹۱۸ء میں اقبال کا دوسرا مجموعۂ کلام "رموزِ بے خودی"[۵] چھپا، اس میں ارکانِ اساسی ملیہ اسلامیہ (رکن اول، توحید، رکنِ دوم۔ رسالت) ایک طویل بحث ہے، اس بحث کی تین نظمیں عورت کے موضوع پر ہیں،

۱۔ اس معنی میں کہ بقائے نوع کا سبب امومت ہے اور حفظ و احترام امومت اصل اسلام ہے،
۲۔ اس معنی میں کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا اسلام کے لئے اسوۂ کاملہ ہیں، اور
۳۔ خطاب بہ مخدّراتِ اسلام،

پہلی نظم میں آپ کہتے ہیں:۔

نغمہ خیز از زخمۂ زن سازِ مرد از نیاز او دو بالا نازِ مرد
پوششِ عریانیٔ مرداں زن است حسن دلجو عشق را پیراہن است
عشقِ حق پروردۂ آغوشِ او ایں نوا از زخمۂ خاموشِ او
آنکہ ناز د بر وجودش کائنات ذکرِ او فرمود باطیب و صلوٰۃ
مسلمے کو را پرستاری شمرد بہرہ از حکمتِ قرآن نبرد
نیک اگر بینی امومت رحمت است زانکہ او را با نبوت نسبت است
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است سیرتِ اقوام را صورت گر است

---

[۵] بعد میں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" دونوں مل کے ایک ہی کتاب کی صورت میں "اسرار و رموز" کے نام سے شائع ہوئیں،

از امومت پختہ تر تعمیرِ ما　　در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما
ہست اگر فرہنگِ تو معنی رسے　　حرفِ امت نکتہ ہا دارد بسے
گفت آں مقصودِ حرفِ کن فکاں　　زیرِ پائے امہات آمد جناں
آں دخِ رستاق زادے جاہلے　　پست بالائے سطبرے بد گلے
نا تراشے پرورش نا زادۂ　　کم نگاہے کم زبانے سادۂ
دل ز آلامِ امومت کردہ خوں　　گردِ چشمش حلقہ ہائے نیلگوں
ملت ار گیرد ز آغوشش بدست　　یک مسلمانِ غیور و حق پرست
ہستیِ ما محکم از آلامِ اوست　　صبحِ ما عالم فروز از شامِ اوست

تصویر کا یہ تابناک پہلو پیش کرنے کے بعد اقبال اس کا سنولایا ہوا پہلو بھی ہمارے سامنے لاتے ہیں، اور کہتے ہیں:

واں تہی آغوش نازک پیکرے　　خانہ پروردے نگاہش محشرے
فکرِ او از تابِ مغرب روشن است　　ظاہرش زن باطنِ او نازن است
بند ہائے ملتِ بیضا گسیخت　　تا ز چشمش عشوہ حاصل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزاد ویش　　از حیا نا آشنا آزاد ویش
علمِ او بارِ امومت بر نتافت　　بر سرِ شامش یکے اختر نتافت

ایں گل از بستانِ ما نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

اس دوسرے رخ کی ایک جھلک "ضربِ کلیم" میں بھی یوں نظر آتی ہے،

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے　　وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال مرد بیکار و زن تہی آغوش؟

کلام اقبال میں موضوع کوئی بھی ہو، ذہن بے اختیار اُس کے کمالِ فن کی طرف جاتا ہے، مذکورۂ بالا قطعہ کوئی بہت اعلیٰ شاعری کی مثال نہیں، یہی خیال "ضرب کلیم" سے قبل جاوید نامہ میں انتہائی دلکش بلکہ ساحرانہ انداز سے ہمارے پاس آچکا ہے، پس منظر فلک مریخ ہے، اقبال اور رومی ہزاروں کاخ و کوئے سے گذر کر شہر مرغدین سے باہر ایک میدان میں پہنچتے ہیں۔" اس میدان میں عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم ہے، اور اس ہجوم میں ایک عورت کھڑی ہے، اور اس کا قد انار کے بوٹے کا سا ہے، اور وہ تقریر کر رہی ہے، اس کا چہرا ہے تو روشن لیکن روح کے نور کے بغیر ہے، اور اس کے معانی اس کے بیان پر گراں گذر رہے ہیں، اس کی گفتگو بے سوز اور آنکھ بے نم ہے، اور وہ خود آرزو کے سرور سے نامحرم ہے، اس کا سینہ جوشِ جوانی سے قطعاً خالی ہے، اور اُس کا آئینہ اندھا اور صورت ناپذیر ہے، وہ عشق اور آئینِ عشق سے بے خبر ہے، وہ ایک ایسی چڑیا ہے جسے شاہینِ عشق نے رد کر دیا ہے،

اب وہ حکیم مریخی، حکیم نکتہ دان، رومی اور اقبال سے کہتا ہے کہ" یہ دوشیزہ اہل مریخ میں سے نہیں ہے، یہ در اصل ایک سادہ و آزادہ و بے ریو ورنگ" عورت تھی، فرزمرزا سے یورپ سے چرا لایا، اور اسے نبوت کے کام میں پختہ کر کے جہانِ مریخ میں چھوڑ دیا، اب یہ کہتی ہے کہ میں آسمان سے نازل ہوئی ہوں اور میری دعوت دعوتِ آخر زماں ہے" یہ عورت مرد و زن کے باہمی تعلقات کے بارے میں بات چیت کرتی ہے، اور بدن کے رازوں کو زیادہ واضح طریقے سے بیان کرتی ہے، اس آخر الزماں کے نزدیک تقدیرِ زیست کیا ہے؟ وہ اہلِ زمین

کی زبان میں اس طرح بیان کرتا ہے،

اے زنان اے مادران اے خواہران ... زیستن تا کے مثال دلبران؟
دلبری اندر جہان مظلومی است ... دلبری محکومی و محرومی است
در دو گیسو شانہ گردانیم ما ... مرد را نخچیر خود دانیم ما
مرد صیادے بہ نخچیری کند ... گرد تو گردد کہ زنجیری کند
گرچہ آن کافر حرم سازد ترا ... مبتلائے درد و غم سازد ترا
ہمبر او بودن آزار حیات ... وصل او زہر و فراق او نبات
مار پیچان از خم و پیچش گریز ... زہر ہایش را بخون خود مریز

از امومت زرد روے مادران
اے خنک آزادی بے شوہران

وحی یزدان پے بہ پے آید مرا ... لذت ایمان بیفزاید مرا
آمد آن وقتے کہ از اعجاز فن، ... می توان دیدن جنین اندر بدن
حاصلے برداری از کشت حیات ... ہرچہ خواہی از بنین[1] و از بنات
گر نباشد بر مراد ما جنین ... بے محابا کشتن او عین دین
در پس این عصر اعصار دگر ... آشکارا گردد اسرار دگر
پرورش گیرد چنین نوع دگر ... بے شب ارحام دریابد سحر
تا بمیرد آن سراپا اہرمن ... ہمچو حیوانات ایام کہن

---

[1] بنین اور بنون ابن کی جمع ہے، الف گر گیا ہے، رفع کی حالت میں بنون اور نصب و جر کی حالت میں بنین استعمال ہوتا ہے،

لالہ ہا بے داغ و باداماں پاک | بے نیاز از شبنمے خیزد زخاک
خود بخود بیروں فتد اسرار زیست | نغمہ بے مضراب بخشد تار زیست
آنچہ از فیضاں فرو ریزد مگیر | اے صدف در زیر دریا تشنہ گیر
خیزد با فطرت بیا اندر ستیز | تا ز پیکار تو خُرّ گردد کنیز

رستن از ربط دو تن توحید زن
حافظ خود باش و بر مردان متن

اسلامی قانون کے رو سے سماج میں عورت کی حیثیت سے متعلق اقبال کا نظریہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس نظریہ کے پیش نظر اقبال کے یہاں نبیہ مرنخ کا جو خود اقبال ہی کے ذہن دراک کی اختراع ہے، ردعمل ڈھونڈنا دشوار نہیں ہے۔ "اسلام میں افکار الٰہیہ کی تشکیل جدید" میں مذکورہ ترک شاعر کے نظریے کو ہدف تنقید بناتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"قانونِ وراثت کے بارے میں شاعر نے جو اصلاح تجویز کی وہ اس کی غلط فہمی پر مبنی ہے، لڑکے اور لڑکی کے قانونی حصوں میں عدم مساوات کی موجودگی سے یہ فرض نہیں کر لینا چاہئے کہ اسلامی قانون مرد کو عورت پر ترجیح دے رہا ہے اس قسم کا مفروضہ روحِ اسلام کے منافی ہے، قرآن کہتا ہے :۔

"عورتوں کو مردوں پر وہی حقوق حاصل ہیں جو مردوں کو عورتوں پر"

لڑکی کے حصہ کا تعین اس بنا پر نہیں ہوتا کہ وراثت میں اسے کمتر سمجھا گیا ہے بلکہ یہ فیصلہ اس کے اقتصادی مواقع اور اس مقام کو پیش نظر رکھ کے کیا گیا ہے جو اسے موجودہ سماجی نظام میں جس کا وہ ایک جزو ہے حاصل ہے،

یہ تو مسئلے کا صرف ایک پہلو ہے، اس مسئلے کے جس قدر بھی پہلو ہیں، انھیں اقبال شریعت

اسلامی کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ ایک پہلو وہ ہے جسے اقبال نے خود ساختہ نیٹشے' مرتع کی بات چیت میں لاکر انتہائی دلکش شاعری بنا دیا ہے۔ دراصل نیٹشے مرتع کے نظریات سے اقبال کو شروع ہی سے ایک چڑھ سی ہے۔ "بانگ درا" کے ظریفانہ کلام میں بہت پہلے انھوں نے لکھا:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدّ نظر وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

لیکن دراصل یہ چڑھ اُس نظام سے ہے جس نے عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں اس طرح لا کے کھڑا کیا کہ گھریلو زندگی کی شکست وریخت ہو کر رہ گئی۔ اس نظریے میں نیٹشے کا وہ جذبہ دور دور تک نظر نہیں آتا، جو عورت ذات کی مخالفت اور اس کے ساتھ نفرت پر مبنی ہے بلکہ اقبال کا نظریہ عورت کے لئے احترام سے لبریز نظر آتا ہے،

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن اسی کے شعلے سے پھوٹا شرارِ افلاطوں[۱]

آخری شعر اس اعتبار سے محلِ نظر ہے کہ تاریخِ عالم میں صنفِ نازک کا علمی مقام اس کی تائید نہیں کرتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پہلا شعر " شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اسکی" عورت کے لئے عزت و احترام کا جو جذبہ اور عورت سے صحت مند معاشرے کی تشکیل و

---

[۱] معارف: اگر اس شعر سے یہ مطلب لیا جائے کہ کوئی عورت افلاطون نہیں بن سکی، مگر افلاطون پیدا کر سکی تو یہ شعر محلِ نظر نہیں رہ جاتا۔

تکمیل کی جو توقع لئے ہوئے ہے اس کے پیشِ نظر یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ ایک پختہ کردار سماج کے لئے اقبال عورت کی پختگی کردار کے کس قدر قائل ہیں،

جہاں را محکمی از امہات است نہاد شاں امینِ ممکنات است
اگر این نکتہ را قومے نداند نظامِ کاروبارش بےثبات است

ز شامِ ما بروں آور سحر را بہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را
تو می دانی کہ سوزِ قراءتِ تو دگرگوں کرد تقدیرِ عمر را

(۲)

مثنوی رموزِ بےخودی کا ایک طویل اقتباس جس میں اقبال نے امومت کی عظمت سے بحث کی ہے، اس سے قبل نقل ہو چکا ہے۔ اس اقتباس کو ہم اس عظیم عورت کے کردار سے ہٹ کر نہیں دیکھ سکتے جس کے آغوش میں اقبال نے پرورش پائی، اور جس کے انتقال کے بعد اقبال نے اسے اس طرح یاد کیا،

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار کون میرا خط نہ آنے سے رہیگا بےقرار
خاکِ مرقد پر تری لیکر یہ فریاد آؤنگا اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤنگا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

اور غالباً مندرجۂ ذیل رباعی کہتے وقت بھی اقبال کے پیشِ نظر ان کی والدۂ محترمہ ہی رہی ہوں،

مرا داد ایں خرد پرور جنونے نگاہِ مادرِ پاک اندرونے

زمکتب چشم و دل نتواں گرفتن — کہ مکتب نیست جز سحر و فسونے

در اصل اقبال کی تربیت اور اُن کی شخصیت کی تشکیل میں اُن کی والدۂ محترمہ کا بڑا ہاتھ تھا،[۱] اقبال کو اس امر کا ہمیشہ احساس رہا کہ ماں کی آغوش ہی بچے کی پہلی تربیت گاہ ہے، اس سانچے میں بننے والے بن گئے، اور بگڑ جانے والے بگڑ گئے، چنانچہ "خطاب بہ جاوید" میں اپنے فرزند سے کہتے ہیں:۔

مادرت درس نخستیں با تو داد — غنچۂ تو از نسیم او کشاد
از نسیم او ترا ایں رنگ و بست — اے متاع ما بہائے تو از وست
دولتِ جاوید از و اندوختی — از لب او لا الٰہ آموختی

اقبال کے یہاں امومت کی عظمت پر بات چیت کرتے وقت شوپن ہار کی جانب خیالات منتقل ہو جائیں، تو کچھ تعجب نہیں، کیونکہ عورت کے بارے میں شوپن ہار کے نظریات

---

[۱] اقبال کی والدہ محترمہ کے انتقال پر اکبر الٰہ آبادی نے یہ اشعار کہے،

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں — قوم کی نظریں جو اُن کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی یہ خوش گوئی یہ ذوقِ معرفت — یہ طریقِ دوستی خودداریِ باتمکنت
اس کے شاہد ہیں کہ اُن کے والدین ابرار تھے — باخدا تھے اہلِ دل تھے صاحبِ اسرار تھے
جلوہ گر ان میں انھی کا ہے یہ فیضِ تربیت — ہے ثمر اس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت
مادرِ مرحومۂ اقبال جنت کو گئیں، — چشم تر ہے آنسوؤں سے قلب ہے اندوہگیں
رو کنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو — نعمتِ عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبر اس غم میں شریکِ حضرتِ اقبال ہے — سالِ رحلت کا یہاں منظور آنی الحال ہے
واقعی مخدومۂ ملت تھیں وہ نیکو صفات — رحلتِ مخدومہ سے پیدا ہو تاریخِ وفات
۱۳۳۲ھ

بھی اسی تربیت پر مبنی ہیں، جو اُسے ماں کی آغوش میں ملی، فرق صرف اتنا ہے کہ شوپن ہاوُر کی تربیت نفرت کے ماحول میں ہوئی، اور اس کا دل عورت کے خلاف زہر یلے جذبات سے لبریز ہو گیا، جس کا اظہار اس نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں میں کیا ہے،[۱] ان خیالات کی ایک جھلک دیکھئے :-

صرف وہی شخص ہی جس کی عقل پر نفس پرستی کا پردہ پڑا ہے اس ٹھگنے قد تنگ کندھوں اور چھوٹی چھوٹی ٹانگوں والی مخلوق کو صنف نازک کہے گا، کیونکہ جنس کے سارے حسن کا دارومدار دراصل اسی ہیجان اور ترنگ پر ہے، عورت کو خوبصورت کہنے کی بہ نسبت اسے بدصورت کہنا زیادہ موزوں ہوگا عورتوں میں موسیقی شاعری یا کسی بھی فن لطیف سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، اگر وہ اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ انھیں شعر، موسیقی یا فن لطیف سے کوئی رغبت ہے تو یہ محض دھوکے اور فریب کے سوا، اور کچھ نہیں اور مقصد اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح سے مرد کو خوش کر سکیں،

"عورتیں کسی بھی معاملے میں خالص معروضی دلچسپی لینے کے قابل نہیں، اس صنف میں اعلیٰ ترین ذہن بھی فن لطیف میں کوئی ایسا کارنامہ پیش نہیں کر سکا جو واقعی خالص اور طبع زاد ہو، صرف فن لطیف ہی نہیں، یہ صنف کسی میدان میں بھی مستقل نوعیت کا کوئی کام نہیں کر سکی،

اور یہ کتنی لغو بات ہے کہ جائداد کے حقوق عورتوں کو دیدئے جائیں، تمام

---

[۱] مفصل بحث کے لئے مصنف کی کتاب اقبال اور مغربی مفکرین میں مقالہ بعنوان "اقبال اور شوپن ہاوُر" ملاحظہ کیجئے،

عورتیں چند متشیات کو چھوڑ کر فضول خرچی کی جانب مائل ہوتی ہیں، وہ حال میں زندگی بسر کرتی ہیں اور اُن کی گھر سے باہر کی سرگرمی محض بازار میں خریداری کرنا ہے اُن کا تقسیم فرائض کا نظریہ یہی ہے اس لئے میری رائے یہ ہے کہ عورتوں کو اپنے معاملات کا انتظام ہاتھ میں لینے کی اجازت بھی کبھی نہیں دینا چاہئے بلکہ جیسا کہ ہندوستان میں رواج ہے انہیں ہمیشہ کسی مرد کی نگرانی میں رہنا چاہئے خواہ وہ باپ ہو، شوہر ہو یا بیٹا ہو اور اگر یہ نہیں تو اُن پر حکومت کی نگرانی ہونا چاہئے"

شوپن ہاورجو چاہے کہے لیکن ہندوستان کی طرزِ معاشرت کو سمجھنے میں اس نے غلطی کی ہے، باپ شوہر یا بیٹے کی نگرانی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عورت کو ہندوستان میں کم تر یا ذلیل سمجھا جاتا ہے، بلکہ یہ ہندوستان کے معاشرے کا ایک صحت مند پہلو ہے، جسے اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

اک زندہ حقیقت میرے سینے میں ہے مستور کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

اقبال نے اپنے اس نظریے کے پیشِ نظر عورت کی جو تصویر پیش کی ہے اس کا ایک رُخ اگر "والدہ محترمہ کی یاد میں" ہے تو ایک رُخ "فاطمہ بنت عبد اللہ" ہے جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی، اسی طرح "شرف النساء" بھی اسی تصویر ہی کا ایک رخ ہے اور حضرت زہراؓ بھی جو ایک انتہائی تابناک پہلو ہے،

(۴)

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اقبال عورت کے لئے ایک مصلح اور ریفارمر ہی بن کر آئے تھے، اقبال کی زندگی تجربات کا مرقع تھی، ان تجربات میں مشاہدات بھی شامل تھے، اور تفکر بھی استغراق بھی اور مطالعہ بھی، اور عنفوانِ شباب کی رنگ رلیاں بھی، مثنوی "رموزِ بیخودی" کے آخر میں حضرت رحمۃ للعالمینؐ سے عرضِ حال کرتے ہوئے خود اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ میں مدتوں عشقِ مجاز

اور اس کے متعلقات میں مبتلا رہا لیکن یہ آرزو میرے سینے میں ہرا برآباد رہی کہ میری موت حجاز میں ہو

فرماتے ہیں،

مدتے بالالہ رویاں ساختم ‎ ‎ ‎ ‎ عشق با مرغولہ مویاں باختم

بادہ با ماہ و سیمایاں زدم، ‎ ‎ ‎ ‎ برچراغ عافیت داماں زدم

برق رقصید گرد حاصلم ‎ ‎ ‎ ‎ رہزناں بردند کالاے دلم

ایں شراب از شیشۂ جانم نریخت ‎ ‎ ‎ ‎ ایں زر ساراز داماں نم نریخت

ہست شاں رحمت گیتی نواز ‎ ‎ ‎ ‎ آرزو دارم کہ میرم در حجاز

فرخا شہرے کہ تو بودی در آں ‎ ‎ ‎ ‎ اے خنک خاکے کہ آسودی در آں

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش، ‎ ‎ ‎ ‎ مرقدے در سایۂ دیوار بخش

شہزادی بمبا ملس سنگھ اقبال کی بہت مداح تھیں۔ اور اقبال کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کرتی رہتی تھیں۔ ایک دفعہ بمبا نے شالامار میں چائے کا انتظام کیا، اس کی آسٹریلین سہیلی کے علاوہ ایک اور یورپین خاتون بھی مدعو تھیں، ایک نے علامہ اقبال کی خدمت میں باغ کا ایک پھول پیش کیا اور دوسرے نے ایک خوبصورت بلی پال رکھی تھی، جو اس کی گود میں بیٹھی تھی علامہ کی یہ نظمیں پھول کا تحفہ عطا ہونے پر اور کسی کی گود میں بلی کو دیکھ کر اس موقع کی یاد میں لکھی گئی تھیں[1]

اپنی ایک قدرداں خاتون کا جن کے بارے میں انھوں نے حسن و عشق[2]، کلی[3]، اور وصال[4] ایسی نظمیں کہیں اُن کی آٹوگراف بک میں یہ شعر لکھ دیا،

---

[1] ذکر اقبال،

[2] جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں ‎ ‎ ‎ ‎ نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں

[3] مرے خورشید کبھی تو بھی اٹھا اپنی نقاب ‎ ‎ ‎ ‎ بہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہ بیتاب

[4] تیرے آنے تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی ‎ ‎ ‎ ‎ دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

عالم جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہیے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

ہنرورانِ ہند کے عنوان سے اقبال کا ایک مشہور قطعہ ہے جس کا آخری شعر ہے۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اس شعر کا ذکر کرتے ہوئے حفیظ ہوشیار پوری اپنے ایک مقالہ عمر عزیز کے بہترین لمحے میں لکھتے ہیں:- ایک دفعہ جوشی صاحب اور پروفیسر تبسم صاحب کی معیت میں آپکے پاس گیا۔ فوراً مضمون اور نظموں کا ذکر چھڑ گیا، جو آج کل اردو کے عام رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔ علامہ مرحوم اس بات پر اظہار افسوس کر رہے تھے کہ مجھے ضرب کلیم کا یہ شعر یاد آ گیا۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

میں نے یہ شعر پڑھا اور پھر مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے ان اشعار کی طرف اشارہ کیا، جو آپ نے حکمتِ فرعونی کے عنوان کے تحت عصر حاضر کے متعلق لکھی ہیں۔

دخترانِ او بزلفِ خود اسیر
شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر

ساختہ پرداختہ دل باختہ
ابروانِ مثلِ دو تیغ آختہ

ساعدِ سیمینِ شاں عیشِ نظر
سینۂ ماہی بہ موج اندر نگر

اس کے بعد علامہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان فارسی اشعار میں آپ نے عورت کا ذکر جس والہانہ انداز میں کیا ہے اس کے پیش نظر یہ شعر آپ پر بھی صادق نہیں آتا؟

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ "اس شعر میں عورت شاعر پر سوار ہے، لیکن مثنوی کے فارسی شعروں میں شاعر عورت پر سوار ہے" اور دونوں میں فرق ظاہر ہے[1]

---

[1] ملفوظاتِ اقبال

(۵)

لیکن اس قسم کے ضمنی واقعات یا لطیفے اقبال اور عورت ایسے گہرے موضوع پر کسی قدر کا تعین کرنے میں اتنی رہنمائی نہیں کرتے، جتنے وہ اشعار جن میں انھوں نے اس موضوع پر ان تمام مشاہدات اور تجربات کے بعد اپنے نظریات بیان کئے ہیں، ان تمام تجربات کا نچوڑ اقتباسات کی صورت میں اس مقالے میں آچکا ہے، یہاں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں یہ بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ اقبال اپنے کلام میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ بلند ارشادات بھی لائے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ

حبب الی من دنیاکم الطیب	مجھے دنیا کی چیزوں میں خوشبو اور
والنساء وجعلت قرۃ عینی فی	اور عورتیں پسند کرائی گئی ہیں، اور میری
الصلوٰۃ۔	آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے،

اقبال نے اس حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے کہ

"جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے،"

انھوں نے امومت کو رحمت کہا ہے، اور اُسے نبوت سے تشبیہ دی ہے۔ ماں کی شفقت کو وہ پیغمبر کی شفقت کے قریب کہتے ہیں، اس لئے کہ اس سے بھی اقوام کی سیرت سازی ہوتی ہے اور ایک ملت وجود میں آتی ہے،

اس تصریح کے بعد کلام اقبال میں عورت کے درجہ کی بحث ان اشعار کے بغیر نامکمل رہے گی جن میں اقبال مخدراتِ اسلام سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں

اے ردایت پردۂ ناموس ما تابِ تو سرمایۂ فانوسِ ما

طینتِ پاکِ تو مارا رحمت است قوتِ دین و اساسِ ملت است

کودک ما چوں لب از شیر تو شست — لا الہ آموختی او را نخست
می تراشد مہر تو اطوار ما — فکر ما گفتار ما کردار ما
برق ما کو در سحابت آرمید — بر جبل رخشید و در صحرا تپید
اے امین نعمت آئین حق — در نفسہائے تو سوز دین حق
دور حاضر تر فروش و پُر فن است — کاروانش نقد دیں را رہزن است
کور و یزداں ناشناس ادراک او — ناکساں زنجیری پیچاک او
چشم او بیباک و ناپرواستے — پنجۂ مژگانِ او گیراستے
آب بند نخل جمعیت توئی — حافظ سرمایۂ ملت توئی
فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند — چشم ہوش از اسوۂ زہرا مبند

تا حسینے شاخ تو بار آورد
موسم پیشیں بہ گلزار آورد

بہمنی ۔ عثمانی سفارتی تعلقات

از

جناب غلام محمد نظام الدین مغربی لکچرر و صدر شعبۂ تاریخ اردو آرٹس کالج حیدر آباد دکن .

دکن کی بہمنی سلطنت (۱۳۴۷ء تا ۱۵۲۷ء) ہندوستان کی پہلی ریاست ہے جس نے دولت عثمانیہ ترکی کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کئے[1] ان تعلقات کے آغاز میں اس ریاست کے لائق وزیر اعظم خواجہ جہاں محمود گاواں کا خاص حصہ تھا، محمود نے ۱۴۶۶ء میں اپنی وزارت عظمی اور کم عمر سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی (۱۴۶۱ء تا ۱۴۸۲ء) کے زمانہ میں[3] چند سال تک اندرونی مسائل حل کرنے کے بعد بیرون ہند کی ریاستوں اور عالم اسلام کے اہم درباروں کے ساتھ سفارتی اور سیاسی روابط قائم کرنے کی طرف توجہ دی تاکہ ایک طرف اس کی حیثیت بہمنی دربار میں مستحکم ہو، اور دوسری طرف ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں بہمنی سلطنت کا وقار بلند ہو۔[2]

پندرھویں صدی کے نصف آخر میں بہمنی سلطنت اپنی وسعت۔ قوت اور دولت کے اعتبار سے عالم اسلام کی کئی ریاستوں پر سبقت لے جا چکی تھی، اور محمود نے اپنی خارجہ پالیسی کے ذریعے اس ہندوستانی ریاست کے بین الاقوامی وقار میں غیر معمولی اضافہ کیا، اور

---

[1] پروفیسر عزیز احمد - Studies in Islamic Culture in the Indian Environment آکسفورڈ ۱۹۶۴ء ص ۴۲ پروفیسر بشیر احمد The Mughals and the Ottomans پاکستان سہ ماہی کراچی ۱۹۵۸ء ص ۹ (بقیہ حاشیہ ص ۹۹)

اور رسی خارجہ پالیسی کی ایک کڑی دولت عثمانیہ ترکی کے ساتھ سفارتی تعلقات ہیں۔[۱]

بہمنی۔ عثمانی سفارتی تعلقات کی ابتداء ۱۴۶۲ء میں ہوئی۔[۲] یہ تعلقات تین عہدوں

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴) ۲۵ پروفیسر ہارون خان شیروانی History of Mediaeval Deccan جلد ۱۔

حیدرآباد ۱۹۷۳ء جلد ۱ صفحہ ۱۹۰۔ ۳ محمود گاوان نے اپنے اور اپنے بادشاہ کی طرف سے ہندوستان

اور بیرون ہند کی ریاستوں کے امرا اور سلاطین کو جو خطوط روانہ کئے تھے، وہ اس کے مجموعہ منشآت "

"ریاض الانشاء" میں محفوظ ہیں۔ جس کو بعد تصحیح مجلس اشاعت مخطوطات فارسی، حیدرآباد نے ۱۹۴۸ء

میں گورنمنٹ پریس حیدرآباد میں طبع کر کے شائع کیا ہے۔ ہارون خان شیروانی صاحب کا خیال ہے

کہ "ریاض الانشاء" محمود گاوان اور اس کے بعد کے عہد میں ترکی میں قطعی غیر معروف تھی۔ (Bahmanis of Deccan

۔ مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۲۳) لیکن حقیقت یہ ہے

کہ یہ کتاب ترکی میں بے حد مقبول تھی، اور محمود کے انتقال کے پچاس سال کے اندر اندر یا نوپل اور استانبول

میں اس کے کئی قلمی نسخے تیار ہو چکے تھے ان نسخوں کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: راقم کا مضمون ریاض الانشار

کے قلمی نسخے استانبول میں۔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ بابت اپریل ۱۹۷۷ء حاشیہ صفحہ ۲۹۱۔ ۱۵ یہ بات ذہن نشین

رہنا چاہیے کہ بہمنی اور ترکی سلاطین کے تعلقات بالکل مساویانہ درجہ پر قائم تھے۔ البتہ محمود گاوان وزیر کی

حیثیت سے جب سلطان ترکی کو خط لکھتا تو وہ اپنے عہدے کے اعتبار سے سلطان کو مخاطب کرتے وقت

ان کے اعزاز کا خاص خیال رکھتا تھا، پروفیسر شیروانی صاحب نے لکھا ہے کہ محمود نے سلطان ترکی کو

"خلیفہ اسلام" تسلیم کیا تھا۔ (دیکھئے Bahmanis of Deccan ص ۳۲۴۔

حیدرآباد کے ایک اور اسکالر ڈاکٹر نعیم نے بھی یہی بات دہرائی ہے (دیکھئے ۔ Foreign

cultural Relations of Bahmanies) ہارون خان شیروانی

تہنیتی جلد۔ شائع کردہ اسٹیٹ آرکائیوز حیدرآباد ۱۹۶۸ء۔ ص ۳۹۰) مگر دونوں نے محمود کے

میں منقسم ہیں، عہد اول۔ محمود سوم بہمنی و محمد دوم عثمانی کے مابین تعلقات جب کہ محمود گاواں وزیر اعظم تھا۔ عہد ثانی۔ محمد سوم بہمنی اور بایزید دوم عثمانی کے تعلقات۔ اور عہد ثالث۔ محمود شاہ بہمنی

(بقیہ حاشیہ ص ...) ان خطوط پر غور نہیں کیا جو سلطان ابوسعید گورگانی۔ سلطان علاء الدین گیلانی۔ اور سلطان اوزون حسن وغیرہ کے نام لکھے گئے تھے، جن میں ان تمام بادشاہوں کے لیے خلیفۃ اللہ صاحب خلافت کے القاب استعمال کئے گئے ہیں، یہاں تک کہ ریاض الانشاء کے مکتوب نمبر ۱۳ میں سلطان دکن نظام شاہ بہمنی کے لیے بھی "مرکز دائرہ خلافت و قطب فلک سلطنت" کے القاب استعمال کیے ہیں، جس سے ظاہر ہے کہ خلیفۂ اسلام کا جو تصور ہمارے ان مصنفین کے نزدیک ہے وہ محمود گاواں کے نزدیک ان القاب کے استعمال کے وقت نہ تھا، بلکہ وہ ہر بادشاہت کو خلافت سمجھتا تھا، سلطان ترکی کو خلیفہ کہنا محمود کے نزدیک کوئی خاص امتیازی بات نہ تھی اور اس وقت کے سلطان ترکی محمد فاتح کو خلافت کا دعویٰ بھی نہ تھا، سنہ ۱۴۶۹ء میں بیدر اور قسطنطنیہ کے درمیان سفارتی تعلقات کی ابتداء کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ عثمانی وزیر اعظم محمود پاشا کی پہلی وزارت سنہ ۱۴۶۶ء میں ختم ہوگئی، جبکہ ابھی محمود گاواں کا موقف بہمنی سلطنت میں مضبوط نہ ہو سکا تھا۔ اور اس عرصہ میں بیرون ہند سفارتوں کی روانگی بعید از قیاس ہے اور دوسری مرتبہ محمود پاشا سنہ ۱۴۷۲ء میں وزیر اعظم ہوا اور سنہ ۱۴۷۴ء میں معزول کر دیا گیا، اور محمود پاشا کی سفارت کا سنہ ۱۴۷۴ء کے بعد بیدر آنا خارج از بحث ہے، کیونکہ معزولی کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ قید کرکے قتل کر دیا گیا۔ محمود پاشا کی معزولی سے قبل بیدر سے دو مکتوب اور قسطنطنیہ سے ایک مکتوب کی روانگی عمل میں آئی اسی لیے اس دور کے وسائل آمد و رفت اور سفراء کی مہمانداری کی روایات کے پیش نظر ان سفارتی، مراسلات کے درمیان ایک سال کا وقت لازماً لگا ہوگا، سنہ ۱۴۶۹ء کا سال بہمنی۔ عثمانی سفارتی تعلقات کی ابتداء کا سال قرار پاتا ہے۔ محمود پاشا کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام از ایچ۔ آر۔ گب جلد ۳ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۳۷

۔۔۔اور بایزید دوم عثمانی کے تعلقات۔ پہلا عہد بھی تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے (۱) سنہ ۱۴۶۲ء تا سنہ ۱۴۷۳ء۔ (۲) سنہ ۱۴۷۹ء تا سنہ ۱۴۸۱ء (۳) سنہ ۱۴۸۲ء تا سنہ ۱۴۸۱ء

عہد اول کا پہلا دور سنہ ۱۴۶۲ء۔ سنہ ۱۴۷۳ء

بیدر سے قسطنطنیہ سب سے پہلا سفارتی مراسلہ سنہ ۱۴۶۲ء میں محمود گاواں نے محمود دوم عثمانی (سنہ ۱۴۵۱ء تا سنہ ۱۴۸۱ء) کے نام روانہ کیا۔ اس خط میں عثمانی سلطان کی فتوحات پر اظہار مسرت سلطان کی ترقی کے لیے دعا اور ملاقات کی تمنا کا اظہار ہے۔[1]

"تقبیل انامل بحر نایل ابر خصائل۔ بساعدت توفیق بی حجاب سراپردۂ تعویق باکمل طریق حاصل آید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روشن و مبرھن است کہ سطح بسیط اقالیم ارض بالطول والعرض جہت بساط ربعا و حکم و ضبط آن پادشاہ جہاں پناہ مرتب و موضوع است ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہزار سال بقائے تو باد افزون تر" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ لیکن خط کے متن سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ بہمنی سفیر کی حیثیت میں کس شخص کو ترکی روانہ کیا گیا تھا۔

قسطنطنیہ سے بیدر پہلا سفارتی خط عثمانی وزیر اعظم محمود پاشاہ کی طرف سے آیا چونکہ خط کا متن دستیاب نہیں ہے اسی لیے صرف اسقدر گمان کیا جاسکتا ہے کہ یہ مکتوب بہمنی وزیر کے متذکرۂ بالا مکتوب کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ محمود گاواں کو عثمانی وزیر اعظم کے مکتوب کی وصولی پر جو غیر معمولی مسرت ہوئی، اس کا اظہار جوابی مکتوب میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔[2]

۱؎ ریاض الانشاء (مطبوعہ) ص ۳۱۲ و ریاض الانشاء (قلمی نسخہ) فاتح کتب خانہ استانبول نمبر ۴۰۷۱ صفحات ۱۲ب تا ۲۳ب۔ ۲؎ ریاض الانشاء (مطبوعہ) ص ۱۳۹ و ریاض الانشاء (قلمی) ص ۱۰۸ ب

مخفی نماند کہ چوں مکتوب مسرت مشحون بصنوف وفنون اظہار اتحاد موشح بود لا جرم چمن فواد از تقاطر غمام اقلام آن می آثار کرام مرشح آمد وتخم محبت کہ در مزرعۂ دل کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل بود'' ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محمود کو عثمانی سفراء کے ذریعہ سلطان ترکی اور ترک وزیر اعظم کے اختلافات کا علم ہوچکا تھا، اسی لیے عہدۂ وزارت کی مشکلات کا ذکر یوں کرتا ہے ''واساس استحقاق وزارت ونیابت کہ ورین زمان سمت انہدام واندراس پذیرفتہ بود۔ بدعایم وقوایم اصابت رای وکمال سداو آن صدر دیوان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زینت واستحکام یافتہ است''۔ بہمنی سفراء مقیم قسطنطنیہ کی خاطر خواہ عزت افزائی اوران پر خصوصی توجہ کے لیے لکھتا ہے: ''دربارۂ انفار واسفار کہ درآن دیار اند نظر اکسیر اثر دریغ نمی دارند وسحاب اکرام وافضال بر چمن حال شان می بارند''[۱] اس عبارت سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بہمنی سفراء اس وقت قسطنطنیہ میں مقیم تھے، اور محمود پاشا کا مکتوب خصوصی عثمانی سفراء کے ذریعہ بیدر پہنچا تھا۔ بہمنی سفراء کی خاطر خواہ عزت افزائی کے لئے عثمانی وزیر اعظم کی توجہ مبذول کرانے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کہ اس کے ذریعہ عثمانی دربار میں اور ملکوں کے سفراء پر بہمنی۔ عثمانی گہرے برادرانہ روابط کا سکہ بٹھایا جائے اور ان ملکوں میں بھی اس کے ذریعہ بہمنی سلطنت کا وقار بلند ہوسکے،

چونکہ عثمانی وزیر اعظم کے نام پھر کوئی خط نہیں بھیجا گیا اور نہ آگے دونوں وزراء کے درمیان مراسلت ہوسکی اسی لئے اندازہ ہوتا ہے کہ محمود گاواں کے اس جوابی مکتوب کی روانگی کے بعد ہی محمود پاشا کے قید وقتل کا واقعہ پیش آچکا تھا۔

---

[۱] ریاض الانشاء (مطبوعہ) صفحہ ۱۲۵ ؛ ریاض الانشاء (قلمی) ص ۸۰ ب

دوسرا دور ۱۴۶۹ء تا ۱۴۸۱ء

محمد سوم بہمنی اور محمد دوم عثمانی کے عہد میں سفارتی مراسلات کا دوسرا دور ۱۴۶۹ء سے شروع ہوتا ہے، اس کا سبب یہ تھا کہ بہمنی دربار میں یہ اطلاع پہنچی کہ کسی سخت معرکہ میں عثمانی سلطان بال بال بچ گئے، اور اب سلطان سلامت اور محفوظ ہیں، اس اطلاع پر محمود نے سلطان بہمنی کی طرف سے مبارک باد کا مکتوب ایک خصوصی ایلچی فارس خان کی وساطت سے روانہ کیا۔ اس میں سلطان کی سلامتی پر مسرت کا اظہار، اور بہمنی سفیر کی روانگی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا۔

"این صحیفۃ المودۃ فی اواسط ذی قعدہ از مرحلۂ ضمیر منزل تحریر نزول یافت مبنی بر آنکہ چون اخبار سار مشتمل بر سلامتی آن ذات معدلت شعار و جریان سیلاب سیوف صاعقہ مواداش بر سبل صدور دمہر ظہور کفار دا صراد و اصل شد۔ از استماع این خبر فرحت اثر منجوق رایت مسرت روان بفرق عیوق آسمان رسید و سر ملک از ملائکہ ملاء اعلیٰ ندائے اداے حمد و ثنا را بگوش ہوش شنید ....

دریں وقت از وفور شوق و کمال کلف بر وفق مضمون نما تعارف منہا ائتلف زین الاکفار والاقران معتمد فارس خان بسمت رسالت موسوم گشت تا ابواب استجاب بانامل رسل و مفتاح کتاب منفتح باشد۔"[5]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ میں بہمنی سفیر کا شاندار استقبال کیا گیا اور جب فارس خان نے واپسی کی اجازت چاہی تو سلطان محمد فاتح نے حسب ذیل فرمان بزبان ترکی جاری کرکے روانگی کی اجازت عطا کی۔[6]

---

[5] ریاض الانشاء (مطبوعہ) ص ۲۹۳۔ [6] قانون نامہ (قلمی) بایزید دولت کتب خانہ استانبول قسم ولی الدین نمبر ۱۹۶۹ صفحہ ۱۰۴

نشان میمون عالی شان
وفرمان سامی مکان انفذہ
اللہ تعالی الی انقراض
الدوران حکمی اولدرکہ
دارندۂ توقیع رفیع جناب امارت
مآب افتخار الامراء الکرام الکبراء
العظام ذو القدر والاحتشام
المختص بعنایات اللہ الملک
المنان فارس خان دامت
معالیہ هند پادشاهندن
رسالت طریقلہ عتبہ
علیامزہ گلوب شوکتدہ
وظائف خدمات مبرورہ
رسالت درمقتضای
وما علی الرسول الا البلاغ
علی وجہ التبلیغ قلوب
اجازت انصراف و
ریلیوب بر موجب العود
احمد عودت ایدوب"

نشان میمون عالی شان وفرمان
سامی مکان انفذہ اللہ تعالیٰ الی
انقراض الدوران حکم ہوا کہ توقیع
رفیع کے حامل جناب امارت مآب
افتخار الامراء الکرام مختار الکبراء و
العظام ذو القدر و الاحتشام
المختص بعنایات اللہ الملک المنان
فارس خان دامت معالیہ
ہندوستان کے پادشاہ کی
طرف سے ہمارے دربار میں سفیر
کے طور پر آئے، اس طرح سفارت
کی لازمی خدمات اس مقولہ
کے مطابق کہ قاصد کے ذمہ پہنچا
دینا ہے، بہتر طریقہ پر انجام دینے
واپسی کی اجازت دی جاتی ہے،
تاکہ بہتر طریقہ پر واپسی عمل
میں آئے۔

مذکورۂ بالا فرمان میں کسی جوابی مکتوب کا ذکر موجود نہیں اسی لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ مکتوب بعد میں عثمانی سفیر کے ذریعے روانہ کیا گیا۔ اور یہ عثمانی سفیر خواجہ جمال الدین حسن تھا جس کی دکن میں آمد اور سلطان ترکی کے مکتوب کی وصولی کا ذکر محمود گاواں نے بعد کے جوابی مکتوب میں کیا ہے۔ خواجہ جمال الدین حسن کے لائے ہوئے مکتوب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تاریخ تحریر اس کی آخری سطر میں درج ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بیدر سے قسطنطنیہ کے لیے روانگی اور قسطنطنیہ سے بیدر میں عثمانی سفیر کی آمد کے درمیان نو ماہ کا وقفہ رہا۔

سلطان ترکی نے اپنے اس مکتوب میں بہمنی وزیر اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے انتہائی تعظیمی القاب استعمال کیے " عالیجناب وزارت مناب امارت مآب صاحب اعظم دستور اکرم افخم خواجہ جہان ممہد ارکان الجود والاحسان مشید بنیان الفضل والامتنان یمین الدولۃ البہمنیہ امین الملۃ المحمدیہ مرسل العلماء الاعلام صاحب الجوار المنشآت فی البحر کالاعلام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نظام الاسلام والملک والدولۃ والدین محمود اعلی شانہ"۔ بہمنی سفیر فارس خان کی آمد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "درین وقت اعز واکرم مجمع مکارم الادب ومحاسن الشیم فخر الفوارس والشجعات للہ در فارس سایر رکاب عالم پناہ آمد" آخر میں تاریخ تحریر یوں درج کی گئی ہے، "تحریرا بالامر العالی الاعلی المتعالی فی اوایل رجب المرجب سنہ خمس وثمانین وثمانمایۃ"[1]

---

[1] خواجہ جمال الدین حسن کے لائے ہوئے اس مکتوب کو مشہور عثمانی رئیس الکتاب عبد اللہ آفندی نے "منشات فارسی" میں صفحات ۲۸ الف تا ۲۹ ب پر نقل کیا ہے، جو انھوں نے ۱۰۳۹ھ مطابق ۱۶۲۹ء میں مرتب کی تھی۔ ڈاکٹر نعیم نے ہارون خان شیروانی تہنیتی جلد میں اس مکتوب کو منشات خواجہ جہاں میں

نشان میمون عالیشان
و فرمان سامی مکان انفذہ
اللہ تعالی الی انقراض
الدوران حکمی اولدہ کہ
داراندہٴ توقیع رفیع جناب امارت
مآب افتخار الامراء الکرام الکبراء
العظام ذو القدر والاحتشام
المختص بعنایات اللہ الملک
المنان فارس خان دامت
معالیہ ھند پادشاھندن
رسالت طریقلہ عتبہ
علیامہ کلوب شولکدہ
وظائف خدمات مبرورہ
رسالت در مقتضای
وما علی الرسول الا البلاغ
علی وجہ التبلیغ قلوب
اجازت انصراف و
رایلیوب بموجب العود
احمد عودت ایدہ وب"

نشان میمون عالی شان و فرمان
سامی مکان انفذہ اللہ تعالیٰ الی
انقراض الدوران حکم ہوا کہ توقیع
رفیع کے حامل جناب امارت مآب
افتخار الامراء الکرام مختار الکبراء
العظام ذو القدر و الاحتشام
المختص بعنایات اللہ الملک المنان
فارس خان دامت معالیہ
ہندوستان کے پادشاہ کی
طرف سے ہمارے دربار میں سفیر
کے طور پر آئے، اس طرح سفارت
کی لازمی خدمات اس مقولہ
کے مطابق کہ قاصد کے ذمہ پہنچا
دینا ہے، بہتر طریقہ پر انجام دیں،
واپسی کی اجازت دی جاتی ہے،
تاکہ بہتر طریقہ پر واپسی عمل
میں آئے۔

مذکورۂ بالا فرمان میں کسی جوابی مکتوب کا ذکر موجود نہیں اسی لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ مکتوب بعد میں عثمانی سفیر کے ذریعے روانہ کیا گیا۔ اور یہ عثمانی سفیر خواجہ جمال الدین حسن تھا جس کی دکن میں آمد اور سلطان ترکی کے مکتوب کی وصولی کا ذکر محمود گاواں نے بعد کے جوابی مکتوب میں کیا ہے۔ خواجہ جمال الدین حسن کے لائے ہوئے مکتوب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تاریخ تحریر اس کی آخری سطر میں درج ہے، جس سے یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بیدر سے قسطنطنیہ کے لیے روانگی اور قسطنطنیہ سے بیدر میں عثمانی سفیر کی آمد کے درمیان نو ماہ کا وقفہ[1] سلطان ترکی نے اپنے اس مکتوب میں بہمنی وزیر اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے انتہائی تعظیمی القاب استعمال کیے "عالیجناب وزارت مناب امارت مآب صاحب اعظم دستور اکرم افخم خواجہ جہان ممھد ...ان الجود والاحسان مشید بنیان الفضل والامتنان یمین الدولۃ البھمنیہ امین الملۃ المحمدیہ مرسل العلماء الاعلام صاحب الجوار المنشآت فی البحر کالاعلام ..... نظام الاسلام والملک والدولۃ والدین محمود اعلیٰ شانہ"۔ بہمنی سفیر فارس خان کی آمد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "دریں وقت اعز واکرم مجمع مکارم الادب ومحاسن الشیم فخر الفوارس والشجعان للہ در فارس سایر الاکار عالم پناہ آمد" آخر میں تاریخ تحریر یوں درج کی گئی ہے، "تحریراً بالامر العالی اعلی المتعالی فی اوائل رجب المرجب سنہ خمس وثمانین وثمانمایۃ"[2]

---

[1] خواجہ جمال الدین حسن کے لائے ہوئے اس مکتوب کو مشہور عثمانی رئیس الکتاب عبداللہ افندی نے "منشات فارسی" میں صفحات ۲۸ الف تا ۲۹ ب پر نقل کیا ہے، جو انھوں نے ۱۰۳۹ھ مطابق ۱۶۲۹ء میں مرتب کی تھی۔ ڈاکٹر نعیم نے ہارون خان شیروانی تہنیتی جلد میں اس مکتوب کو منشات خواجہ جہاں میں

اس طرح یہ مکتوب محمود گاواں کے انتقال سے صرف سات ماہ قبل رجب ۸۸۵ھ مطابق اگست سنہ ۱۴۸۰ء میں روانہ کیا گیا تھا، اور بہمنی دربار میں وصولی پر سفارتی تعلقات عہد اولین کا دوسرا دور مکمل ہو جاتا ہے۔

تیسرا دور سنہ ۱۴۸۰ء تا ۱۴۸۱ء

عہد اولین کی سفارتی سرگرمیوں کے تیسرے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب بہمنی سفیر خواجہ عبد المنان کو قسطنطنیہ بھیجا گیا۔ اس کے ذریعے محمود گاواں نے سلطان ترکی کے مکتوب مورخہ رجب ۸۸۵ھ کا جواب روانہ کیا تھا۔ ریاض الانشاء کے صفحہ ۳۹۳ پر اس کی سرخی صرف اس قدر درج ہے۔

"مما کتب الی سلطان محمد شاہ الرومی" اس کے برخلاف عثمانی رئیس الکتاب احمد فریدون بے نے "منشآت السلاطین" جلد اول میں صفحہ ۲۵۸ پر حسب ذیل سرخی درج کی ہے۔

"ابوالفتح والمغازی جنت مکان سلطان محمد خان غازی حضرتلری درگاہ ہند خواجہ جہان انشا سیلہ ہند پادشاہی بہمن شاہ طرفندن تقدیم اولان نامہ نلک صورتیدر"

(ابوالفتح والمغازی جنت مکان سلطان محمد خان حضرت غازی کے دربار کو بھیجے جانے والے بادشاہ ہند بہمن شاہ کے مکتوب کی نقل ہے، جس کا مسودہ خواجہ نے تیار کیا۔)

اس میں محمود گاواں نے سلطان ترکی کے مکتوب کی وصولی پر اپنی بے پایاں

(بقیہ حاشیہ ص ۵۱) منقولہ ظاہر کیا ہے، جو صحیح نہیں۔ ڈاکٹر نعیم کے بیان کے لیے دیکھیے "Foreign cultural the Relations of the Bahmanies" H.K. Sherwani Felicitation-volume حیدرآباد ۱۹۶۵ء ص ۳۹۰ بحوالہ نشان ۳۲۷۔

مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے، "الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب وجعلہ من عندھم لذلفی وحسن مآب بیت۔

آفتاب اندر بدخشان لعل سازد سنگ را
جذبکا موشی چہ گوید سنگ شکر آفتاب۔

مکتوب میں بیدر میں عثمانی سفیر کی آمد کا بیان اس طرح "جناب فخرالاماجد جامع المحاسن خواجہ جمال الدین حسن حفظہ اللہ تعالیٰ من حوادث الزمن ...... شرف قدوم بشارت مفہوم ارزانی داشت"[۱۲]

بہمنی سفیر عبدالمنان کے قسطنطنیہ پہنچنے پر سلطان محمد فاتح نے اس خط کا جواب بھی بیدر روانہ کیا، جو غالباً محمود کے انتقال کے بعد پہنچ سکا۔ اگر محمود کو یہ خط مل جاتا تو ریاض الانشاء میں اس کا حوالہ اور لانے والے سفیر کا نام ضرور درج ہوتا۔

بہرحال سلطان ترکی اپنے اس دوسرے مکتوب میں حسب سابق محمود گاواں کو اعلیٰ القاب کے ساتھ مخاطب کرنے کے علاوہ بہمنی سفیر کی آمد کا ذکر اس طرح کیا ہے "

" واضح باشد کہ دریں وقت جناب رفعت مآب واعزاکرام امجدوافخم مجمع

(بقیہ حاشیہ ص ۵۲) منشات فارسی از جمع صاری عبداللہ آفندی کا ایک نسخہ سلیمانیہ کتب خانہ استانبول کے ذخیرہ اسعد آفندی میں نمبر ۳۳۳۳ محفوظ ہے، اس نسخہ میں ۱۰۰ اوراق اور سائز ۲۵ × ۲۰ سم ہے، اسعد آفندی کے ذخیرہ سے علامہ شبلی نعمانیؒ نے بھی اپنے قیام قسطنطنیہ کے دوران استفادہ کیا تھا، اس وقت وہ ایک آزاد کتب خانہ تھا، اب سلیمانیہ کتب خانہ میں ضم کر دیا گیا ہے، مضمون نگار کو ۱۹۷۰ء میں چھ ماہ اس کتب خانہ سے استفادہ کا موقع ملا۔

[۱۲] ریاض الانشاء ص ۲۹۳ جلد نمبر ۱ و منشآت السلاطین جلد ۱ ص ۲۵۸ تا ۲۵۹

مکارم الآداب و محاسن الشیم افتخار الاعیان خواجہ عبد المنان اعطاہ اللہ ما تمناہ تشریف داد و کتاب لطیفہ و خطاب شریف رسانید و مراسم تعظیم بتقدیم رسید۔"

مکتوب خاتمہ پر سلطان دکن کے لیے حسب ذیل الفاظ میں دعا درج ہے،

خورشید تخت آن عالی همم قرین بخت برجیس محتشم و بهرام و کیوان کمترین چاکران جناب انجم حشم باد بالنبی و آلہ الامجاد بیت

ہمیشہ تا کہ جہان در کمی و افزونست حسود جاہ تو کم باد و جاہت افزون باد[1]

دربار دکن کے پاس سلطان محمد فاتح کا یہ آخری مکتوب تھا، افسوس کہ اس پر تاریخ درج نہیں ورنہ لانے والے سفیر کا پتہ چلتا ہے۔

عہد ثانی۔ محمد سوم بہمنی اور بایزید دوم عثمانی کے تعلقات

ربیع الاول ۸۸۶ھ مطابق مئی ۱۴۸۱ء میں فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد دوم کا انتقال ہوگیا، اس سے صرف چند دن قبل بیدر میں محمود گاواں کے قتل کا واقعہ ۵ صفر ۸۸۶ھ کو پیش آچکا تھا، نئے سلطان بایزید عثمانی نے اپنے والد سلطان محمد کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے تخت نشینی کے کچھ ہی عرصہ بعد سلطان دکن کے دربار میں اپنا سفیر روانہ کرنا ضروری خیال کیا، چنانچہ ایک عالم مولانا سید محمد کو اپنے مکتوب کے ساتھ ہندوستان روانہ کیا۔[2] اس میں سلطان بایزید نے اپنے والد کے انتقال کی اطلاع دیتے ہوئے بہمنی سلطان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ محمود گاواں کی کوشش سے دونوں مملکتوں کے درمیان جو دوستانہ تعلقات قائم ہوئے انھیں آیندہ بھی جاری رکھا جائے۔ مکتوب کے متن کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔[3]

---

۱ منشآت السلاطین جلد ۱ ص ۲۶۲ تا ۲۶۳ ۲ احمد فریدون بے جلد ۱ ص ۲۹۹

۳ اس مکتوب کی سرخی فریدون بے نے غلط طور پر یوں درج کی ہے: "جنت مکان سلطان بایزید خان

والا جناب سلطنت مآب عزت نصاب سعادت اکتساب سیادت انتساب دولت و رفعت قباب .... تحف تحیات وافرہ و ظرف تسلیمات متکاثرہ ....

(بقیہ حاشیہ ص ۵۴) غازی حضرت لوی در کاهندن ہند پادشاہی سلطان خلیل طرفنہ گوندریلان نامہ ہمایونلری صورتیدر" (جنت مکان سلطان بایزید خان حضرت غازی کے دربار سے ہندوستان کے بادشاہ سلطان خلیل کی طرف بھیجے جانے والے شاہی مکتوب کی نقل ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں ہندوستان میں سلطان خلیل کوئی بادشاہ ہی نہیں گزرا۔ البتہ اس وقت گجرات میں شہزادہ خلیل خان موجود تھا، جو ۱۵۱۲ء میں مظفر دوم کے لقب سے بادشاہ ہوا، لیکن اس بادشاہ کے خط میں محمود گاوان کا ذکر بے معنی ہے، خط کے متن میں قدیم روابط اور محمود گاوان کے قائم کردہ تعلقات کا خاص طور پر ذکر ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ یہ مکتوب سلطان دکن محمد شاہ لشکری کا موسومہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مکتوب کی مزید کوئی نقل دستیاب نہیں لیکن اس کا جواب فریدون بے کی منشآت السلاطین کے علاوہ استانبول کے کتب خانوں کی منشآت کے دو اور مجموعوں میں موجود ہے جن پر سلطان ہند کا خط ہونے کی سرخی درج ہے

فریدون بے نے اس ایک مکتوب کی سرخی ہی میں غلطی نہیں کی بلکہ مزید اور خطوط کی سرخیوں میں بھی غلطی کی ہے، مثلاً جلد ۱ صفحہ ۱۱ پر مغل شہنشاہ ہمایوں کے مکتوب موسومہ سلطان سلیمان کو پادشاہ ایران شاہ طہماسپ کا خط اور جلد ۱ صفحہ ۳۱۹ پر سلطان سلیمان کے مکتوب موسومہ سلطان گجرات احمد شاہ ثالث کو بحرین کے حاکم کا موسومہ ہونا ظاہر کیا ہے۔ منشآت السلاطین فریدون بے ایک ایسا مجموعہ ہے جس سے بڑے بڑے مستشرقین جیسے پروفیسر ایڈورڈ براؤن۔ پروفیسر ایچ۔ اے۔ آر۔ گبنس اور ہیمر پرگسٹال وغیرہ نے استفادہ کیا ہے۔ مصر، ترکی، ایران وسط ایشیا اور ہندوستان کی تاریخ کا اہم ماخذ ہونے کے باوجود یہ کتاب بے شمار غلطیوں کا مجموعہ ہے

مطالعہ نمایند و بدانند کہ چون جد اول مستقیمۂ اشخاص ممتلۂ عالم ناسوت و مناہل مستدیمۂ معمورۂ ملکوت از تلاطم قلزم زخار غیب مطلق وتر اکم قمقام جواہر نثار عالم عرجاری و منشق گشت۔ بمقتضائے حکمت قادر بیچون و مرتضائے ارادت حاکم کن فیکون۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در چمن خلد بریں ظل عبسط طوبی المن ظل فی ظلہ بر چہرہ حال نشست مقدما بوسیلۂ اظہار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خلوص نیت جناب وزارت مآب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خواجہ جہان محمود گاوانی ادام اللہ اعوام عمرہ و وزارتہ اتحاد و یگانگی آن جناب۔ ۔ ۔ ۔ جلوہ گری نمودہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روضہ مودت خشک اگر نہ واسطۂ رشحۂ قلم باشد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بدان صوب صولت مآب سفارت قدوۃ السادات والاکابر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سید محمد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مبلغ کردانیدہ شد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعد اداء ای رسالت حسن اجازت وانصراف دادہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باخبار سلامتی ذات شریف وعنصر لطیف روانہ گردانند۔"

محمد شاہ بہمنی نے سلطان بایزید دوم کے مکتوب کے جواب میں ایک تفصیلی مراسلہ روانہ کیا جس میں دونوں مملکتوں کے قدیم تعلقات کے قیام میں محمود گاواں کی کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے قبل کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور آیندہ بھی سفارت اور

(بقیہ حاشیہ ص ۵۵) جس کی خاطر خواہ ایڈیٹنگ کی ضرورت ہے، بڑی حیرت کی بات ہے کہ پروفیسر ایڈورڈ براؤن، اور پروفیسر ہارون شیروانی نے اپنی تالیفات "تاریخ ادبیات ایران" اور "محمود گاوان" مین بہمنی سلطان اور سلطان ترکی کے ان مکاتیب کا تذکرہ کیا ہے، جو منشآت السلاطین کی جلد ۱ صفحات ۲۶۵ تا ۲۷۲۔ مین درج ہیں، لیکن اسی جلد ۱ کے صفحات ۲۹۹ تا ۳۰۱ پر محمد شاہ بہمنی اور بایزید دوم عثمانی کی مراسلت کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

مراسلت کو جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے،[1]

"واضح و ہویدا می گردد کہ صدر الاماثل جامع الفضائل ومحاسن الخصائل سید محمد کہ کوکب استحقاق رسالت از فلک شعار ...... در ایمن ایام واحسن مقام واصل گشت و عدد و دل محبت آمود از صبار ورود مسعودش وایصال کتاب ...... مثال غنچہ دال و لام مذہرہ آمدہ در پیدائے بہجت از غایت مسرت مانند دو چشم ہائے محبت منور گشت .... و درین وقت مولانائے اعظم مفخر العلی مولانا نعمۃ اللہ کہ اخص مخصوصات سید السادات نسبت رسالت متعین وموسوم گردانید ..... ومحقق دانند کہ اگرچہ الی الآن بحسب الصورت خواجہ محمود گاوانی واسطۂ اتفاق طرفین و مادۂ وفاق ذات البین می نمود واو درین وقت بسبب آنکہ از اصحاب خبران وثیق ومعتمدان صاحب سرحد التفش سخنی چند کہ منبی از فساد ومعبر از عدم خلوص وداد او بود بسمع آن صفا فواد رسید واز افعال واعمال صورتی چند مشاہدہ نمود مناسب رتبت او نبود ومستلزم خلاف وعناد می نمود بناء برین بر مقتضاے الناس مجزیون باعمالہم بجالم جزا واصل شدہ، نا ماآں مودت سیما ہمیشہ بذاتہ مباشر تحریک سلسلۂ وداد واتحاد گشتہ وہمین طریقہ پیوستہ مسلوک خواہد داشت ...... آمین فی ذی القعدہ سنۃ ..."

[1] منشآت السلاطین جلد ۱ ص ۳۰۰ ؛ مجموعہ منشآت (قلمی نسخہ) سلیمانیہ کتب خانہ استانبول قسم اسعد آفندی نمبر ۳۴۴۶ صفحہ ۱۵۰ ؛ منشآت خواجہ جہان (ریاض الانشاء) (قلمی) سلیمانیہ کتب خانہ استانبول قسم فاتح نمبر ۳۱۲۲ صفحہ ۲۲۱

(بقیہ حاشیہ ص ۵۸ پر)

اس مکتوب کو قسطنطنیہ لے جانے کے لئے مولانا نعمۃ اللہ کو منتخب کیا گیا تھا، اس سے پہلے وہ محمود گاوان کی وزارت کے دور میں بادشاہ گیلان کے دربار میں سفیر رہ چکے تھے جہاں محمود کو اپنے بہت سے خاندانی مسائل طے کرنے تھے[۱۰]

ان کو بھیجنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ دربارِ عثمانی میں محمود گاوان کے قتل کے بارہ میں اس کے ایک معتمد کی زبان سے محمد شاہ بہمنی کے موقف کی وضاحت و حمایت ہو۔ انکے اس تقرر سے محمد شاہ بہمنی کی غیر معمولی فراست و سیاست کا اندازہ ہوتا ہے۔

ذی قعدہ ۸۸۶ھ میں مولانا نعمۃ اللہ قسطنطنیہ روانہ ہوئے، اس کے صرف دو ماہ بعد یکم صفر ۸۸۷ھ کو محمد شاہ بہمنی کا انتقال ہو گیا۔

عہدِ ثالث (محمود شاہ بہمنی و بایزید دوم کے تعلقات) بہمنی۔ عثمانی سفارتی سرگرمیوں کا تیسرا اور آخری دور تخت بیدر پر محمود شاہ بن محمد شاہ (۱۴۸۲ء تا ۱۵۱۸ء) کی مسند نشینی سے شروع ہوتا ہے۔ سلطان بایزید نے پہل کر کے محمود شاہ کی تخت نشینی پر شاہ برہان الدین خلیل اللہ کو مبارک باد کے مکتوب کے ساتھ دکن روانہ کیا۔[۱۱]

(بقیہ حاشیہ ص ۵۷) ۹ منشآت خواجہ جہاں وہ واحد نسخہ ہے جس میں اس خط کی تاریخ تحریر درج ہے اور یہ نسخہ رجب ۹۱۵ھ میں سلطان بایزید دوم کے دور میں ترکی میں نقل کیا گیا ہے، اسی لئے اس خط کی نقل مصدقہ ہے، مجموعہ منشآت۔ اور منشات السلاطین میں یہ خط "مسلوک خواہد داشت" کے الفاظ پر ختم ہو گیا ہے، تاریخ تحریر حذف ہو گئی ہے، ۱۰ ریاض الانشار (مطبوعہ) صفحہ ۱۳۱، ۳۲۰، ۳۲۳، ۳۲۰، ۳۳۱،

۱۱ عبداللہ آفندی۔ منشآت فارسی۔ صفحہ ۲۴۲ تا ۲۴۴، عبداللہ آفندی نے اس مکتوب کی سرخی غلط طور پر یوں درج کی ہے، "مکتوب بسلطانِ دکن از قبیل سلطان محمد خان علیہ الرحمۃ

اس مکتوب میں عثمانی سلطان نے انتہائی جذباتی انداز میں دونوں خانوادوں کی سابقہ دوستی کا ذکر کیا ہے،

"عالی جناب سلطنت مآب معدلت ایاب جلالت انتساب
. . . . مغیث السلطنۃ والعدالۃ والدولۃ والاقبال محمود
شاہ ہت وجوہ امنہ الملکہ . . . .
الحمد للہ کہ از قدیم الزمان الی ہٰذہ الآن میان این دو دمان
سلطنت آشیان و آن خاندان فلک آستان . . . . . .
رابطہ خلت ووداد وضابطہ یکانگی و اتحاد بنوعی التیام
یذیرفتہ . . . . . . چنان اقتضا می نماید کہ سلاسل سوابق

(بقیہ حاشیہ ص ۵۸) دار الرضوان فرستادہ بود"عبد اللہ آفندی نے اس مراسلت کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد منشآت فارسی مرتب کی ہے، اسی لیے انھیں اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ مکتوب کس کا تحریر کردہ ہے۔ ان کے اس مجموعۂ منشآت میں سلطان بایزید کی طرف سے دکن بھیجا جانے والا کوئی اور مکتوب موجود بھی نہیں۔ چونکہ قدیم فرامین اور شاہی خطوط پر مرسل کا نام درج نہیں ہوتا تھا، اس لیے بھی عبد اللہ آفندی کو غلط فہمی ہوئی ہے، علاوہ ازیں اسعد آفندی کے ذخیرہ کا یہ نسخہ غلطیوں سے معمور ہے، یہاں تک کہ کاتب نے املا کی بھی غلطیاں کی ہیں۔ اگر مکتوب کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو مکتوب کا سارا متن ثابت کرتا ہے کہ یہ محمود شاہ بہمنی کے نام اس کی تخت نشینی کی تہنیت میں تحریر کیا گیا ہے، مرسل اپنے اور مرسل الیہ کے آبا کی دوستی کا بھی حوالہ دے رہا ہے۔ محمود شاہ بہمنی کی تخت نشینی صفر ۸۸۷ھ میں ہوئی، اور اس سے گیارہ ماہ قبل ربیع الاول ۸۸۶ھ میں سلطان ترکی محمد ثانی کا انتقال ہو چکا تھا اسی لیے سلطان محمد کا محمود شاہ کو مکتوب روانہ کرنا خارج از بحث ہے یہ مکتوب دراصل بایزید دوم عثمانی ابن سلطان محمد خان کا مرسلہ ہے۔

مخالصت موروثی برحسب مودی الحب یتوارث بروابط مواخات

در سلک اخوانا علیٰ سُرُرٍ متقابلین مرتبت سازند و نہال

کُنیا اِنّما محبۃ الآباءِ قرابۃ الابناءِ وفرعھا فی السّماءِ انماداره

مثمر ثمار ازاھرِ الافکار قرابۃ الابناء دارند"[1]

بہمنی سلطان کو تخت نشینی پر مبارک باد حسب ذیل الفاظ میں دی گئی ہے۔

"بعد از ارتحال سلطان جنت مکان فردوس مصیر رضوان پذیر بزرگوار ایشان

از میمن استناد آن عالی جناب بر مسند سلطنت و توسل بوسائد خلافت پایۂ قدر سریر

ملک ہمسان اوج کیوان و کنگرۂ ایوان شریف موازی مشرف کاخ آسمان گشتہ

لاجرم بمقتضاے کذالک الابناء و تبدل جہد ہم بتمام ما موسس الاباء التزام مبادرت

بتقدیم مراسم تہنیت این مواہب عظمیٰ و عطیۂ کبری لازم نمود۔ و جناب دولت مآب

سعادت ایاب عمدۃ الاکابر والعجم زبدۃ الاعالی بین الامم خواجہ برہان الدین خلیل الله[2]

رفع الله شانہ برسم پرسش رسالت بدان صوب صواب شما فرستادہ بود تا مقصد

کتابی را بادار شفاہی و خطابی مقترن ساختہ"

بیدر میں ان دونوں کمسن بادشاہ محمود شاہ بہمنی کے لیے حالات قطعی ناسازگار تھے صوبوں

---

[1] عبد الله آفندی صفحہ ۲۶۷ ب

[2] برہان الدین خلیل الله غالباً وہی خلیل الله ہیں جو مولانا کمال الدین رومی کے صاحبزادے تھے جنھیں ان کے والد نے اپنے مکتوب کے ساتھ محمود گاواں کے پاس ایک بار دکن روانہ کیا تھا۔ (دیکھیے ریاض الانشاء مطبوعہ مکتوب نمبر ۱۴۲ صفحہ ۳۰۱) چونکہ مولانا نے موصوف ایک بار بیدر کا سفر کر چکے تھے اور بہمنی دربار سے اچھی طرح واقف تھے، اسی لیے اس اہم سفارت پر مامور کیے گئے۔

کے گورنر اپنی آزادی کا اعلان کرنے میں مصروف تھے، اور خاص پایتخت پر علاؤ نظام الملک بحری اور قاسم بریہ کا قبضہ تھا،[1] ان حالات کے باوجود دربار بیدر سے سلطان ترکی کے لیے قیمتی تحایف قسطنطنیہ روانہ کئے گئے۔[2] جب بہمنی سفراء حجاز و مصر سے گزر رہے تھے تو اس علاقہ کے ملوک سلطان قائتبے نے ان تحفوں میں بالجبر خیانت کر لی جس کے سبب مصر و ترکی کے درمیان ایک مختصر جنگ واقع ہو گئی، مصری مورخ ابن ایاس نے اس کی تفصیلات سنہ ۸۹۰ھ مطابق سنہ ۱۴۸۶ء کے واقعات میں یوں درج کی ہے:

"سبب هذه الفتنة الواقعة وبين السلطان وبين ابن عثمان ان بعض ملوك الهند[3] ارسل الى ابن عثمان هدية حافلة على يد بعض تجار الهند فلما وصل الى جدة احتاط عليها نائب جدة واحضرها صحبته الى السلطان وكان من جملة تلك الهداية خنجر قبضته مرصعة بفصوص مثمنة فطمع السلطان فى تلك الهدية واخذ الخنجر فلما بلغ ابن عثمان ذالك حنق وجاء فى عقب ذالك أن على دولات تعرى على ابن عثمان و شكى له من افعال السلطان وما يصدر منه فتعصب لعلى دولات وأمد بالعساكر

---

[1] ہارون خان شیروانی The Bahmanis of Deccan حیدرآباد سنہ ۱۹۱۶ صفحہ ۳۶۴

[2] ابن ایاس، بدائع الزہور فی وقائع الدہور مطبوعہ مصر سنہ ۱۸۹۴ء جلد ۲ صفحہ ۲۲۷؛ عزیز احمد ص ۴۰۲

[3] ابن ایاس نے یہاں بہمنی سلطان یا سلطان دکن نہیں لکھا لیکن ان دنوں ہندوستان کے کسی اور سلطان کے ساتھ عثمانی سلاطین کے تعلقات نہ تھے، پروفیسر عزیز احمد بھی اس بات سے متفق ہیں کہ تحفہ بھیجنے والا سلطان محمود شاہ بہمنی تھا، اس واقعہ کو عثمانی مورخ سعد الدین نے تاج التواریخ جلد ۲ صفحہ ۴۰ پر "سبب اختلاف روم و عرب" کی سرخی کے تحت یوں درج کیا ہے: ہندستان پادشاہی محمد شاہ بہمنی وزیر اعظمی اولان خواجہ جہان خواجہ محمود گاوانی آئین پیشینری اوزرہ هدایای جزیلہ ایلہ در دولتہ ایلچی گوندروب مصر عبوریری هنگامندہ اول هدایای نفیسہ نک اکثریت خشونت و تشدید ایلہ و بدعت

واستمرت الفتنة تتسع حتی کان منها ما ستذکرہ فی موضعه وقد طمع غالب ملوک الشرق فی عسکر مصر بموجب ما وقع لهم مع سوار وبابندر وغیر ذالک من ملوک الشرق ثم ان السلطان ارسل الخنجر المذکور والهدایة التی بعث بها ملک الهند وارسل یعتذر الی ابن عثمان عن ذالک بعد أن صار ما صار۔[۱۵]

ترجمہ:۔ عثمانی سلطان اور شاہ مصر کے درمیان اس فتنہ کا سبب یہ ہوا کہ بعض ہندوستانی بادشاہوں نے ہندوستانی تاجروں کے ذریعہ سلطان عثمانی کو تحائف بھیجے تھے، جدہ کے مصری نائب نے ان کو شاہ مصر کے پاس بھیجا، تحائف میں ایک خنجر بھی تھا جس کا دستہ قیمتی جواہرات سے مزین تھا، شاہ مصر نے یہ خنجر لے لیا جب عثمانی فرمانروا کو یہ معلوم ہوا تو اسے بہت ناگوار ہوا اور جنگ وجدل کی نوبت پہونچی، جس سے مصر کے لیے بڑا خطرہ پیدا ہو گیا بالآخر شاہ مصر نے شاہ ہند کے مرسلہ تحائف اور خنجر عثمانی کو معذرت کے ساتھ بھیج دیا۔

(بقیہ حاشیہ ص (۶۱) دسیگے اساسنی تجدید ایلدہ غصب ایتشدی" (ہندوستان کے بادشاہ محمد شاہ بہمنی کے وزیر اعظم خواجہ جہان خواجہ محمود گاوانی نے شاہی تعلقات کے اصول کے مطابق قیمتی تحفوں کے ساتھ دردولت پر ایلچی روانہ کیا، مصر عبور کرتے وقت ظلم و بدنیتی کی اپنی سابقہ روش کے احیاء کے ذریعے ان میں سے اکثر قیمتی تحفوں کو غصب کر لیا گیا۔) مورخ سعد الدین نے بھی غلطی کی ہے کہ تحفوں کو محمود گاوان سے منسوب کر دیا، سعد الدین ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوا اور ۹۶۶ھ تا ۱۵۷۴ء کے عرصہ میں "تاج التواریخ" مرتب کی غالباً اس نے سلطان دکن کے تحفوں میں بادشاہ مصر کی خیانت کے واقعہ کو کسی طرح سن کر گمان کر لیا کہ وہ محمود گاوان نے بھیجے ہوں گے، محمود شاہ اور محمود گاوان کے ناموں میں بہت مشابہت سے بھی اُسے غلط فہمی ہوئی ہوگی، سعد الدین کے بیان سے ایک بات تو صریح ثابت ہوئی کہ وہ بہمنی سلطان کے تحفے تھے، جو سلطان ترکی کی خدمت میں بھیجے گئے تھے، مصر میں خیانت کا واقعہ ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء کا ہے اس لیے یہ بھی ثابت ہوا کہ ۸۹۰ھ کے بہمنی سلطان یعنی محمود شاہ بہمنی نے ان تحفوں کو روانہ کیا تھا،

[۱۵] ابن ایاس جلد ۲ صفحہ ۲۲۷

ابن ایاس نے تحفوں میں خیانت کے اس واقعہ کو بیان کرنے کے آٹھ دس سطر بعد اسی ۸۹۰ھ کے واقعات میں حسب ذیل واقعہ بھی لکھا ہے، "وفیہ عمل السلطان المولد النبی وکان حافلا ونصب فی ذالک الیوم الخیمۃ العظیمۃ التی اقامہا علی یدیہ وجاءت فی غایت الحسن والتزخرف وحضر فی ھذا المولد ملک التجار احمد بن محمود گاوان وکان جاء بصحبۃ الحجاج من مکۃ المشرفہ فعظم امرہ بمصر جدا"[1] ابن ایاس نے جو یہ لکھا ہے کہ احمد بن محمود گاواں نے سلطان مصر سے میلاد النبیؐ کی تقریب میں ملاقات کی[2] اور وہاں احمد کی بڑی عزت تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمود شاہ بہمنی نے اسی کے ذریعے یہ تحفے ترکی روانہ کئے تھے،

چونکہ آگے کے دور میں سلطان بایزید اور محمود شاہ بہمنی کے درمیان کسی اور سفارتی مراسلت کا پتہ نہیں چلتا، اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان ترکی کو محمود شاہ کی بے بسی اور دکن کے سیاسی تغیرات کا علم ہو چکا تھا، اسی لئے بہمنی عثمانی تعلقات کا باب سنہ ۸۹۰ھ میں ختم ہو گیا۔ البتہ آگے کے دور میں سلطنت گجرات کے ساتھ نیا سلسلہ شروع ہوا۔[3]

---

[1] ابن ایاس جلد ۲ صفحہ ۲۲۳۔ [2] شاید ابن ایاس کے اس بیان سے بھی مورخ سعد الدین کو غلط فہمی ہوئی کہ تحفے محمود گاوان نے بھیجے تھے،

[3] گجرات اور عثمانیوں کے تعلقات کے لئے ملاحظہ ہو: نظام الدین مغربی۔ The Ottoman- Gujrat Relations ہارون خان شیروانی بہمنی
جلد ۲ صفحہ ۱۸۳

تلخیص و ترجمہ

اردو زبان کی عالمگیریت

(از۔ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم، اے (علیگ)

دہلی کے انگریزی ہفتہ وار اخبار ریڈینس کے ایک انگریزی مضمون سے یہ تلخیص پیش کی جارہی ہے، یہ مضمون ہندوستان کے ان تعلیمی اداروں کے اردو بولنے والے منیجروں اور سکریٹریوں کے لیے قابلِ مطالعہ ہے، جو اردو کو اپنے یہاں ذریعہ تعلیم بنانے میں گھبراتے ہیں۔ ن۔ص،

اردو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور اس کا شمار آئینی طور پر ملک کی چودہ زبانوں میں کیا جاتا ہے، اس کو ترقی دینے میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سب برابر کے شریک ہیں، یہ زبان ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتی ہے، اس زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں مغربی، جنوبی اور وسطی ایشیا کا بھی حصہ ہے، اسی زبان نے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ دیا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی زبانوں میں سے کسی نے بھی قومی یکجہتی کو فروغ دینے میں اتنی مدد نہیں کی جتنی اردو نے کی ہے۔

فارسی اور سنسکرت کے برعکس اردو ایک جدید زبان ہے۔ ترکی لغت میں لفظ اردو کے معنی "فوجی" کے ہیں۔ ہندوستان میں اردو زبان کے وجود کا پتہ اسی وقت سے چلتا ہے جب افغان، ترک اور مغل فوجی یہاں وارد ہوئے۔ آج بھی ہندوستانی فوجیوں کی اکثریت کے اظہار خیال کا ذریعہ اردو ہی ہے۔ کبھی یہ زبان بھاشا، ہندوی، ہندوستانی، ہندی زبان، دہلوی، کھڑی بولی، اردوئے معلی اور مدھیہ پردیش کی بولی کے نام سے یاد کی جاتی تھی،

۱۸۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ جس کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبان سکھانا تھا۔ کالج کے اسوقت کے پرنسپل ڈاکٹر جان گل کرائسٹ نے ہندوستان کے طول وعرض میں سفر کر کے علمی اور عام بول چال کی زبان کی براہ راست تحصیل کی۔ انھوں نے اردو زبان وادب کی ترقی کے پیش نظر ہندوستانی میں بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اردو سیکھنے کی ترغیب دلائی۔ ان کی اس سرپرستی، حوصلہ افزائی اور خود ان کی پرکشش شخصیت کے باعث بہت سے ہندو اور مسلمان اہل قلم کالج میں اکٹھا ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو کے لیے "ہندوستانی" کا لفظ استعمال کیا۔ شاہجہاں کے عہد میں یہ اردوئے معلی "کہی جاتی تھی" آگے چل کر جب افغان اور ترک فوجی یہاں آئے تو اسکو ایک نیا نام اردو بمعنی فوجی یا لشکری دیا گیا۔ اسی زمانہ سے اس زبان کو "ریختہ" بھی کہا جاتا تھا،

انیسویں صدی کے وسط تک اردو زبان ہندی کے نام سے معروف تھی، اور دوسری ہندوستانی زبانوں کو بھاشا یا بھاکا کہا جاتا تھا۔ اس عہد میں فارسی رسم الخط کا اتنا زیادہ اثر تھا، کہ کھڑی بولی، برج بھاشا۔ اودھی اور بھوجپوری لٹریچر فارسی رسم الخط میں بھی لکھا جاتا تھا، لیکن دیوناگری میں نہیں۔ دیوناگری رسم الخط تو درحقیقت انیسویں صدی کے

وسط میں فارسی رسم الخط کے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔ اور اسی وقت سے موجودہ سنسکرت آمیز ہندی کی لہر کا آغاز ہوا۔

جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کے اتحاد و سالمیت کی خاطر ہندوستانی کو ملک کی قومی زبان بنائے جانے کی پرزور وکالت کی تھی، لیکن بوجوہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

اردو کھڑی بولی ہی کی ایک مکمل شکل ہے، جو کبھی دہلی اور آگرہ کے اطراف میں بولی جاتی تھی، اور مسلمان سپاہیوں کی آمد سے قبل نہ اس علاقہ کی عام بول چال کی زبان تھی، اور ان کی آمد کے ساتھ ہی اس زبان کو حیات نو حاصل ہو گئی۔ ان سپاہیوں کی مادری زبان فارسی تھی۔ اور کھڑی بولی کے ساتھ ان کی زبان کی آمیزش نے اردو یا ہندوستانی کو جنم دیا۔ اس نئی زبان کو دوآبہ گنگ و جمن کے تمام باشندوں نے اپنی بول چال میں استعمال کیا، اردو زبان پنجابی اور برج بھاشا سے مماثلت رکھتی ہے۔ اسی لیے کچھ محققین اردو کا سرچشمہ مذکورہ بالا زبانوں کو قرار دیتے ہیں۔

کسی زمانہ میں ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں اردو نے اس کی جگہ لے لی، اردو زبان کے انمٹ نقوش صوبہ دہلی اور اتر پردیش کے چپے چپے پر ثبت ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ ان نشانات کو کھرچنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ آج بول چال کے عام الفاظ مثلاً انقلاب زندہ باد، آرام حرام ہے، آداب عرض تشریف لائیے، ارشاد فرمائیے، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟، مزاج شریف، جناب، صاحب حضرت حضور یہ سب خالص اور عام استعمال کے اردو الفاظ ہیں۔

اردو کسی خاص فرقہ یا مذہب کی زبان نہیں۔ بلکہ یہ ایک عالمی زبان ہے۔ اس کو

بجا طور پر عالمی زبانوں میں اس حیثیت سے تیسرا مقام حاصل ہے کہ وہ بین الاقوامی طور پر بہت کثرت سے بولی جاتی ہے۔ چینی زبان بولنے والوں کی تعداد ۸۰ کروڑ ہے اور انگریزی بولنے والوں کی تعداد ۳۲ کروڑ ہے۔ اس کے بعد اردو بولنے والوں کی تعداد ۲۲ کروڑ ہے، ایک انگریز کے قول کے مطابق اگر کوئی شخص ہندوستانی یا انگریزی زبان بول سکتا ہے تو وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں اپنا کام نکال سکتا ہے۔

آج کا المیہ یہ ہے کہ ہندوستانی زبان بولنے والے ہندوستانی باشندوں کو سرکاری طور پر ہندی بولنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے، معتبر اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۶۱ء میں ہندوستانی (اردو) بولنے والوں کی تعداد ۱۶ کروڑ تھی۔ لیکن اب ۱۹۷۱ء کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف تین کروڑ افراد کی مادری زبان اردو اور ۱۶ کروڑ ۲۵ لاکھ ۷۷ ہزار ۷ سو بارہ کی ہندی ہے۔ (جس میں سے ۹۰ لاکھ یوپی میں، پچاس لاکھ آندھرا پردیش میں۔ ۳۳ لاکھ بہار میں ۳۲ لاکھ مہاراشٹر میں اور ۳۰ لاکھ میسور میں ہیں)

یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان میں اگرچہ بعض وجوہ سے اردو کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ زبان پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، مثلاً سوویت روس میں اردو کو بہت اہمیت حاصل ہے، تاشقند، سمرقند، بخارا، ماسکو اور لینن گراڈ کے بہت سے سکنڈری اسکولوں میں اردو پڑھائی جا رہی ہے، اسی طرح حکومت امریکہ نے اپنی بہت سی ریاستوں شکاگو، کیلیفورنیا اور پنسلونیا کے کچھ کالجوں میں اردو لازمی مضمون قرار دیا ہے نیویارک کی فورڈن یونیورسٹی کے ایک الحاقی کالج میں داخلہ حاصل کرنے والے طلبہ اردو کو بحیثیت ایک مضمون اختیار کرنے کے پابند ہیں۔ اسی طرح امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی میں اردو کا ایک علیحدہ مستقل شعبہ قائم ہے۔ اور وہاں سے "نئی صدی" کے نام سے ایک

اردو رسالہ بھی شائع کیا جاتا ہے۔ غرض امریکہ کی ۳۳ یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم ہو رہی ہے، ماریشس (افریقہ) کے ۶۵ فیصد عوام کی مادری زبان اردو ہے گیانا، (جنوبی امریکہ) کے ۴۵ فی صد باشندوں کے اظہار خیال کا ذریعہ اردو ہے، اور وہ گیانا یونیورسٹی میں اس وقت پڑھائی بھی جارہی ہے، ہنگری حکومت نے اپنے ملک میں اردو کی تعلیم کے لیے بہت سی سہولتیں فراہم کر رکھی ہیں۔ مشرقی اور مغربی جرمنی کی، یونیورسٹیوں میں اس وقت اردو پڑھائی جارہی ہے۔

جاپان یونیورسٹی نے بھی اپنے یہاں اردو پڑھانے کی آسانیاں بہم پہونچا رکھی ہیں بہت سے ایشیائی ممالک مثلاً تھائی لینڈ، برما، نیپال، سنگاپور، سری لنکا، ملائشیا بنگلہ دیش، پاکستان افغانستان اور ایران وغیرہ میں اردو سمجھی اور بولی جاتی ہے، سعودی عرب میں بھی اس نے اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ چنانچہ وہاں بزم ادب نامی ایک تنظیم اردو کی خدمت کر رہی ہے، دوسرے عرب ممالک میں اردو کا سکہ گزشتہ چالیس سال سے چل رہا ہے، اور اردو میڈیم اسکولوں کی ایک کافی بڑی تعداد پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ جنوبی افریقہ کے دور دراز کے شہروں مثلاً جوہنسبرگ ڈربن، کیپ ٹاؤن، کمپالا دارالسلام وغیرہ میں بھی اردو نے عمل دخل حاصل کر لیا ہے۔ نیپال کے سکنڈری ایجوکیشن بورڈ نے اردو کو اپنے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔ اور ۲۸ فیصد نیپالیوں کی مادری زبان اردو ہے مزید براں امریکہ، برطانیہ روس چین، جاپان، اٹلی، ترکی، مصر، عراق، انڈونیشیا سیلون، برما، افغانستان عدن ایران اور دوسرے کئی ملکوں کے ریڈیو اسٹیشن اردو پروگرام نشر کرتے ہیں، بہت سے ترقی یافتہ ممالک مثلاً اسکاٹ لینڈ، برطانیہ اور امریکہ سے اردو زبان میں رسائل بھی شائع ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا اجمالی جائزہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اردو زبان اپنی شیرینی و لطافت شستگی و سلاست زمانہ کے ترقی پذیر رجحانات اور سائنس اور صنعت و حرفت سے متعلق تمام خیالات و نظریات کو اپنانے کی صلاحیت کے باعث دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں اپنی ہر دلعزیزی کا علم بلند کئے ہوئے ہے، اور اس وقت دنیا کی سنٹو سے بھی زیادہ یونیورسٹیوں اور نجی اداروں میں اردو کی تعلیم ہو رہی ہے۔

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے، اسکی اسی دلآویزی اور اہمیت کی بناء پر اس کا آوازہ شہرت ہندوستان کی چہار دیواری سے گذر کر یورپ، وامریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا ہے مشرقیات کے جن غیر مسلم فضلاء نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور ان کی نگرانی میں دار المصنفین کے نقاد محققین نے انکے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو بالکل مکمل موجود ہیں:- ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۱ء، ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء، ۱۹۵۵ء، ۱۹۷۳ء، ۱۹۶۹ء ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں۔

"منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

آج کا پاکستان

از

جناب ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین

مذکورۂ بالا کتاب میں جناب احمد سعید ملیح آبادی اڈیٹر آزاد ہند کلکتہ نے اپنی صحافت نگاری کے آرٹ قلم کی شگفتگی، مشاہدہ کی قوت، الجھے ہوئے واقعات کو سلجھا کر کسی نتیجہ پر پہنچنے کی غیر معمولی قوت کا پورا جوہر دکھایا ہے، وہ ۱۹۷۴ء میں پاکستان کی اسلامی کانفرنس میں ہندوستانی پریس کے ایک نمایندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے، وہاں کے بیش روز کے قیام میں اسلامی کانفرنس کے حلقوں اور دعوتوں میں شریک ہوئے، پھر پاکستان کے مختلف الخیال رہناؤں اور ہر طبقہ اور مکتب فکر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملاقاتیں کیں، واپسی پر اپنے اخبار میں وہاں کے مشاہدات اور تاثرات کو قسط وار شائع کرنا .... شروع کیا، جو بہت دلچسپی سے پڑھا گیا، اب مزید اضافہ کے ساتھ انھوں نے ان مضامین کو کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے، اس کے تین حصے ہیں، پہلے حصہ میں اس برصغیر کے بہت سے متنازعہ فیہ مسائل پر مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، دوسرے حصے میں انھوں نے پاکستان کے مختلف شہروں میں جو کچھ دیکھا اور پایا، اس کو اپنے تاثرات کے ساتھ قلمبند کیا ہے، تیسرے حصے میں پاکستان کے بعض وزیروں اور رہناؤں

کے انٹرویو ہیں، اس کتاب کو ترتیب دیتے وقت مصنف نے پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی کی "مایہ ناز" تصنیف "ایمرجنس آف پاکستان" قائد اعظم محمد علی جناح کی تقریریں پاکستان کے موجودہ وزیر اعظم کی تصنیف "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" میجر جنرل عتیق الرحمٰن کی کتاب "لیڈرشپ سینیر کمانڈرز" اور پاکستان کی دوسری سرکاری دستاویزات مثلاً نیشنل پلاننگ کمیشن، سنٹرل بورڈ آف ریونیو، پاکستان اکانومک سروے وغیرہ سے استفادہ کر کے اور ان کے جا بجا اقتباسات دے کر اس کو باوزن بنا دیا ہے۔

مصنف کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پاکستان میں ہر لمحہ ہندوستان کے ایک باوقار اور وفادار شہری بنے رہے، اپنے ملک کی عزت و ناموس کو برقرار رکھنے کے لئے اس سے متعلق جو غلط فہیاں تھیں، وہ دور کیں، (ص ۳۱) پاکستان کے وزیروں سے الجھے (ص ۳۱، ۲۱۰، ۲۲۳) خان عبدالغفار خان سے ملے تو جنگ آزادی کے اس سپاہی کی ہندوستان دوستی کو یاد کر کے ان کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، اُن کے ہاتھوں کو اپنے دل کے قریب سینے سے لگایا اور چوما (ص ۲۵۶) وہ اپنے والد بزرگوار مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ہی کی طرح کٹر نیشنلسٹ اور قومی اتحاد کے علم بردار ہیں سوشلزم اسیکولرزم اور جمہوریت ان کا نصب العین ہے، مگر ۲۰۰ صفحے کی اس کتاب میں کہیں پاکستان سے اپنی نفرت اور بیزاری کا اظہار نہیں کیا ہے، وہاں کی بری تصویر کھینچ کر نہ خود خوش ہوئے ہیں، اور نہ ملک کے انتہا پسندوں کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ شروع سے آخر تک معروضی مطالعہ کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے، وہ پاکستانیوں ہی کی طرح لاہور کی اسلامی کانفرنس کے شاندار اجتماع کی کامیابی پر خوش نظر آتے ہیں، اس کی بہتر سے بہتر مرقع آرائی دل کھول کر کی ہے، پاکستانیوں کا کردار ان کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ مہمان اور دوست کو وہ اس طرح سر پر بٹھائیں گے کہ گھر کو لوگ بھول جائیں، اور بگڑ گئے تو پھر سر بازار پگڑی اتار لیں گے، اکثر پاکستانی لیڈروں سے ہمیں ملاقات کا سابقہ پڑتا ہے، اس کا پس منظر یہی ہے (ص ۲۱۲)

یہ ضروری نہیں کہ لائق مصنف نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس کے ناظرین خصوصاً پاکستانی قارئین اتفاق کریں، کیونکہ ان کے اپنے خاص سیاسی خیالات ہیں جن کے ماتحت انھوں نے اس برصغیر کے سیاسی واقعات پر نظر ڈالی ہے، ظاہر ہے کہ ان کو اس آزادی ضمیر کا پورا حق حاصل ہے، قارئین کو بھی ان کی رائے سے اختلاف کرنے کا حق ہے، مگر ان کی کسی بھی رائے سے اختلاف کرتے وقت یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ صحیح نہ ہو لیکن اس میں وزن اور منطقی دلائل ضرور ہیں، جن کا تردید کرنا آسان بھی نہیں، ہر قسم کے مختلف فیہ مسائل پر ان کا قلم خوب چلا ہے، جس میں اُن کی تحریر کی شگفتگی کو بڑا دخل ہے، اسی لئے وہ اپنے قلم کو مختلف سمتوں میں موڑ کر خاطر خواہ اثر پیدا کر لیتے ہیں،

اس برصغیر کے متنازعہ فیہ مسائل پر کسی مسلمان کا کھل کر لکھنا آگ اور شعلے سے کھیلنا ہے، مگر مصنف نے اس آگ میں کود کر اپنی کتاب میں ایک گلزار تیار کرنے اور لہو کے پھول کھلانے کی کوشش کی ہے، وہ پاکستان اس وقت گئے، جب دو سال پہلے مشرق و مغرب دونوں محاذوں پر اس کو جو فوجی شکست ہوئی، تو بقول اُن کے میدانِ جنگ میں شکست کھا کر اور زخموں سے چور نڈھال اور نزار اور اکیلا، بیمار، اور بیزار اپنے آدھے لہولہان جسم کو سنبھالے ہوئے اپنی سانسیں گن رہا تھا، (ص ۳۷) مگر وہاں سے آنے کے بعد لکھا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شکست کھانے، اور ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جانے کے باوجود پاکستان ایک عسکری طاقت کی حیثیت سے آج بھی موجود ہے، ۱۹۷۱ء کی جنگ میں پاکستان کا جو کچھ فوجی اعتبار سے نقصان ہوا تھا، اس کی نہ صرف تلافی کی جاچکی ہے، بلکہ فوجی اعتبار سے آج کا پاکستان تین سال پہلے کے مقابلے میں زیادہ طاقتور اور توانا ہے، اس لئے پاکستان کو نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے، اور نہ اسے دشمن بنا کر رکھنا ہندوستان کے قومی مفاد میں ہے، (ص ۱۴)

مصنف نے پاکستان میں بڑھتی ہوئی گرانی چور بازاری اور ضروری اشیاء کی قیمت میں بے تحاشا اضافہ اور وہاں کے لوگوں کی روزمرہ زندگی کی پریشانیوں کی پوری تفصیل لکھی ہے، (ص ۱۱۶) مگر وہاں کی صنعت کاری، کوئلہ گیس تیل، لوہا، سوتی کپڑے چینی، سیمنٹ اور غذائی پیداوار وغیرہ کا ناقدانہ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لے کر وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ وہاں سب کچھ ہے جو ایک ملک کی ترقی اور استحکام کے لئے قدرت اسے عطا کرسکتی ہے"

(ص ۱۶۲)

مصنف کو پاکستان میں جو خامیاں نظر آئی ہیں، اُن کی طرف توجہ بڑی بے باکی سے دلائی ہے مثلاً حزب اختلاف کے خلاف پاکستان کی پولیس کا رویہ (ص ۱۰۹) وہاں کے عدالتی نظام کی خرابی (ص ۱۱۳) وہاں کے پریس کی آزادی کی محرومی (ص ۱۱۰) مہاجروں کے ساتھ امتیازی سلوک (ص ۱۲۴) پر ان کا قلم بہت رواں ہوا ہے، مگر وہاں کی خوبیاں بیان کرنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا ہے پاکستان کی مالی تجارتی اور صنعتی ترقی، کا ذکر فراخدلی سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں، پاکستان کی معیشت از سر نو اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی ہے، پیداوار نہ صرف بحال ہوگئی ہے بلکہ اس میں پیداوار افزا اضافہ ہو رہا ہے، قومی دولت کی پیداوار میں چھ فی صدی اضافہ ہوا ہے،

زر مبادلہ کی پوزیشن تو کافی اچھی ہوگئی ہے، برآمدات میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے، جنگ کے دو سال بعد پاکستان کو دیکھنے سے یہ احساس نہیں ہوتا، کہ معاشی طور پر تباہ حال ملک نے دو سال کے قلیل عرصہ میں وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے اپنے ملک کی معیشت کو دلدل سے نکال لیا ہے، آج پاکستان شاہراہ ترقی پر گامزن ہے، پورے ملک میں ایک جوش کی سی حالت ہے، کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے جو نقصان پہنچا ہے، اُسے کم سے کم وقت

میں پورا کرنا پڑا جہاں تک برآمدات کا تعلق ہے تو متحدہ پاکستان کی مجموعی برآمدات سے بھی زیادہ آدھے بچے ہوئے پاکستان کی برآمدات ہو رہی ہیں، ۷۰-۱۹۶۹ء میں متحدہ پاکستان کی مجموعی برآمدات ۷۵۹ ملین ڈالر تھیں، ۷۳-۱۹۷۲ء کے لئے نشانہ ۱۱۰۰ ملین ڈالر رکھا گیا ہے، (ص ۱۴۲)

ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ پاکستان کے اردو صحافیوں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے حکومت .... کافی سرگرم نظر آتی ہے، پاکستان کے اردو صحافیوں کو ہندوستان کے بڑے انگریزی اخباروں کے جرنلسٹوں کے برابر یا اس سے بھی سوا تنخواہیں اور سہولتیں دی جاتی ہیں، پاکستان کا اردو پریس اپنی اشاعت اور سرمایے کی وسعت میں انگریزی پریس سے بہت آگے نکل گیا ہے، (ص ۱۱۲)

حزب مخالف کے ساتھ حکومت پاکستان کا جو سلوک ہے اس پر بھی ان کی نظر گئی ہے مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ پشاور سے درۂ خیبر اور افغانستان کی سرحد تک میں نے سفر کیا کسی جگہ بھی آزاد پختونستان کے آثار نظر نہیں آئے، نہ کوئی شورش، نہ ہنگامہ، نہ آزاد قبائل کی جنگ، داخلی سیاسی بےچینی اور بات ہے؛ جو اپنے جمہوری حقوق کی پامالی کے خلاف پٹھانوں میں پائی جاتی ہے، مگر علاحدگی پسندی اور پاکستان سے پختونستان کو کاٹ لینے کی کوئی علامت پورے سفر میں مجھے دکھائی نہیں دی۔ (ص ۱۱۹)

پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو پر ہندوستان میں بیٹھ کر کسی مسلمان کا کچھ لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے سے کچھ کم نہیں مگر زیر نظر کتاب کے مصنف نے اُن کی پہلو دار شخصیت کی ایک ایسی تصویر کھینچ دی ہے، جو ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں کے ناظرین کی نظروں سے گزرے گی تو دونوں جگہ پر تو ضرور رہوں گے، مگر وہ اس کی تردید کرنا چاہیں گے تو یہ کرتے بن بھی نہ پڑے گی' مصنف کا خیال ہے کہ آج کے پاکستان کو سمجھنے کے لئے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو سمجھنا ضروری ہے' (ص ۴۹)

مگر ان کا سمجھنا آسان نہیں، مصنف نے بڑی جرأت سے اُن کی کمزوریاں اور خوبیاں دونوں دکھائی ہیں، اور وہ خود اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ کوئی گنٹھل قسم کے گھاگ سیاست داں نہیں ہیں؛ ۱۹۵۸ء کے بعد والی دہائی کے بعض پاکستانی وزرائے اعظم کی طرح مٹی کے مادھو ہیں، .... اُن کی کتنی پالیسیاں متضاد نظر آتی ہیں، مسٹر بھٹو اسے اپنا وصف قرار دیتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ پورا برصغیر تضاد سے بھرا ہے، اس لئے میرا متضاد نظر آنا باعث تعجب کیوں ہو، بات یہ ہے کہ وقت اور حالات کے مطابق پلٹا کھا جانے کی سیاست کے ماہر ہیں، اور اس چیز کو وہ اصول سیاست کی بنیاد سمجھتے ہیں، (ص ۸۳)

بعض سیاسی واقعات بہت ہی المناک اور ہولناک اور انتہائی مضرت رساں ہوتے ہیں، مگر وہ تاریخ کے فیصلے ہوتے ہیں، جن کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، پاکستان اور بنگلہ دیش دونوں ہی تاریخ کے فیصلے ہیں، زیرِ نظر کتاب میں حسب ذیل سطریں کسی صحافی کے بجائے ایک ایسے مورخ کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، جو اپنے جذبات اور خیالات سے عاری ہو کر اس برصغیر کے اہم سیاسی واقعات کو تاریخ کا محض فیصلہ سمجھ کر تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہے،

"تقسیم کا ذمہ دار کسی فرد واحد کو قرار دینا صحیح نہیں ہو سکتا، اکیلا ایک آدمی ایک پوری قوم کو چیر پھاڑ کر اُس کے ٹکڑے نہیں کر سکتا جب تک ساتھ میں دوسرے بہت سے عوامل اور ظاہر و مخفی عناصر مصروف کار نہ ہوں، جس طرح مسٹر محمد علی جناح کو تنہا تقسیم ہند کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا، اور اس کے لئے ماقبل تقسیم کے جملہ محرکات کو پیش نظر رکھنا ہوگا، اسی طرح مسٹر بھٹو یا شیخ مجیب الرحمٰن کو انفرادی طور پر ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا، ہاں تقسیم کے عمل میں ان کی ذمہ داریوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے اس لئے کہ اپنے اپنے دائرہ کار میں وہ تحریک کی قیادت کر رہے تھے (ص ۹)

لائق مصنف نے ایک بہت ہی اچھے ہندوستانی کی طرح دو قومی نظریے کی مخالفت

کی ہوا مٹ (۲۷) پاکستان کا ہندوستان پر حملہ کر دینے کی شکایت کی (ص ۱۰) ہندستان کے خلاف نفرت کی مہم کے بھی گلہ مند بھو ہیں، (ص ۱۷) مگر اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ باہمی شکوک شبہات" اور خدشات کے ذہن کو تبدیل کرنے کے لئے پاکستان کی لیڈر شپ اور دانشور طبقہ کو سخت محنت کرنی ہوگی، اور اتنی ہی محنت ہندوستان کو بھی پاکستان کا دل جیتنے کے لئے کرتے رہنا ہے، (ص ۲۲) لائق مصنف سچے دل سے اس کے قائل ہیں کہ برصغیر میں مستحکم اور پائدار امن کے لئے ہندوستان اور پاکستان میں دوستانہ تعلقات ضروری ہیں،.... پاکستان سے دشمنی چلتی رہی تو بار بار تصادم کی نوبت آسکتی ہے، اور بڑی طاقتوں کو برصغیر میں دھاچوکڑی مچانے کا موقع ملتا رہے گا، اس علاقہ میں نہ پائدار امن ہوگا نہ سکون، دونوں ملکوں کی خوشحالی بھی متاثر ہوتی رہے گی، بجٹ کا کافی حصہ دفاعی اخراجات میں صرف ہوتا رہے گا جس میں بچت کرکے دونوں ملکوں کے غریب عوام کو راحت پہنچائی جا سکتی ہے، پاکستان اور ہندوستان کی دوستی ہونا برصغیر کی سب سے بڑی ضرورت ہے، (ص ۱۴)

وہ اپنی کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں :-

"پاکستان سے بغض وکینہ، نفرت اور عداوت میرا موضوع نہیں، خیرسگالی دوستی اور بھائی چارہ میرا سندیسہ ہے، یہی میرے ملک کا بھی پیغام ہے، ہم پاکستان کے عوام کا بُرا نہیں چاہتے، وہ ہمارے بھائی ہیں، ہم ان کو اپنا دوست رکھنا چاہتے ہیں، اور اپنے لئے اسی جذبے کی توقع رکھتے ہیں، اسی نظر سے میں نے پاکستان کو دیکھا، اس کی خامیوں اور لغزشوں پر جہاں انگلی رکھی ہے، وہیں ان پہلوؤں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جن میں پاکستان کی بھلائی اور خوبی کے آثار دکھائی پڑے، اگر یہ کتاب دونوں ملکوں کے درمیان امن و مفاہمت

اور اشتراک و تعاون کے ماحول کو بڑھانے، غلط فہمیوں اور اندیشوں کو گھٹانے اور تعلقات کو بہتر بنانے میں کچھ بھی کام آسکے تو یہی اس تمام جانفشانی کا صلہ ہوگا، جو پاکستان کے طویل اور تھکا دینے والے سفر میں مجھے اٹھانا پڑی تھی، مجھے یقین ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے قارئین بھی یہی تاثر لیں گے، اور سرحد پار ہمارے پاکستانی بھائیوں اور دوستوں تک یہ پیغامِ محبت پہونچے گا تو امید ہے کہ پیار کے دو میٹھے بول وہ بھی بولیں گے۔"

اردو میں شاید پہلی دفعہ اس نیک جذبہ سے ایسی کتاب لکھی گئی ہے، خدا کرے مصنف کا یہ بلند مقصد ہر طرح پورا ہو، پوری کتاب جس احتیاط، اعتدال اور امن پسندی کے نتیجے میں لکھی گئی ہے اس بنا پر مصنف کی توجہ اس طرف دلائی جائے، تو کچھ حرج نہ ہوگا کہ اس میں کہیں کہیں خیالات کے اظہار یا بعض الفاظ کے انتخاب اور کچھ واقعات کو درج کرنے میں اور بھی احتیاط کی ضرورت تھی، مثلاً پولیس کے مظالم کی جو کہانی ص ۸۸ پر قلمبند کی گئی ہے، وہ نہ صرف مصنف کی تحریر کی سنجیدگی اور ثقاہت کے منافی ہے، بلکہ اس خیرسگالی کے لئے مناسب نہیں جس کے لئے مصنف نے اتنی مشقت اور ریاضت سے یہ کتاب لکھی ہے، اسی طرح شیطانی وسوسہ (ص ۲۸) چوپٹ، (ص ۱۴۳) ناعاقبت اندیش (ص ۲۷) کرتوت (ص ۳۷) درگت (ص ۸۳) کمر توڑ شکست (ص ۳۷) بھاڑ کے تنکوں کی طرح بکھر گئی، (ص ۸۸) وغیرہ جیسے الفاظ اور جملے اس کتاب کے لئے موزوں نہیں، مگر ایسے الفاظ اور جملے زیادہ نہیں، کم ہیں،

کتاب کی کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے، اس کی قیمت ۱۵ روپیہ ہے، دفتر آزاد ہند نمبر ۲۲ اے۔ ساگر دت لین، کلکتہ نمبر ۱۲ سے ملے گی۔

مطبوعات جدیدہ

طوطیان ہند مرتبہ ڈاکٹر نظام الدین گوریکر صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ اچھا کتابت و طباعت غنیمت صفحات ۴۴۲ مجلد مع گردپوش۔ قیمت قسم اول ۵ روپے قسم دوم ۔ ملنے کا پتہ : رائیبرز ایمپوریم لمیٹڈ خورشید بلڈنگ، سرفیروز شاہ مہتا روڈ بمبئی

اس میں ہندوستان میں فارسی کے تین نامور شاعروں امیر خسرو، فیضی اور غالب کے حالات و واقعات اور علمی و ادبی کارناموں پر تبصرہ کرنے کے بعد ان کے کلام کا مختصر انتخاب دیا گیا ہے، پہلے غزلوں اور رباعیات کا انتخاب ہے، اور آخر میں ہر ایک کا ایک ایک قصیدہ اور مثنوی شامل ہے، مصنف بمبئی کے ایک کالج میں شعبہ فارسی و اردو کے صدر اور تقریباً تیس سال سے درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہیں، ان سے یہ توقع تھی کہ اصل فارسی مآخذ سے یہ کتاب مرتب کی ہوگی، لیکن انھوں نے ان اساطین شعر و ادب کے حالات اردو اور انگریزی کتابوں کی مدد سے لکھے ہیں، خسرو اور فیضی کے حالات میں زیادہ تر شعر العجم کو پیش نظر رکھا گیا ہے، کیونکہ جا بجا اس کی عبارتیں حوالہ کے بغیر الٹ پھیر کر کے اور معمولی تصرف کے بعد نقل کر دی گئی ہیں، جس سے ان کا حسن جاتا رہا ہے، اور زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس قطع و برید کی وجہ سے مفہوم کچھ کا کچھ ہوگیا ہے، جیسے مولانا شبلی لکھتے ہیں "جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے کہ شہزادہ دانیال ہندی زبان بھاکا) کی شاعری سے واقف تھا، اور خود بھی کہتا تھا، یہ فیضی ہی کی صحبت کا اثر ہوگا، اسی سنہ میں اکبر نے اجتہاد و امامت کے دعوے سے مسجد میں جا کر خطبہ پڑھا، یہ خطبہ فیضی

نے لکھا تھا (ص ۱۳) مصنف لکھتے ہیں: "یہ فیضی کی صحبت کا اثر تھا کہ اکبر نے اجتہاد و امامت
کے دعوے سے مسجد میں خطبہ جمعہ پڑھا جس کو فیضی نے لکھا تھا" (ص ۵۲) پتہ نہیں اجتہاد
و امامت کو سہواً یا قصداً اجتہاد و اقامت سے بدل دیا گیا ہے جو بالکل ہی بے معنی ہے۔ مولانا شبلی
نے فیضی کی تصنیف موارد الکلم کے متعلق لکھا ہے کہ "کلکتہ میں چھپ گئی ہے فیضی کے ایک
رقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۸۵ھ کی تصنیف ہے۔" (ص ۴۲ و ۶۵ جلد ۳) اس میں مصنف
کے تصرف نے سنہ تصنیف کو سنہ طباعت بنا دیا، وہ لکھتے ہیں: "یہ کتاب ۹۸۵ھ
مطابق ۱۵۷۷ء میں کلکتہ میں شائع ہوئی" (ص ۹۵) بعض جگہ حذف و ترمیم سے عبارت
بے ربط اور بے معنی ہو گئی ہے، جیسے شعر العجم میں ہے "شیخ مبارک، ناگور سے گجرات اور
گجرات سے آگرہ میں آئے، جمنا کے کنارے میر رفیع الدین حسینی کے ہمسایہ تھے، قیام اختیار کیا اور
یہیں ایک معزز خاندان میں شادی کی، خدا نے کثرت سے اولاد دی، جن میں سب سے پہلا
فیضی تھا، جو ۹۵۴ھ میں پیدا ہوا فیضی نے ابتدائی اور انتہائی تعلیم باپ سے حاصل کی (ص ۳
ص ۳۲ و ۳۳) مصنف نے خط کشیدہ عبارت حذف کر کے لکھا ہے "شیخ مبارک ناگور سے
گجرات اور گجرات سے آگرہ پہنچے جہاں انھوں نے ایک معزز خاندان میں رشتہ کر لیا، فیضی سب
سے بڑے تھے، جو ۹۵۴ھ مطابق ۱۵۴۷ء میں پیدا ہوئے، فیضی نے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم خصوصاً
اپنے والد ماجد سے حاصل کی" (ص ۵۰) ایک اور جگہ مولانا شبلی نے لکھا ہے "۳۰ سنہ جلوس
میں فیضی کو خمسہ کا خیال پیدا ہوا اور سب سے پہلے مرکز ادوار شروع کی، اس کے ساتھ اور
مثنویوں کی بھی بنیاد ڈالی اور سب کے کچھ کچھ شعر کہے، لیکن چونکہ بہت سے مشغلے پیش آتے رہتے
تھے، کوئی کتاب انجام کو نہ پہنچ سکی ۳۹ سنہ جلوس میں اکبر نے اصرار کے ساتھ کہا کہ خمسہ کو پورا
کرنا چاہیے، اور سب سے پہلے نلدمن انجام پائے، چونکہ ہندوؤں کا قصہ تھا، اکبر کے میلان

طبیعت نے اسکو مقدم رکھا... "(ص ۶۲، ۶۳) مصنف تحریر کرتے ہیں "یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اکبر نے بھی ۱۰۰۲ھ مطابق ۱۵۹۳ء میں اصرار کے ساتھ کہا کہ خمسہ کو پورا ہونا چاہئے، فیضی نے دوسری مثنویوں کی بھی بنیاد ڈالی، اور سب کے کچھ نہ کچھ شعر کہے، لیکن چونکہ بہت سے مشغلے پیش آتے رہتے تھے اس لیے سوائے دو کے اور کوئی مثنوی انجام کو نہ پہنچی" (ص ۱۰۵) اس سے دھوکہ ہوتا ہے کہ اکبر کے اصرار کے بعد ہی فیضی نے مثنویوں کی بنیاد ڈالی تھی، اور اس اثنا میں اور مشغلے پیش آنے کی وجہ سے یہ کام موقوف ہوتا رہا، حالانکہ اکبر کے اصرار سے پہلے ہی وہ خمسہ شروع کر چکا تھا، لیکن مشاغل پیش آنے کی وجہ سے درمیان میں اس کا سلسلہ موقوف کر دینا پڑتا تھا، مگر اکبر کے اصرار کے بعد وہ اس کی تکمیل میں مشغول ہو گیا، یہ الگ بات ہے کہ اسکے باوجود وہ خمسہ کی سب مثنویوں کو مکمل نہیں کر سکا، علاوہ ازیں مولانا شبلی کی خط کشیدہ عبارت حذف کر دینے سے مصنف کی عبارت میں یہ التباس بھی پیدا ہو گیا ہے کہ دوسری مثنویاں خمسہ کے علاوہ تھیں، تحریر اور طرز ادا میں ناہمواری کی وجہ سے بعض عبارتیں بڑی گنجلک ہو گئی ہیں اور کہیں کہیں مصنف کے الفاظ سے انکا مدعا واضح نہیں ہو سکا ہے، جیسے وہ لکھتے ہیں،

"اور اس امر کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ شعراء کے متعلق معلومات اسی حد تک تجسس طلب ہوں جس حد تک وہ انکے علم و فن پر اثر انداز ہوتے ہیں" (ص ۲) "بلکہ دنیائے ادب کے سدا بہار باغ کی قفل کشائی کر کے اہل نظر کو چمنستان فارسی کی سیر پر مائل و آمادہ بھی کر گئے ہیں" (ص ۲) "اسکی (کتبخانہ کی) توسیع و اشاعت میں ہر ممکن حربہ استعمال کرتے تھے، احباب اور دوستوں سے کتابوں کی فراہمی کے سلسلہ میں بڑے ادب اور انکساری سے لکھتے تھے" (ص ۵) "جب فیضی بیمار ہوئے تو عرفی عیادت کو گئے، فیضی اسوقت ایک پلے سے کھیل رہے تھے، عرفی نے معلوم کیا "اسم مخدوم زادہ چیست" فیضی نے جواب میں کہا..." (ص ۵۲) "اور اپنی طرف سے انکسار مناسبت کے ساتھ معذرت کا حق ادا کر دیا" (ص ۹۰) "اجمالاً غالب کلام شعر و ادب کا سدا بہار باغ بھی ہے اور غور و فکر کی پر تکلف ضیافت بھی" (ص ۱۰۵) "نے" "اتی" "اگرچہ" اور "اگر" وغیرہ جن جملوں میں استعمال ہوئے ہیں وہ عموماً صحیح نہیں ہیں، مرآۃ العالم کو مراۃ العلم سواطع الالہام کو سواط الالہام اور موارد الکلم کو موارد الکلام لکھا ہے، ایک جگہ غیظ کا املا غیض تحریر کیا گیا ہے، زبان و بیان کی اس قسم کی غلطیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً نظر ثانی کے بغیر ہی کتاب شائع کر دی گئی ہے، اردو اور فارسی کے استادوں کی جانب سے تحریر و تصنیف میں اسطرح کی بے احتیاطی بالکل ہی مناسب نہیں، " ض "

رجسٹرڈ نمبر ال [illegible]

اگست سنہ ۱۹۷۵ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن عبدالسلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیہ سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

کاتب اقبال احمد

بزم تیموریہ جلد اول

بزم تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء، فضلاء و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل، اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیر ترتیب ہے،

قیمت:۔ چودہ روپئے

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۱۶ ماہ اگست ۱۹۷۵ء مطابق ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۵ھ عدد ۲

مضامین

شذرات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۸۲-۸۴

مقالات

مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی	عبدالسلام قدوائی ندوی	۸۵-
خان آرزو اور نظریۂ توافق لسانین	ریحانہ خاتون صاحبہ ایم اے، ایم فل شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ	۱۱۲-۱۲۸
جامع مسجد برہان پور کے کتبات (تعمیر مسجد کا کتبہ)	جناب مولوی معین الدین صاحب استاد اردو و فارسی سیوا سدن کالج برہانپور	۱۲۹-۱۵۲

ادبیات

قطعات	جناب خسروی صاحب کراچی	۱۵۳-۱۵۴
غزل	جناب فضا ابن فیضی	۱۵۴
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۱۵۵-۱۶۰

شذرات

اب سے پچاسی سال پہلے علامہ شبلی نعمانی رحؒ نے یہ آواز بلند کی تھی کہ ہندوستان میں یک ایسا مثالی دینی مدرسہ ہو جو اپنی جامعیت و عظمت کے لحاظ سے مدرسۂ اعظم کہلانے کا مستحق ہو، اس میں دینی علوم کی تعلیم ایسی ہو کہ یہاں کے فارغ شدہ طلبہ اسلام کے مخالفوں کے اعتراضات کا جواب زمانہ کے مذاق کے مطابق دے سکیں۔

مولانا محمد علی مونگیری رحؒ کی بھی آرزو تھی کہ ایک ایسا مدرسہ قائم کیا جائے جس سے ایسی جماعت پیدا ہو جو اپنی واقفیت و اطلاع، انتظام و تدبیر اور حزم و مصلحت اندیشی میں قرون اولیٰ کے بزرگان دین کی یاد تازہ کر سکے، ان دونوں بزرگوں نے جو خواب دیکھا تھا، اسکی تعبیر اس وقت پوری ہوئی جب ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہوا، جو ایک دینی تعلیمی اور علمی تحریک بھی بن گیا، اس کے ذریعہ سے دینی مدارس کے نصاب میں ایسی اصلاحات کی گئیں کہ رفتہ رفتہ یہ جدید و قدیم گروہ کا ایک سنگم بن گیا، اس درسگاہ میں اطوار و افکار کی جو روشن ضمیری اور رعنائی ملی اس سے مرصع اور مسلح ہو کر کچھ ایسے علماء و فضلاء پیدا ہوئے، جنھوں نے اسلام اور اسلامی علوم کی بڑی قابل قدر خدمت انجام دی۔

ان میں سب سے نمایاں نام استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی رحؒ کا ہے، جو اپنی علمی عظمت و فضیلت کی وجہ سے فخر ملت اسلامیہ بن گئے، ان کے قلم سے چراغ مصطفوی

کی تابناک ضیا جس طرح پھیلی اس سے ندوۃ العلماء کی دعوت و تحریک کو بڑی تقویت پہونچی، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کو اپنی زندگی کا شہ رگ سمجھتے رہے، اس سے وابستہ رہ کر اپنے زمانہ کے لحاظ سے اسکو فروغ دینے میں ہر ممکن کوشش کی، دارالعلوم ندوہ کو ان پر فخر ہے، تو خود ان کو اپنی اس مادر درسگاہ پر ناز رہا۔

ان ہی کے لائق شاگرد مولانا ابوالحسن علی ندوی ہیں، جو اس وقت ندوۃ العلماء کی روح رواں بن کر اس کی دعوت و تحریک کو آگے بڑھانے بلکہ بعض حیثیتوں سے ان سے بہت آگے جاچکے ہیں۔ جب دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہو رہا تھا تو علامہ شبلی نعمانی کی یہ تمنا ہوئی کہ اسکی عمارت وسیع، پرفضا، اور عظیم الشان ہو، مولانا ابوالحسن علی ندوی کے دور نظامت میں اس کے ہر گوشہ میں علامہ شبلی نعمانی کی تمنا پوری ہوتی، دکھائی دیتی ہے، اس کے احاطہ میں داخل ہو کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی درسگاہ میں کھڑے ہیں جو دنیا کی ممتاز درسگاہوں میں شمار کی جاسکتی ہے، ان ہی کی کاوشوں سے یہ درسگاہ ایک علمی مرکز بھی بن گئی ہے، یہاں سے اردو، عربی، انگریزی میں ایسی باوزن، اور مفید کتابیں شایع ہو رہی ہیں، جو اسلام کے ذہنی، فکری، اور تبلیغی لٹریچر کا بہت ہی قیمتی سرمایہ بن رہا ہے،

مولانا ابوالحسن علی ندوی اس وقت اسلامی علوم و فنون کے شاہین بنے ہوئے ہیں، اسی کے ساتھ علم و فن کے شاہیں بچون کو بال و پر دینے کا بھی بڑا ملکہ رکھتے ہیں

ان ہی کی نگرانی میں ۳۱ اکتوبر سے ۲ نومبر ۱۹۷۵ء تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ۸۵ سالہ جشن تعلیمی منایا جارہا ہے، جس میں اندرون ملک کے علاوہ اسلام کے اہل فکر ونظر کو بھی مدعو کیا گیا ہے، یہ معلوم کرکے خوشی ہے۔ کہ سعودی عربیہ، مصر، الجزائر، ٹیونس، لیبیا، اور شام کی حکومتوں نے اس مین شرکت کرنے کے لئے اپنے سرکاری وفد بھیجنے

پورا وعدہ کیا ہے، اس سے اسلامی ممالک میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شہرت اور مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، جس میں بلاشبہ روز افزوں اضافہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ذات گرامی کی وجہ سے ہو رہا ہے، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ضمیر اور سفیر بن کر اس دینی اور تعلیمی ادارہ کے تعلقات کو اسلامی ممالک سے جس طرح استوار کیا ہے، وہ اس کی تاریخ کا بڑا زرین کارنامہ شمار کیا جائے گا۔ اس شاندار اجتماع میں اسلامی ممالک کے نمایندوں کو یہ مطالعہ کرنے کا موقع ملے گا کہ نہ صرف اس ملک بلکہ عالم اسلام کے مذہبی، علمی اور تہذیبی دور میں ندوۃ العلماء کا کیا حصہ رہا ہے، اس سے اسلامی ممالک میں ہمارے وطن کی عظمت بھی بڑھے گی، امید ہے کہ حکومت ہند بھی اس بین الاقوامی اجتماع کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گی، کیونکہ اس سے ہمارے ملک اور اسلامی ممالک کے درمیان خوشگوار ثقافتی علمی اور تعلیمی تعلقات بھی پیدا ہونے کی توقع ہے، جس کی ضرورت اس وقت بہت محسوس کی جا رہی ہے۔

دعا ہے کہ یہ اجتماع ہر لحاظ سے کامیاب ہو، ندوۃ العلماء کی دعوت و تحریک صحیح معنوں میں قدیم و جدید اور عقل و نقل کا قابل قدر امتزاج ہو، دارالمصنفین بھی ندوۃ العلماء کی دعوت و تحریک کی ایک زرین کڑی ہے، اس کی طرف سے اس کے وارثوں اور حامیوں کے لئے اس جشن کے موقع پر یہ پیام ہے،

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیث سوز و سازِ زندگی کہہ دے

مقالات

مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی

(از مولانا عبد السّلام قدوائی ندوی)

(۳)

عموماً اس روایت سے عورتوں کی امارت اور سرداری کا عدم جواز ثابت کیا جاتا ہے لیکن حضرت مولوی صاحب کو اس مسئلہ سے کوئی بحث نہیں تھی، ان کی ادب شناس نگاہ کو اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تنقیص نظر آئی، اور فرمایا دیکھو تو راوی کس طرح ام المومنین صدیقۂ طاہرہ پر طنز کر رہا ہے کوئی اور ہوتا تو بخاری کی جلالت شان سے مرعوب ہو جاتا مگر وہ جانتے تھے کہ معصوم صرف انبیاء علیہم السّلام ہوتے ہیں ان کے علاوہ کوئی کتنا ہی بڑا شخص ہو معصوم عن الخطا نہیں ہے اس سے غلطی ہو سکتی ہے، ان کی نظر میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عزت و حرمت راوی سے کہیں زیادہ تھی، اسماء الرجال کی کتابیں پاس ہی رکھی ہوئی تھیں، میزان الاعتدال اور تہذیب اٹھا کر دیں، اور فرمایا راویوں کی سرگزشت پڑھو کتاب کھولتے ہیں تو عثمان بن ہیثم کے متعلق ملتا ہے ٹھیک تھا لیکن غلطی بہت کرتا ہے آخر میں اسکا یہ حال تھا کہ جو تلقین کر دی جاتی اسے قبول کر لیتا تھا دوسرا راوی عوف ہے اس کے متعلق بھی پڑھ کر دکھایا، قدری اور شیعی تھا شیعیت کا اظہار کرتا تھا، داود بن ہند اسے مارتے تھے، اور کہتے تھے، قدری! تیری ہلاکت ہو ایک اور امام جرح و تعدیل بندار کا بیان ہے، "کان قدریا.. رافضیا شیطانا" انھوں نے قدریت (اعتزال) اور رفض کے الزام کے علاوہ اسے شیطان بھی قرار دیا ائمہ جرح

وتعدیل نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ حضرت حسن بصریؒ سے ایسی باتوں کی روایت کرتا تھا، جو اور کوئی نہیں بیان کرتا تھا۔

اسماء الرجال کی کتابوں میں راویوں کا اعمال نامہ پڑھا جا چکا تو فرمایا کہ اس جرح مبین (واضح اعتراض) کے بعد کسی کے محض ثقہ اور صدوق کہنے سے راوی کی صفائی نہیں ہو سکتی ہے، یہ عقیدۃً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مخالف ہے اس لیے اس کی کوئی ایسی روایت قابل قبول نہیں ہو سکتی، جس سے ان کی تنقیص ہوتی ہو، اس خیال کے ثبوت میں اصول حدیث کی کتابوں کی عبارتیں بھی دکھا دیں۔

مولوی صاحب کے فیض صحبت سے ان کے شاگردوں میں بھی اس طرز کی بصیرت پیدا ہو گئی تھی، ایک مرتبہ سنن ابی داؤد کی کتاب الاشربہ کی اس روایت پر نظر پڑی کہ

"تحریم خمر سے پہلے ایک مرتبہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی دعوت کی اور انھیں شراب پلائی اس کے بعد حضرت علیؓ نے نماز پڑھائی اور نشہ کی وجہ سے قل یا ایہا الکافرون میں کچھ کا کچھ پڑھ گئے۔ اس کے بعد لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ کی آیت نازل ہوئی"

اس روایت کو پڑھ کر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے دل میں فوراً کھٹک پیدا ہوئی، اس وقت وہ مولوی صاحب سے حدیث کی اونچی کتابیں پڑھتے تھے، ابو داؤد کی اس روایت کو پڑھتے ہی انھوں نے کہا ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے، حضرت علیؓ تو شروع ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے، نو برس کی عمر میں وہ اسلام لے آئے تھے، جو شخص بچپن سے آپ کی تربیت میں رہا ہو وہ شراب کے پاس بھی نہیں جا سکتا، بس پھر کیا تھا تحقیق شروع ہو گئی، حاکم نے مستدرک میں اس حدیث کے مختلف سلسلے

نقل کی ہیں، اور جس روایت میں حضرت علیؓ کے بارے میں شراب کا ذکر ہے اس کے مقابلہ میں ان روایتوں کو ترجیح دی ہے جن میں حضرت علیؓ کا ذکر نہیں ہے، لیکن راوی پر جرح نہیں کی ہے، بلکہ وجہ ترجیح یہ بیان کی ہے کہ عطار بن سائب سے ان روایتوں کو سفیان ثوری نے روایت کیا ہے، اور عطار کے شاگردوں میں سفیان زیادہ قوی اور قابل اعتماد ہیں، لیکن اس سے بات کس طرح بن سکتی تھی، سفیان کے ذریعہ سے بعض روایات ایسی بھی ہیں جن میں حضرت علیؓ کے بارہ میں شراب اور نشہ کا ذکر ہے، خود ابوداؤد کی مذکورہ بالا روایت عطار سے سفیان ہی روایت کر رہے ہیں، اصل میں غلطی ابوعبدالرحمن سلمی کی ہے، لیکن بخاری کے راوی اور تابعی کے بارہ میں کون زبان کھولے لیکن مولوی صاحب کی تعلیم تھی کہ حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کرو اور اس راہ میں اشخاص سے مرعوب نہ ہو، حضرت علیؓ السابقون الاولون میں سے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص تربیت یافتہ اور خلیفۂ راشد ہیں، ان کی ذات اس تہمت سے بری ہے، ابوعبدالرحمن مجروح ہوتا ہے تو ہو، حضرت علیؓ کی ذات پاک پر کیوں حرف آئے، بات یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو فتنے برپا ہوئے، اور حضرت علیؓ جن مشکلات سے دوچار ہوئے ان میں بہت سے لوگوں کو صراط مستقیم پر قائم رہنا دشوار ہو گیا، ابوعبدالرحمن سلمی بھی اس فتنہ کا شکار ہو گیا، وہ حضرت علیؓ کا مخالف ہو گیا، اور ان کی ذات کو ہدف ملامت بنانے لگا، اسمار الرجال کی کتابوں میں اسے عثمانی یعنی حضرت عثمانؓ کا طرفدار لکھا گیا ہے مگر دراصل وہ حضرت علیؓ کا شدید مخالف ہو گیا تھا، خود بخاری کی کتاب الجہاد میں ان کے متعلق اس کا ایک بیان موجود ہے جس کے بعد اس کی مخالفت وعناد کے ثبوت کے لئے اور کسی شہادت کی ضرورت نہیں، حاطب بن ابی بلتعہ ایک بدری صحابی ہیں، فتح مکہ سے پہلے انھوں نے قریش کو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ کی اطلاع دے دی تھی، یہ آپ کی مرضی کے خلاف تھا، آپ نے حضرت علیؓ کو دو ایک آدمیوں کے ساتھ بھیجا کہ قاصد سے خط چھین لائیں وہ گئے، ایک عورت ملی، مگر اس نے انکار کیا، جب انھوں نے سختی کی تو اس کے پاس سے خط برآمد ہوگیا، یہ خط جب مدینہ آیا تو آپؐ نے حاطب کو بلا کر پوچھا انھوں نے عذر پیش کیا حضرت عمرؓ کو بہت غصہ آیا اور انھوں نے کہا کہ حضرت اجازت دیجئے تو میں اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپؐ نے فرمایا ہیں یہ اہل بدر میں ہیں، اللہ نے ان کے گناہ معاف کر دئے ہیں اور کہہ دیا ہے کہ اعملوا ما شئتم (جو چاہو کرو)

ابو عبد الرحمٰن اس روایت کو حضرت علیؓ کے ایک معتقد سے بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں جو خون ریزی ہوئی اس کا سبب یہی "جو چاہو کرو" ہے، اس کے الفاظ پڑھئے کتنا سخت طنز کر رہا ہے، علوی کو مخاطب کر کے کہتا ہے

انی لاعلم ما الذی جرّاء صاحبک علی الدماء[1]	میں خوب جانتا ہوں کہ تمھارے صاحب (علیؓ) کو کس چیز نے خون ریزی کی جرأت دلائی ہے۔

پھر پوری روایت، بیان کرنے کے بعد ایک بار پھر اسی بات کا اعادہ کرتا ہے اور کہتا ہے

ھذا الذی جرّاءہ	پس یہی وہ بات ہے جس نے ان کو جرأت دلائی ہے،

اس دل خراش طنز کو نقل کرتے ہوئے امام بخاری سے ضبط نہ ہوسکا اور لکھ دیا

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب اذا اضطر الرجل الی النظر فی شعور اہل الذمہ والمومنات اذا عصین اللہ وتجریدہن،

(تذکارِ عثمانیہ)، ظاہر ہے کہ ایسے مخالف کی روایت حضرت علی کے خلاف قابل قبول نہیں ہو سکتی ہے، مولوی صاحب کے محققانہ درس نے تنقید و تحقیق کا جو ذوق پیدا کر دیا تھا اس کی اور بھی مثالیں نقل کی جا سکتی ہیں، مگر مضمون بہت طویل ہو جائے گا، اس لئے نظر انداز کی جا رہی ہیں،

مولوی صاحب عربی کے ادیب اور لغوی نہیں تھے، لیکن بعض اوقات مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں قرآن و حدیث کے ایسے الفاظ آ جاتے تھے جن کا مفہوم متعین کرنے میں اہل زبان مختلف الخیال ہیں، ایسے مواقع پر علما، معانی و بیان اور ائمہ لغت کی اہم تصانیف کھلتیں، کلام عرب سے استشہاد ہوتا، اور الفاظ کی حقیقت اور مختلف زمانوں میں ان کے استعمال کی تاریخ پر نظر ڈالی جاتی اور بڑی کد و کاوش کے بعد رائے قائم کی جاتی۔

مولوی صاحب کے درس میں حنفی، شافعی، اہل حدیث سبھی نقطۂ نظر کے طالب علم ہوتے تھے، ہر ایک کو بحث کی پوری آزادی ہوتی تھی، مولوی صاحب تاکید کرتے تھے کہ محض میری بات نہ مانو بلکہ دلائل کو سمجھ کر رائے قائم کرو، اس طرز عمل کا اثر یہ تھا کہ ان کے شاگرد کسی بڑے سے بڑے آدمی کی تقلید پر قناعت نہیں کرتے تھے، حنفی مسلک سے تعلق رکھنے والے طلبہ بھی ان کی مجلس درس میں شریک ہو کر تقلیدی طور پر حنفی ہونے کے بجائے تحقیقی طور پر حنفیت اختیار کرتے تھے، وہ ہاں میں ہاں ملانے والوں کے بجائے ان طالب علموں کی زیادہ قدر کرتے تھے جو غور و خوض اور بحث و تحقیق کے عادی تھے، سطحی نظر رکھنے والے ان کی بلندیٔ تحقیق سے گھبراتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ اس سے اکابر کے متعلق بدظنی پیدا ہو جائے گی، لیکن یہ خیال صحیح نہیں تھا، ان کے انتہائی عقیدت مند شاگردوں پر بھی کبھی یہ اثر نہیں ہوا، بزرگوں کی تعظیم، اسلاف کا احترام، محدثین کی عزت اور فقہاء کا ادب ہمیشہ ملحوظ رہا البتہ اکابر پرستی کی طرف کبھی میلان

نہیں ہوا، اور دل میں یہ خیال جم گیا کہ اصاغر ہوں یا اکابر، متاخرین ہوں یا متقدمین عزت سب کی کرنا چاہیے، لیکن تقلید کے بجائے نظر ہمیشہ دلائل پر رہنا چاہیے، مولوی صاحب کہتے تھے کہ تعظیم و تکریم اپنی جگہ پر ہے اور بحث و تحقیق اپنی جگہ پر، دلیل کی راہ میں عقیدت کو حائل نہیں ہونا چاہیے، باپ ہو یا استاد، مرشد ہو یا محسن ان کا احترام سر آنکھوں پر لیکن ان کی باتوں کو سمجھنا، اور ان کے دلائل پر غور کرنا ایک طالب حق کے لئے ضروری ہے،

مدرسین کے تقرر میں بھی وہ اس کا لحاظ رکھتے تھے، ان کے یہاں مدرسین کے لیے علمی استعداد ضروری تھی، اگر انتخاب کے موقع پر کوئی کہتا کہ فلاں بڑا دین دار ہے تو فرماتے دین دار تو سب کو ہونا ہی چاہئے، مگر دینداری کے ساتھ علمی کمال بھی ضروری ہے، اگر اس میں خامی ہے تو مدرسہ میں اس کی جگہ نہیں ہے،

عارضی انقطاع اوپر گزر چکا ہے کہ ناظم ندوۃ العلماء حکیم سید عبدالحیؒ صاحب کی جوہر شناس نگاہ نے مولانا حیدر حسن خان کو پہچانا اور ان کی قدر دانی انھیں یہاں لائی جب تک حکیم صاحب زندہ رہے، انھیں برابر ان کی دلجوئی کا خیال رہا، مولوی صاحب بھی ان سے بہت مانوس تھے، اور وقتاً فوقتاً ان سے ملتے رہتے تھے، ۳ر فروری ۱۹۲۳ء کو اچانک ان کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد ہر ا ا کی طبیعت میں وہ انبساط باقی نہ رہا، مگر پھر بھی ندوہ کی خدمت میں لگے رہے، ۱۹۲۶ء میں حسب معمول تعطیل کے زمانہ میں اپنے وطن ٹونک گئے، وہاں چھٹی کے آخری دنوں میں صاحبزادہ سعید حسن خان بیمار ہوگئے، مولوی صاحب نے رخصت کی درخواست بھیجی ندوہ میں قاعدہ تھا کہ تعطیل کلاں سے متصل چھٹی نہیں دی جاتی تھی، ناظم صاحب کو بیماری کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں ہوا، اور انھوں نے رخصت منظور نہیں کی، نامنظوری کی اطلاع پہونچی تو صاحبزادہ کی حالت نازک تھی، مولوی صاحب کو

یہ بات بہت ناگوار ہوئی، اور انھوں نے استعفا بھیج دیا، سعید میاں کا اس بیماری میں انتقال ہوگیا، مولوی صاحب کو بے حد صدمہ ہوا جوان وسعادت مند بیٹے کی موت زندگی بھر نہیں بھولی جب کبھی ذکر آجاتا تو آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔

تقریباً دو سال وہ ٹونک میں رہے، اس اثناء میں وہاں قرأت کے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، انھیں فن قرأت سے بڑا شغف تھا، تجوید کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی، اور اس فن کی اونچی کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں، وہ بڑے پُر اثر لہجہ میں قرآن مجید پڑھتے تھے، اور ان کی تلاوت میں جو قرآن مجید رہتا تھا اس میں حفص کی قرأت کے علاوہ دوسری قراءتیں بھی مختلف روشنائی سے درج تھیں، تاکہ ایک نظر میں ساری قرأتیں سامنے آجائیں وہ چاہتے تھے کہ علماء اس جانب متوجہ ہوں کم علم قاریوں سے مطمئن نہ تھے، تجوید کی جانب ان کی توجہ میں مولانا عین القضاۃ[1] کے مدرسہ فرقانیہ کی وجہ سے اور اضافہ ہوا، وہاں کے

---

[1] مولانا عین القضاۃ بہت بڑے عالم اور صاحب کمال درویش تھے، ان کے والد سید محمد وزیر حیدرآباد میں رہتے تھے، وہیں ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں مولانا عین القضاۃ پیدا ہوئے، سلسلۂ نسب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے واسطہ سے امام حسن تک پہونچتا تھا، ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی، پھر لکھنؤ آکر مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، فراغت کے بعد کچھ عرصہ درس دیتے رہے، پھر تصوف کی طرف میلان ہوا، اور حاجی موسیٰ ترکیسری سے سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ میں بیعت کی جو ایک واسطہ سے شاہ غلام علی کے خلیفہ تھے، کچھ عرصہ تک مرشد کی خدمت میں رہ کر خلافت حاصل کی، پھر لکھنؤ آکر استاد کے دولت کدہ پر درس دینے لگے، اس کے بعد والد صاحب کے ہمراہ حج کے لیے تشریف لے گئے، اور دو سال حرمین شریفین میں قیام کرکے وہاں کے فیوض و برکات سے مستفید ہوئے، وہاں سے واپس آکر لکھنؤ میں تدریس

قاریوں میں وہ قاری عبدالمالک کو بہت پسند کرتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ قاری صاحب ٹونک کے مدرسہ فرقانیہ کی خدمت قبول کرلیں مگر مولانا عین القضاۃ کی زندگی بھر تو قاری عبدالمالک صاحب کہیں اور جانے پر آمادہ نہ ہوئے، لیکن مولانا کی وفات کے بعد مولوی صاحب کے اصرار کی وجہ سے وہ اس پر آمادہ ہوگئے، اور کئی برس تک ٹونک میں رہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۹۱) اور تزکیۂ نفس کے شغل میں مصروف ہوگئے، ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں دوبارہ حج وزیارت سے مشرف ہوئے، واپس آکر ان کے والد نے قرآن مجید کی تعلیم اور حفظ و قرأت کے لیے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، جس نے آگے چل کر مدرسہ فرقانیہ کے نام سے بڑی شہرت حاصل کی ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۳ء) میں والد صاحب کے انتقال کے بعد مدرسہ کی ساری ذمہ داری مولانا عین القضاۃ کے سر پر آگئی، مولانا نے اس کو بہت ترقی دی، ایک عالی شان عمارت تعمیر کرائی، اور چوٹی کے علماء، قراء اور حفاظ کا تقرر کیا، مولانا کے آخری دور میں کبھی کبھی مدرسہ فرقانیہ آنا جانا ہوتا، اس زمانہ میں چھوٹے بڑے ۴۴ مدرس اور ساڑھے سات سو طالب علم تھے، جنھیں مدرسہ سے روزانہ دونوں وقت کھانا، اور دو روپیہ ماہوار جیب خرچ ملتا تھا، کپڑے اور جوتے بھی دیئے جاتے تھے، اس زمانہ میں جب کہ ہر چیز ارزاں تھی، مدرسہ کا خرچ تقریباً ایک لاکھ سالانہ تھا، سال میں دو بار مولانا اعلیٰ پیمانہ پر سارے شہر کی دعوت کرتے تھے، ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ ہر دعوت میں عمدہ قسم کے دو سو دنبے ذبح ہوتے تھے، حضرت مجدد صاحب سے بڑی عقیدت تھی، ان کے عرس کے موقع پر سیکڑوں حفاظ اور قراء سرہند بھیجتے تھے، جو وہاں کافی دنوں قیام کرتے اور تلاوت کرکے مجدد صاحب کی روح کو ایصال ثواب کرتے تھے، ان لوگوں کے قیام و طعام اور سفر کے مصارف پر بے دریغ رقم صرف کرتے تھے،

ان مصارف کے علاوہ روزانہ داد و دہش کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، بہت سے لوگوں کے

ندوہ میں دوبارہ آمد

مولانا کے جانے کے بعد ندوہ میں شیخ الحدیث کی جگہ خالی ہو گئی تقریباً دو سال اس خلا کو پر کرنے کی کوشش ہوتی رہی، لیکن ناظم اور معتمد دارالعلوم کی جد و جہد کے باوجود کوئی شخص ایسا نہ مل سکا جو حدیث شریف کی اس خالی مسند کو پر کر سکتا آخر پھر کر مولانا ہی پر نظریں پڑنے لگیں، سنہ ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۸ء) میں شاید مارچ یا اپریل کا مہینہ تھا، وہ قاری عبد المالک کو لینے لکھنؤ آئے قاری صاحب ٹونک کے مدرسۂ قرأت کے

(بقیہ حاشیہ ص ۹۲) ماہوار وظیفے مقرر تھے، عصر کے بعد حجرہ کے دروازے کھل جاتے اور مغرب تک ملاقات کرنے والوں کے لیے اذن عام ہوتا، اس موقع پر اہل حاجت بھی حاضر ہوتے مولانا حیدر حسن خان مولانا سے بڑا تعلق رکھتے تھے، اکثر ان سے ملنے جاتے بعض حاجت مند ان کے ذریعہ اپنی ضرورت بیان کرتے ایک مرتبہ مولوی صاحب نے ان سے کہا کہ میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوتی ہے، لیکن کیا کروں صاحبان حاجت اس طرح پیچھے پڑتے ہیں کہ سفارش کے لیے مجبور ہو جاتا ہوں، یہ سن کر مولانا عین القضاۃ نے فرمایا، مولوی صاحب میں تو گوشہ نشین ہوں مجھے کیا خبر کہ کون کس حال میں ہے، یہ تو آپ کی مہربانی ہے کہ لوگوں کو میرے پاس پہونچاتے ہیں، اور مجھے ان کی خدمت کا موقع دیتے ہیں، بعض اوقات لوگ جھوٹے حیلے بہانوں سے کام لیتے، مولانا حقیقت سمجھتے تھے، لیکن ذرا سا اشارہ بھی نہیں کرتے تھے، جس سے ظاہر ہو کہ یہ آدمی غلط بیانی سے کام لے رہا ہے، مولوی صاحب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں مولانا کی خدمت میں پہونچا تو فرمایا، مولوی صاحب آپ خوب آ گئے سنیے ان صاحب کی شیر سے کیسی لڑائی ہوئی، ہاں بھائی سناؤ اب اس شخص نے کہنا شروع کیا میں خالی ہاتھ ایک جنگل سے گزر رہا تھا، اچانک ایک شیر نکل آیا اور مجھ پر حملہ کر دیا، مرتا کیا نہ کرتا میں نے بھی کمر ہمت باندھی اور اس سے بھڑ گیا کچھ دیر کی کشمکش کے بعد میں نے اسے مار ڈالا، مگر اس دھر پٹک میں میرے نگلے میں اس کے پنجے گڑ گئے اور میں زخمی ہو گیا، مولوی صاحب کہتے تھے کہ مجھے اس کے جھوٹ پر

تھیں تھے، یہ خبر ملی کہ مولوی صاحب آئے ہیں، بعد عشاء شیخ خلیل صاحب کے یہاں [illegible]
خدمت ہوا، مولوی صاحب بڑی محبت سے ملے اور دیر تک باتیں کرتے رہے، صحبت
گزرنے کے بعد ساری گفتگو تو یاد نہیں رہی البتہ ایک بات [illegible] تقریر
و درس کا تھا، فرمایا تقریر و تدریس میں بڑا فرق ہے، جو اچھا مدرس ہوگا وہ اچھا مقرر نہیں ہوگا
اس طرح اچھا مقرر اور خوش بیان واعظ کامیاب مدرس نہیں ہو سکتا، وہ [illegible]

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۳) پر غصہ آرہا تھا، مگر مولانا معین القضاۃ ایسے دادو دہش [illegible] فرمایا کہ
انھوں نے کیسی بہادری کی مگر بیچارے زخمی ہو گئے ہیں یہ کہہ کر اس شخص کو علاج کے [illegible]
مدرسہ کے مصارف اور داد و دہش پر اندازہ ہے کہ اس سستے زمانہ میں دو تین لاکھ سالانہ
سے کم خرچ نہ ہوتے ہوں گے، آج کے حساب سے یہ رقم پچیس تیس لاکھ کے برابر ہوگی، آخر یہ رقم
کہاں سے آتی تھی یہ بات آج تک واضح نہیں ہو سکی ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا کے کچھ
مالدار معتقد تھے، وہ رقوم مہیا کرتے تھے، لیکن اس کا پتا دینے والا کوئی ثبوت نہیں ملتا، کچھ لوگ
کیمیا اور دست غیب کی باتیں کرتے تھے، مگر مولانا کی زبان سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی بلکہ
بعض لوگوں نے تردید نقل کی ہے، الغرض کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی، البتہ ذی علم،
صاحب بصیرت اور صاحب دل معاصر حکیم سید عبد الحی صاحب کا بیان ہے،

هو فقير لا مال له ولا يأخذ عن	وہ فقیر تھے، ان کے پاس مال نہیں
احد درهما ولا دينارا والله	تھا، نہ وہ کسی سے ایک درہم اور
اعلم من اين يحصل اليه المال	دینار قبول کرتے تھے، خدا معلوم اتنا
الخطير الذي ينفقه ويعطيه	زیادہ مال ان کے پاس کہاں سے
كل يوم صباحا ومساء كل	آتا تھا جو مدرسہ کے لیے اور روزانہ

[illegible] جب کبھی کلام [illegible] ہے اور دوسرے کی غرض [illegible]
[illegible] وقت کی بات سمجھ میں نہیں آتی لیکن جب [illegible]
[illegible] کا تجربہ ہوا تو چونکہ مولوی صاحب نے کئی تجربے کی بات لکھی تھی۔
بعض اوقات [illegible] کے واعظوں اور خطیبوں کو مسند درس پر دیکھا تو ان کی خوش بیانی
اور نکتہ آفرینی [illegible] کے لیے وبال جان نظر آئی۔ اور جب کوئی مدرس مجلس وعظ میں لفظ
یا تو [illegible] بیان میں [illegible] دونوں کا ذکر گیا۔ ایک مرتبہ ایک بڑے مدرس نے
[illegible] کی تفسیر مجمع عام میں بیان کی انھوں نے فرمایا حضور خوش ہوجا
[illegible] کامیابی یقینی ہے جو کچھ نہیں ہو کہ ماضی [illegible] داخل ہے اس علمی نکتہ کو عوام
[illegible] سب منہ پڑھے، اور مدتوں یہ کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے رہے کہ ماضی پر

[illegible] من بغت علیہ من المغرب و	صبح و شام غروب و نجم کے آنے
والنجم اذا هوى ان [illegible]	وہیں کو دیا جاتا تھا، وہ ان کے
[illegible]	صرف کرنے میں با در دان کی
(نزہۃ الخواطر جلد [illegible])	مانند ہیں۔

[illegible] میں علم و کمال، تقوی و طہارت اور جود و عطا کا یہ آفتاب غروب
ہو گیا قلب کی تکلیف کچھ عرصے سے بڑھنے لگی تھی، رجب کی دوسری تاریخ تھی، حسب معمول عصر
کے بعد حجرہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور لوگ دیدار و عرض حال کے لیے جمع تھے، اس موقع پر ایک
عربی دال ایرانی حاضر خدمت ہوا، اور دوران گفتگو زہد و ترک دنیا کے بارہ میں حضرت علی رضی اللہ
عنہ کے کچھ شعر پڑھے [illegible] پر ان کا ایسا اثر ہوا کہ سر سجدہ میں جھک گیا اور روح قفس عنصری سے
پرواز کر گئی، بجلی کی طرح یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی [illegible] رجب [illegible] میں نماز جنازہ ہوئی [illegible]
والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

قدر داخل ہو گیا ہے،

لکھنؤ کی اس آمد نے منتظمین ندوہ کو عرض معروض کا موقع دیا، ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم اس کام پر مامور ہوئے، وہ مولوی صاحب کے مخلص دوست اور ان کے علم قدر داں حکیم سید عبد الحئی صاحب مرحوم کے صاحبزادہ تھے، اس لئے ان کی درخواست رد نہ کر سکے، اور جولائی ۱۹۰۸ء (۱۳۲۶ھ) میں دوبارہ ندوہ تشریف لے آئے۔

ان کی تشریف آوری سے دار العلوم میں پھر رونق آگئی، اور حدیث کے اسباق طلبہ کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ مولوی صاحب کی تقریر میں زیادہ روانی اور خوش بیانی نہ تھی، اپنا مطلب سیدھی سادی زبان میں بیان کرتے تھے، مگر ان کا علم جلد دلوں پر اپنا سکہ جما لیتا تھا۔ درس کے اوقات کے علاوہ بھی طلبہ ان کے یہاں جاتے تھے، اور ان کی نگرانی میں تحقیقی کام کرتے تھے، بعض مسائل پر مولوی صاحب نے خود بھی لکھا تھا، مگر کوئی بڑی کتاب نہیں لکھی تصنیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں تھی، مطالعہ اور تدریس ہی میں جی لگتا تھا، انتظامی کاموں سے دلچسپی نہیں تھی، علمی انہماک کسی اور طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا، لیکن مولانا حفیظ اللہ صاحب کی سبکدوشی کے بعد ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۲ء) میں اہتمام کی ذمہ داریاں بھی ان پر پڑ گئیں تو انھوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ انھیں پورا کرنے کی کوشش کی حسن اتفاق سے دفتری اور انتظامی کاموں کے لئے ان کو بڑے منتظم، خوش سلیقہ اور مستعد معاون مل گئے تھے، شروع میں مولانا محمد عمران خان ندوی نے منصرم کی حیثیت سے انتظامی اور دفتری کاموں کو سنبھالا، ان کے مصر جانے کے بعد مولوی نجم اللہ[1]

---

[1] ندوہ میں حصول تعلیم کے بعد پھر انگریزی پڑھی، اور ایم۔ اے پاس کیا شروع میں کئی برس ندوہ میں منصرم رہے پھر محکمۂ تعلیم میں ملازمت کر لی جون ۱۹۷۵ء میں نیکنامی کے ساتھ سبکدوش ہو گئے ہیں،

احمد صاحب قدوائی اور افتخار حسین صاحب[1] قدوائی نے یہ خدمت انجام دی، اس بنا پر اہتمام کے کاموں میں کبھی کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی، اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات خوش اسلوبی سے حل ہوتے رہے، مولوی صاحب کو اپنے ان معاونوں پر پورا اعتماد تھا، اور یہ لوگ بھی دل وجان سے ان کے خیر خواہ اور وفادار تھے،

ماتحتوں کے ساتھ برتاؤ ماتحتوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک تھا، مدرسین ہوں یا دفتری کارکن اعلیٰ ملازمین ہوں یا ادنیٰ سب سے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے اور اپنے برتاؤ سے یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ کوئی افسر ہیں، ڈانٹنا تو بڑی بات ہے تیز گفتگو بھی شاید ہی کسی نے کبھی سنی ہو، ماتحتوں کی عزت اور آزادی کا لحاظ رکھتے تھے اور دباؤ کے بجائے محبت سے کام لینے کے عادی تھے، آج بھی ان کے زمانہ کے جو اشخاص موجود ہیں وہ ان کے اخلاق کو یاد کرتے ہیں، ان کی شفقت و مہربانی کا اندازہ کرنے کے لیے ایک واقعہ بیان کیا جارہا ہے، ندوہ کے بعض اساتذہ اور کارکنوں نے اخوان الصفا کے نام سے ایک حلقۂ احباب قائم کیا تھا، مولانا محمد ناظم[2]، مولانا محمد عمران خان، مولوی نجم الدین قدوائی، ماسٹر عبدالحق[3]، مولانا ابوالحسن علی وغیرہ آٹھ دس اصحاب اس میں شامل تھے، ہر ہفتہ

(بقیہ حاشیہ ص ۹۶) انتظامی کاموں کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی ذوق ہے کئی کتابیں لکھی ہیں۔

[1] بہت نو عمری سے ندوہ کی خدمت کر رہے ہیں، اس وقت دار العلوم کے منصرم ہیں اور مستعدی، کارکردگی، سلیقہ اور حسن انتظام میں مشہور ہیں، [2] ندوہ میں عربی ادب کے استاد تھے اپنے موضوع سے گہری واقفیت تھی، عربی اہل زبان کی طرح بولتے اور لکھتے تھے، کچھ عرصہ ندوہ کے مہتمم بھی رہے تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے، کئی برس جامعہ عباسیہ بہاولپور کے پرنسپل رہے، ڈیڑھ دو سال کے قریب جامعہ مدینہ منورہ میں استاد بھی رہے، ملازمت کے بعد اب آج کل کراچی میں اہل عیال کے ساتھ مقیم ہیں،

کی کسی [illegible] سے دعوت ہوا کرتی تھی، ایک مرتبہ میں نے اپنی باری میں مولوی صاحب کو [illegible] دے دی، اس دن کسی ضرورت سے انھیں امین آباد جانا پڑا، اور اتفاق سے واپسی میں زیادہ دیر ہوگئی، کوئی طنطنہ والا مہتمم ہوتا تو جب تک وہ آنہ جاتا کسی کو کھانا شروع کرنے کی جسارت نہ ہوتی، مگر مولوی صاحب کی شفقت کی بنا پر جب زیادہ دیر ہوئی تو کھانا شروع کر دیا گیا، کھانے والے بے تکلف کھاتے رہے، اور نکالنے والے جی بھر کر نکالتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ پلاؤ، زردہ اور دوسرے خاص کھانے سب ختم ہوگئے، اور صرف روٹیاں باقی رہ گئیں، اتنے میں مولوی صاحب آگئے، لیکن یہاں کیا رکھا تھا، سب چپ لیکن وہ انداز سے صورت حال سمجھ گئے، اور ناراضگی کے بجائے ہمدردی کرنے لگے، پریشان نہ ہو، کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کمرہ میں میرا کھانا رکھا ہے، تم لوگ فکر نہ کرو، لیکن ہم لوگوں کو بہت شرمندگی تھی، رات زیادہ ہو چکی تھی، مگر حسن اتفاق سے اس زمانہ میں لکھنؤ میں نمائش ہو رہی تھی، وہاں کھانا مل گیا، لیکن جب کھانا لے کر ان کی خدمت میں پہونچے تو فرمایا میاں اس قدر تکلیف کی کیا ضرورت تھی، میں کوئی غیر نہیں ہوں، ایسی سردی میں تم لوگ اتنا کیوں دوڑے، دیکھو تمھارے ہاتھ کیسے برف ہوگئے ہیں، وہ اس طرح باتیں کر رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا غلطی ہم نے نہیں کی بلکہ انھوں نے کی ہے، وہ ماتحتوں کے ساتھ بالکل برابری کا برتاؤ کرتے تھے، بیماری دکھ درد، شادی، غمی میں شریک ہوتے، مفتی محمد[1] یوسف بیان کرتے

(بقیہ حاشیہ ص ۹۷) علمی اور دینی حلقوں میں عزت اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ [3] ندوہ میں انگریزی اور حساب پڑھاتے تھے، بڑے دیندار اور مخلص تھے، جوانی ہی میں انتقال ہوگیا۔

[4] عربی ادب کے استاد تھے، بڑے نیک اور مرنجان ومرنج تھے، اپنی قابلیت اور نیکی کی وجہ سے اساتذہ وطلبہ دونوں میں مقبول ومحترم تھے، صوبہ بہار کے رہنے والے تھے، [illegible]ھ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا، عمر [illegible] برس کے قریب ہوگی۔

تو ایسی تیمار داری کی کہ ان کے حقیقی عزیز بھی ویسی نہ کرتے، مولانا عبدالرحمٰن[2] نگرامی کا انتقال[1] ہوا، تو تقریباً تیس میل کا سفر کر کے جنازہ میں شرکت کی اُس زمانہ میں بسیں نہیں چلتی تھیں، اسٹیشن سے نگرام تک ۸ میل کے قریب پیدل گئے، ندوہ کے اساتذہ میں اکثر ان کے شاگرد تھے، لیکن جو شاگرد نہیں تھے وہ بھی ان کا احترام کرتے تھے، مولوی صاحب بھی سب کا خیال رکھتے، یوں تو سبھی کے ساتھ ان کا برتاؤ اچھا تھا، لیکن عربی کے اساتذہ میں شاہ حلیم[2] عطا مرحوم اور انگریزی کے استادوں میں ماسٹر محمد سمیع[3] صدیقی سے خاص تعلق خاطر تھا، ان کے علم، تجربہ اور صلاحیت کار کی بڑی قدر کرتے تھے، یہ لوگ بھی ان کے خلوص بزرگی اور حسن سلوک کے معترف تھے۔

---

[1] ندوہ کے بڑے ہردلعزیز استاد تھے، ان کی ذات میں ایسی کشش تھی کہ بہت کم دیکھنے میں آئی ہے، تقریر بڑی پرزور موثر اور مدلل ہوتی تھی، قرآن مجید پر بڑا عبور تھا، اسلام کی تعبیر نئے انداز میں بہت خوبی کے ساتھ کرتے تھے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں ان کا بڑا اثر تھا، تعجب ناک دل بہت بڑا تھا، لباس اور معاشرت میں سادگی پسند کرتے تھے، ملازم تک سے مساوات کا برتاؤ کرتے علی محمد جو اب ندوہ کے کتب خانہ میں چپراسی ہیں شروع میں وہ مولانا عبدالرحمٰن کے ملازم تھے، ساری تنخواہ ان کے حوالہ کر دیتے، وہی ان کے گھر خرچ بھیجتے اور ان کی ضروریات طعام ولباس کا انتظام کرتے کبھی حساب نہیں لیا آج تک وہ ان کے سلوک کو یاد کرتے ہیں، ۱۹ اپریل سنہ کو ۴۰ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا، ندوہ سے پہلے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور مولانا آزاد کے مدرسہ اسلامیہ کلکتہ میں مدرس تھے جس کی ادارت میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ظفر الملک علوی کے ساتھ شریک تھے، ان کے شاگردوں میں مولانا امین احسن اصلاحی، شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا ریاست علی ندوی، مولانا نورالحق پشاوری وغیرہ متعدد اصحاب

غریب نوازی | امرار اغنیا اور اصحاب وجاہت سے مولوی صاحب زیادہ تعلق نہیں رکھتے تھے، لیکن غریبوں اور معمولی حیثیت کے لوگوں سے ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ ان کے گرویدہ

(بقیہ حاشیہ ص ۹۹) قابل ذکر ہیں، میں ان کے زمانہ میں ابتدائی درجوں میں تھا، قرآن مجید کے دو پاروں کا ترجمہ اور مجموع الادب ان سے پڑھی ہے، کبھی کبھی ان کی تقریریں سنیں، بعض اوقات انکی باتیں بھی سننے کا موقع ملا ان کی تاثیر آج تک محسوس کرتا ہوں ان غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر مولانا شبلی نعمانی کو ان کی تربیت کی جانب خاص توجہ تھی، اور مولانا سید سلیمان ندوی انھیں اپنی جماعت کا شب چراغ سمجھتے تھے، وفات پر ان کے استادوں اور بزرگوں نے کہا کہ آج ہم لوگ یتیم ہو گئے۔

۲۹ سطون ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے بڑے صاحب علم اور صاحب نظر تھے، قانی العلم کے الفاظ کتابوں میں پڑھتے تھے، شاہ صاحب کو دیکھ کر ان کا مفہوم سمجھ میں آیا، علم ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، مطالعۂ کتب میں ایسا انہماک تھا کہ بایدوشاید حافظہ اس غضب کا تھا کہ جو پڑھ لیتے ازبر ہو جاتا، کتابوں کے سیکڑوں صفحات زبانی یاد تھے، اشعار کا تو شمار نہیں، علوم اسلامیہ کی زندہ انسائیکلوپیڈیا تھے، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے مداح اور ان کی کتابوں کے تقریباً حافظ تھے، شرک و بدعات سے متنفر اور توحید و سنت کے دلدادہ تھے، اکتوبر ۱۹۵۸ء میں وفات پائی۔

۳۰ ماسٹر صاحب جونپور کے رہنے والے ہیں ۱۹۲۵ء میں ندوہ کے شعبۂ علوم جدیدہ سے وابستہ ہوئے، اور زندگی کا بہترین حصہ ندوہ کی خدمت میں صرف کیا، یہاں کی فضا ایسی بھائی کہ دارالعلوم کے متصل زمین خرید کر مکان بنا لیا، انگریزی زبان اور علوم جدیدہ پر اچھی نظر ہے، انگریزی میں سیرت نبوی پر ایک کتاب لکھی ہے، غالب کے اشعار کا ترجمہ بھی کیا ہے، صوم و صلوٰۃ کے بہت پابند ہیں، بڑے خلیق اور ہمدرد ہیں لیکن مزاج کی نرمی کے باوجود خیالات میں مستحکم اور اصول میں پختہ ہیں، علمی اور انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر ممتاز کالج لکھنؤ کے عرصہ تک پرنسپل رہے، اب ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں، لیکن اب بھی علمی اور تدریسی کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

ہو جاتے تھے۔ ایک چائے فروش تھا، جو صبح کو ندوہ میں کشمیری چائے اور بالائی اور شام کو کھیر فروخت کرتا تھا، دودھ مولوی صاحب اس سے لیتے تھے، لکھنؤ میں راجستھان کا سادودھ مشکل سے مل سکتا ہے، لیکن یہ کوشش کرکے خالص دودھ انھیں پہونچاتا تھا، اسکی اس خدمت سے وہ بہت متاثر تھے، اکثر اس طرح ممنونیت کا اظہار کرتے گویا انھیں بلاقیمت مل رہا ہے، اسی طرح ایک صاحب حافظ عبدالقیوم تھے وہ دیہات سے گھی لایا کرتے تھے، مولوی صاحب ان کی بڑی خاطر کرتے تھے، میں نے خود دیکھا ہے کہ مولوی صاحب فرش پر بیٹھے مطالعہ کر رہے ہیں، اتنے میں حافظ صاحب آگئے تو فرمایا آرام کر لو وہ بہترا عذر کرتے مگر مولوی صاحب جب تک ان کو لٹا نہ لیتے چین نہ آتا۔

مساوات پسندی۔ مولوی صاحب امتیاز کو سخت ناپسند کرتے تھے، سفر و حضر ہر جگہ مساوات کا خیال رہتا ایک مرتبہ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی لکھنؤ آئے ان سے ملاقات کے لیے منشی احتشام علی صاحب کی کوٹھی پر گئے، اس وقت ایک کرسی خالی تھی، مگر جب تک اپنے ساتھ کے دو طالب علموں کے لیے بھی کرسیاں منگوا نہیں لیں خود نہیں بیٹھے، ۱۹۳۶ء میں ندوہ کے کام سے ان کے ساتھ مدراس تک جانے کا اتفاق ہوا اس سفر میں میرے علاوہ مولانا ابوالحسن علی اور مولانا عمران خاں صاحب بھی ہمراہ تھے، مولوی صاحب خاصے ضعیف ہو چکے تھے، ہم لوگوں نے بہترا چاہا کہ ان کو اونچے درجہ میں بٹھا دیں مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے، اور تیسرے ہی درجہ میں ہم لوگوں کے ساتھ رہے، کھانے پینے اور رہنے میں بھی کسی قسم کا امتیاز گوارا نہ کیا، ایک مرتبہ ایک تقریب کے سلسلہ میں ہمارے گاؤں[1] گئے، اسٹیشن پر سواریاں کم تھیں، بہتیری کوشش کی گئی کہ وہ سواری پر بیٹھ جائیں مگر

---

[1] تھوفینڈی، ضلع رائے بریلی۔

کسی طرح تیار نہیں ہوئے، فرمایا کیا میں کسی سے کمزور ہوں اور تین میل پیدل رات میں چلے گئے
اُس دن کچھ بارش ہوگئی تھی سڑک کچی تھی، کہیں پاؤں پھسلتا تو فرماتے گرنے سے نہیں ڈرتا
لیکن تاریخ بن جانے کا خیال ہے، گاؤں پہونچے تو لوگوں نے بہت چاہا کہ انھیں ممتاز جگہ پر
بٹھائیں، مگر قالین اور گدے کا کیا ذکر ہے، انھوں نے کبھی کھری چارپائی پر بھی تنہا بیٹھنا
پسند نہ کیا۔

مہمان نوازی فرماتے تھے کہ کبھی اکیلے کھانا نہیں کھایا، مہمانوں کی آمد سے بے حد خوش ہوتے
ان کی بڑی خاطر کرتے، کوئی ان کا شناسا یا شاگرد اگر ان کے دسترخوان پر نہ پہونچتا تو بہت
ناخوش ہوتے، جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ میں میں ایک مرتبہ لکھنؤ گیا دو تین دن مولوی
صاحب کے ساتھ کھانا کھایا اتفاق سے قیام طویل ہوگیا میں ناغہ کرنے لگا وہ کھانے
کے وقت تلاش کراتے ایک دن مل گیا تو فرمایا کہاں غائب رہتے ہو میں نے عرض کیا قیام
زیادہ دن رہے گا آپ کو کہاں تک زحمت دوں فرمایا حضرت ہم پر رحم نہ کیجئے آپ ہمارا
نقصان کرتے ہیں، ہمیں اتنا ہی ملتا ہے جتنا ہمارا خرچ ہوتا ہے، بعض اوقات ایسے
مہمان بھی آجاتے جو کھانا بھی کھاتے اور چلتے وقت کرایہ بھی مانگتے ایک مرتبہ ایسا ہی ایک
واقعہ پیش آیا، وہ صاحب پشاور کے رہنے والے تھے، چلتے وقت کہا میرے پاس خرچ
بالکل نہیں رہ گیا ہے کرایہ کا انتظام کر دیجئے گھر پہونچ کر بھیج دوں گا، مگر پشاور پہونچ کر
منی آرڈر کے بجائے معذرت کا خط آیا، مولوی صاحب اس معذرت پر بہت خوش ہوئے،
مجھے خط دکھایا، اور فرمایا دیکھو کتنا اچھا آدمی ہے، روپیہ نہ بھیج سکا تو اپنی معذوری
کی اطلاع دے دی،

ان کے یہاں جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر بھی آتے رہتے تھے

پروفیسر محمود شیرانی تو ہم وطن تھے، لکھنؤ یونیورسٹی کے لوگ پڑوسی تھے، ان کے علاوہ دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی آیا کرتے تھے، ایک مرتبہ میری موجودگی میں بنارس یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو مولوی مہیش پرشاد آئے تو ان کی بڑی خاطر کی مہیش پرشاد صاحب پر ان کے اخلاق اور حسن سلوک کا بہت اثر ہوا اور کہنے لگے مولانا آپ جیسے بزرگوں کے برتاؤ نے میرے دل میں اسلام سے محبت پیدا کی ہے،

رواداری | مولوی صاحب حنفی تھے، اور اپنے مسلک پر مستحکم تھے، مگر دوسرے مسلک و مذہب کے لوگوں کے ساتھ ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے، علمائے اہل حدیث سے بڑی بشاشت سے ملتے ان کے کاموں کی قدر کرتے نواب صدیق حسن خاں کی علم دوستی کی بڑی تعریف کرتے، اور کہتے کہ انھوں نے حدیث کی نایاب کتابیں چھپوا کر اہل علم کو پہونچائیں مولانا بشیر احمد سہسوانی کی اتباع سنت سے بہت متاثر تھے، ایک مرتبہ مسواک کی تاکید کی حدیثیں پڑھی جارہی تھیں فرمانے لگے مولانا بشیر احمد سہسوانی پان نہیں کھاتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ مسواک کے مقصد کے خلاف ہے، اسی طرح ٹونک کے سید عرفان اور سید مصطفیٰ کی بے حد تعریف کرتے تھے، اور سنت نبوی کے ساتھ ان کی والہانہ شیفتگی کے واقعات بڑے کیف کے ساتھ سناتے تھے، مولانا محمد سورتی کے ساتھ بھی خوشگوار تعلقات تھے خود ان کے شاگردوں میں متعدد اشخاص اہل حدیث تھے، ان سے بڑی محبت سے ملتے اور خاطر مدارات کرتے۔ شیخ تقی الدین ہلالی ندوہ میں کئی سال شیخ الادب رہے، بڑے کٹر سلفی تھے، ان سے بہت اچھے روابط تھے، وہ موجود ہوتے تو اصرار کر کے انھیں کو امام بناتے اسی ان معاملات میں وہ بڑے فراخ دل اور وسیع الظرف تھے، لیکن تعصب اور زبان درازی کو پسند نہیں کرتے تھے، وہ کہتے تھے حنفی، شافعی، اہل حدیث جو مسلک بھی آدمی کو

پسند ہو اختیار کرے لیکن دوسروں کی دل آزاری، ان کے اماموں اور بزرگوں کی توہین اور ان کے مذہب پر طعن و تشنیع جائز نہیں، دلائل و براہین سے اپنے خیالات کی صحت ثابت کرنے کی اجازت ہے، مخالف کی غلطی واضح کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں لیکن ادب و تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے،

شاگردوں کا خیال شاگردوں سے بڑی شفقت و محبت کا برتاؤ کرتے تھے انھیں اپنی اولاد پر ترجیح دیتے تھے، اور ان کی سود و بہود کی ہمیشہ فکر رکھتے تھے کسی شاگرد کی آمد کی خبر سنتے تو ملاقات کے لیے بے چین ہو جاتے۔ بسا اوقات فرط محبت میں اسکے گھر پہونچ جاتے، پھر اسے اپنی قیام گاہ پر لاتے اور جب تک بس چلتا اس کو اپنا مہمان رکھتے۔

بڑے نامور شاگردوں کا ذکر نہیں مجھ جیسے حقیر اور بے مایہ شاگردوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی، خود بیانی معیوب نہ ہوتی تو بہت سے واقعات بیان کئے جا سکتے تھے، مگر مولوی صاحب کی شفقت و محبت اور عنایت و حسن سلوک کا اندازہ کرنے کے لیے چند باتیں لکھی جا رہی ہیں

رمضان کی تعطیل میں گھر جا رہا تھا، جی چاہا کہ زیلعی کی نصب الرایہ ساتھ لیتا جاؤں، فرصت میں کچھ پڑھ ڈالوں گا، اس وقت تک ڈابھیل والا نیا اڈیشن شائع نہیں ہوا تھا، کتاب بہت کمیاب تھی، مولوی صاحب کے پاس بہت پرانا بوسیدہ نسخہ تھا، میں نے ان سے کتاب مانگی فرمانے لگے میاں یہ کتاب مجھے بے حد عزیز ہے مگر تم اس سے بھی زیادہ عزیز ہو لے جاؤ ایک مرتبہ مجھے قرض کی ضرورت ہوئی مولوی صاحب سے کچھ روپیے لئے جب واپس کرنے گیا تو فرمایا میں نے واپسی کے لئے دیئے

نہیں دیے گئے تھے، یہ ملازمت کی ذلت میں نے تمہیں لوگوں کے لیے گوارا کی ہے، جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ میں خاص طور سے وہاں ملنے کے لئے گئے۔ میرے اور رئیس احمد جعفری مرحوم کے صحیح بخاری کے کچھ حصے درس میں باقی رہ گئے تھے، ان کے پورا کرنے کے لیے گرمی کی تعطیل میں ٹونک نہیں گئے اور لکھنؤ میں مئی جون کی تپش میں کتاب پڑھائی، اور پھر اپنی دستخطی سند حدیث عطا فرمائی، جو ہم لوگوں کے لیے سرمایۂ افتخار ہے، اس زمانہ میں ان کے گھٹنے میں شدید درد تھا، ہفتوں بے چین رہے مگر اس تکلیف کے باوجود کئی کئی گھنٹے سبق پڑھاتے، مولوی صاحب حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی طرف سے صاحب اجازت تھے، مگر کم لوگوں کو بیعت کرتے تھے لیکن کمال شفقت کی بنا پر مجھے، رئیس احمد اور عبدالرشید نعمانی کو بیعت سے مشرف فرمایا،

اپریل ۳۶ء میں ندوہ میں ملازم ہوکر آیا تو تنخواہ بہت کم تھی، مولوی صاحب نے پلنگ، دری، لالٹین اور دس روپیے عنایت کئے اور جب تک ضرورت کے مطابق تنخواہ میں اضافہ نہیں ہوگیا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے رہے، تعطیل میں گھر گئے تو وہاں سے منی آرڈر بھیجا تاکہ مجھے کوئی پریشانی نہ ہو، لکھنؤ میں جب تک رہے برابر خیال رکھا، اور جب ٹونک چلے گئے تو وہاں سے بھی میرے حالات دریافت کرتے رہتے، میرے ساتھیوں میں رئیس صاحب کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی، اور مولانا عبدالرشید نعمانی[1] پر

---

[1] جے پور کے رہنے والے تھے، کئی سال سفر حضر میں مولوی صاحب کے ساتھ رہے، ۴۷ء سے پہلے کئی برس ندوۃ المصنفین دہلی سے وابستہ رہے، لغات القرآن کی کئی جلدیں اسی دور کی یادگار ہیں تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے وہاں کچھ عرصہ نیو ٹاؤن کراچی کے دارالعلوم سے متعلق رہے پھر جامعہ عباسیہ بہاول پور میں حدیث کے استاد مقرر ہوئے، متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے

خاص عنایت تھی، مولانا عبد الرشید نعمانی نے حدیث شریف کے ساتھ تصوف وسلوک میں بھی ان سے فیض حاصل کیا تھا، اور اب بھی تدریس وتصنیف کے ذریعہ استاد کا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب کے بعد مولانا محمد زکریا صاحب سے بھی استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

جدید مسائل | مولوی صاحب نے پرانے زمانہ میں تعلیم حاصل کی تھی، لیکن آگے چل کر تجربہ نے زمانہ کے حالات سے واقف کر دیا تھا، جدید تعلیم یافتہ اصحاب سے ملنا جلنا بھی ہوتا تھا اس بنا پر وہ نئے زاویۂ نظر کو کسی قدر سمجھنے لگے تھے، اس وجہ سے بعض ایسے مسائل میں جن کی بحث وتنقیح سے علماء اب تک فارغ نہیں ہوئے ہیں، وہ واضح رائے رکھتے تھے، تار اور ٹیلیفون پر رویت ہلال کی اطلاع کو وہ جائز سمجھتے تھے، ایک مرتبہ لکھنؤ میں مطلع صاف نہ تھا، تو مفتی کفایت اللہ کو تار دے کر دریافت کیا اور اس پر عمل کیا، لاؤڈ اسپیکر پر نماز بالکل جائز سمجھتے تھے، انگریزی تعلیم کی ضرورت کے قائل تھے، بڑھاپے میں اور دوسرے مشاغل کے ساتھ انگریزی پڑھنے کا موقع کہاں تھا، لیکن چیکوں پر دستخط کر لیا کرتے تھے، اور چند ضروری جملے بول بھی لیتے تھے، ایک لڑکا[1] ندوہ میں داخل ہوا تھا اور ان کے کمرے ہی میں رہتا تھا، وہ اردو نہیں سمجھتا تھا، اس سے حسب ضرورت دو چار جملے بول لیتے تھے، انگریزی کی تحصیل کو بہت ضروری سمجھتے تھے، کہتے تھے طالب علمی کے زمانہ میں اندازہ نہیں ہوا، ورنہ میں اسے بھی پڑھ لیتا، عربی مدارس کے طلبہ کو خاص طور سے اس جانب توجہ دلاتے تھے، اس زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات کے ذریعہ انگریزی تعلیم کا آسان راستہ نکل آیا تھا، ان کے کئی شاگردوں نے اس طرح ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا، خود ان کے بڑے لڑکے مولانا سعد حسن نے علوم اسلامیہ کی تحصیل کے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۵) سنن ابن ماجہ کی شرح خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ رنگ ٹرینیڈاڈ (Trinidad) سے آیا تھا۔

تکمیل کے بعد اسی طرح بی۔ اے پاس کیا، لیکن جدید تعلیم کے ساتھ وہ دینی زندگی اور اسلامی شعائر میں ذرا سی غفلت اور کوتاہی کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے، وہ "در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق" کے قائل تھے، اور "جام و سندان باختن" کو مردانگی سمجھتے تھے، ندوہ کے بانیوں نے دین و دنیا کی باہم آمیزی کا جو تخیل پیش کیا تھا وہ اس کی قدر کرتے تھے، لیکن کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے لے بھاگنے کو پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ دونوں پہلوؤں میں کمال حاصل کرنے کے خواستگار تھے، فرمایا کرتے تھے کہ "تھوڑا علم نقصان پہونچاتا ہے۔

ندوہ سے استعفار اب عمر بہتر سے متجاوز ہو چکی تھی، اگرچہ وہ اب بھی ضعف و انحطاط کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اور جوانوں کی جوانی پر طنز کرتے رہتے تھے، کسی محنت طلب کام سے ہم لوگ اعراض کرتے تو کہتے کیسے جوان ہو ہم لوگ عرض کرتے مولوی صاحب جوانی آئی کہاں بچپن کے بعد ہی بڑھاپا آگیا تو مسکراتے اور اپنے شباب کے قصے بیان کرنے لگتے لیکن عمر بہر حال کافی ہو چکی تھی، قویٰ کمزور ہو گئے تھے، اور جوانی کی یاد جوان نہیں کر سکتی تھی، عمر کی اس منزل میں قوت بخش دواؤں سے تقویت پہونچائی جاتی ہے، مگر وہ اس جانب متوجہ نہ تھے، عزیزوں، دوستوں اور مہمانوں پر سیکڑوں روپیے خوشی سی خرچ کر دیتے تھے، لیکن اپنی دوا کے لیے دو چار روپیے کا صرف بھی ناگوار ہوتا تھا، ایک مرتبہ ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم نے ان کی حالت دیکھ کر ایک دوا لکھ دی، مولانا ابوالحسن علی ساتھ تھے، وہ دوا لے کر آئے، پوچھا کتنے کی ملی، یہ سن کر کہ اس کی قیمت چار روپیے ہیں، فرمایا فوراً واپس کر دو میں اپنی جان پر چار روپیے نہیں صرف کر سکتا، بہتیری کوشش کی گئی کہ وہ راضی ہو جائیں مگر وہ کسی طرح اس پر آمادہ نہ ہوئے مجبوراً دوا واپس کر دی گئی، یہی حال

اپنی ذات کے لیے غذا کے اہتمام کا تھا، ضعف بڑھتا رہا، آخر عمر میں کبھی کبھی چکر بھی آجاتا تھا، ان حالات کی بنا پر ان کو گھر کا خیال آنے لگا لڑکے اور عزیز بھی اس پر زور دیتے تھے، ایک طرف یہ صورت حال تھی دوسری طرف لکھنؤ میں ان کے قدر داں بھی دنیا سے اٹھتے جارہے تھے، ندوہ کے ماحول کو بھی اب وہ اپنے حسب حال نہیں پاتے تھے، بعض ارکان کا طرز عمل بھی ان کو پسند نہ تھا، مزاج میں انکسار اور فروتنی بہت تھی، لیکن اس کے ساتھ خودداری اور عزت نفس کا خیال بہت تھا، استخفاف اور اہانت کا ذرا سا شبہ بھی ہوجاتا تو بے حد رنج و تکلیف محسوس کرتے، وہ متکبر کے سامنے انکسار کے قائل نہ تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ متکبر کے مقابلہ میں تکبر ہی تواضع ہے، ایک طرف ان کے احساس کی نزاکت کا یہ حال تھا، دوسری طرف ارکان ندوہ میں جو لوگ ان کے قدر داں اور مرتبہ شناس تھے، ان میں سے اکثر دنیا سے رخصت ہوگئے تھے، یا از کار رفتہ ہوچکے تھے، ایسے شخص کم رہ گئے تھے، جو ان کے علم کی گہرائی، نظر کی وسعت، فکر کی بلندی، اور تحقیق کی ندرت کا پورا اندازہ کرسکتے، ان کا طرز تدریس بے حد مفید تھا، پچاس ساٹھ سال کا تجربہ اس کی تصدیق کررہا تھا، لیکن اس کے افادہ کی پیمائش منٹوں اور صفحوں سے نہیں کی جاسکتی تھی، مولوی صاحب کہتے تھے کہ مدرس اپنے مضمون کو سمجھتا ہے، وہ اپنے طالب علموں کی استعداد بھی جانتا ہے اسے موقع و محل کا اندازہ ہوتا ہے، مباحث اس کی نظر میں ہوتے ہیں، وہ ان کے پیش کرنے کے ڈھنگ سے واقف ہوتا ہے، اور بحث کے پھیلانے اور سمیٹنے کے مواقع سے آگاہ ہوتا ہے، اچھا استاد بے محل وضاحت اور بے جا اختصار سے اجتناب کرتا ہے، وہ محفل وعظ اور مجلس درس کے فرق کو سمجھتا ہے، لیکن یہ باتیں ایسے لوگوں کو کس طرح سمجھائی جائیں، جنھوں نے کبھی اس کوچہ میں قدم نہیں رکھا ہے، وہ اہل علم و کمال کا احترام

کرتے تھے، اور ان کے مشوروں کو سر آنکھوں پر رکھتے تھے، مگر جو لوگ راہ علم کے شہسوار نہیں تھے، اور جنھیں درس و تدریس کا پورا تجربہ نہیں تھا وہ ان کی باتوں کو لائق التفات نہیں سمجھتے تھے، وہ قواعد و ضوابط کا احترام کرتے تھے، نظم و انتظام کے بھی قائل تھے۔ مگر مدرسہ کو ضابطہ گاہ اور قانون گھر نہیں، بلکہ دار العلم سمجھتے تھے، بالکل یہی خیال ایک مرتبہ ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی زبان سے سننے میں آیا، وہ قانون کے بجائے اخلاق سے کام لیتے تھے، اور زبان کو خاموش کرنے کے بجائے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن جو لوگ زجر و توبیخ اور عقوبت و تعزیر ہی کو اصلاح حال کا ذریعہ سمجھتے تھے، وہ ان کی اس مصلحانہ حکمت اور حکیمانہ مصلحت کو مفید نہیں سمجھتے تھے ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان سے کہا آپ کے اندر انتظامی صلاحیت نہیں ہے، اور قانون سے کام لینا نہیں جانتے ہیں، یہ سن کر انھوں نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ میں ایک درسگاہ کا سربراہ ہوں، کسی کوتوالی کا کوتوال نہیں ہوں، میں استادوں اور طالب علموں کی خدمت اور رہنمائی کے لئے آیا ہوں، چوروں اور ڈاکوؤں کا تعاقب کرنے کے لیے نہیں، مولوی صاحب مدرسہ کو مدرسہ سمجھتے تھے، وہ علم کی بالادستی کے قائل تھے، ان کی نظر میں درسگاہ کی روح رواں طلبہ اور اساتذہ ہی ہوتے ہیں، سارا اہتمام و انتظام انھیں کی خدمت کے لیے ہوتا ہے انھوں نے اپنے بزرگوں سے یہی سیکھا تھا۔ لیکن انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ اب رنگ محفل بدلتا جارہا ہے، ارکان بہرحال ارباب بست و کشاد تھے، گو ابھی مولوی صاحب کے سامنے کسی کو کھل کر بالادستی کے اظہار کی ہمت نہ تھی، مگر بعض لوگ کچھ مشورے دینے لگے تھے ان میں کبھی کبھی کسی قدر تنقید کا رنگ بھی آجاتا تھا، انھیں یہ باتیں ناگوار ہوتیں کبھی برداشت کر لیتے اور کبھی جواب دے دیتے آخر کار انھوں نے علحدگی کا فیصلہ کر لیا، اور ۲۰؍ ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ

(۲۰ دسمبر ۱۹۴۰ء) کو ملازمت سے استعفا دے دیا۔

مولوی صاحب نے حالات کا صحیح اندازہ کر لیا تھا، ان کی قدر دانی کی وہ کیفیت نہ تھی جو پہلے تھی، ان کی اہمیت اور ضرورت بھی ویسی محسوس نہ ہوتی تھی، جیسے پہلے محسوس کی جاتی تھی، یہی وجہ تھی کہ نہ ان کو روکنے کی کوئی خاص کوشش ہوئی نہ ان کو پھر بلانے کے لیے جد وجہد کی گئی، مولوی صاحب کو یہ باتیں ہمیشہ یاد رہیں، ٹونک پہونچنے کے بعد مجھے جو خط لکھا اس میں ان تلخیوں کے ذکر کے بعد لکھا کہ خدا کا شکر ہے، کہ میں ناگواریوں سے نجات پاکر وطن اور اعزہ کے خوشگوار ماحول میں آگیا ہوں آخر میں یہ آیت لکھی تھی، جس سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

الحمد للہ الذی اذھب	خدا کا شکر ہے، جس نے ہم سے غم
عنا الحزن ان ربنا لغفور	دور کیا بے شک ہمارا پروردگار
شکور الذی احلنا دار	بخشنے والا قدردان ہے، جس
المقامۃ من فضلہ لا	نے ہم کو اپنے فضل سے مستقل قیام
یمسنا فیہا نصب ولا	گاہ میں ٹھہرایا، یہاں ہم کو نہ تو
یمسنا فیہا لغوب۔	رنج و محن پہونچے گا، اور نہ ہمیں
(سورۂ فاطر رکوع۔۴)	یہاں خستگی اور تکان ہوگی۔

وفات ٹونک پہونچ کر ان کی خلش دور ہوگئی، خدمت گزار لڑکوں، جاں نثار عزیزوں، ہمدرد دوستوں، اور قدرشناس ہم وطنوں کے درمیان ان کو سکون و اطمینان محسوس ہوا لیکن عمر خاصی ہو چکی تھی، ان کی بلند ہمتی اب بھی سپر افگندگی کے لیے آمادہ نہ ہوتی تھی، مگر پیرانہ سالی کے عوارض جو لکھنؤ ہی میں شروع ہو چکے تھے،

برابر بڑھتے رہے، اور طبیعت کسلمند رہنے لگی، علاج معالجہ، دیکھ بھال اور خاطر مدارات کا بہترین انتظام تھا، گھر والے ہمہ وقت خدمت گزاری، اور راحت رسانی کی فکر میں لگے رہتے تھے، لیکن صحت میں جو انحطاط شروع ہو چکا تھا وہ رک نہ سکا، اور آہستہ آہستہ ضعف بڑھتا گیا، بالآخر وقت موعود آپہونچا، کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ۔ لکھنؤ سے جانے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد طبیعت زیادہ خراب ہوئی، اور ۱۵ رجمادی الاخری ۱۳۶۱ھ (۳۱ر مئی ۱۹۴۲ء) کو بندہ اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

جبد خاکی موتی باغ ٹونک میں سپرد خاک کیا گیا، اس وقت ہجری سن کے حساب سے سن اسیؔ کا تھا۔

اولاد اور شاگرد وفات کے وقت بڑے صاحبزادہ مولانا سعد حسن خان اور چھوٹے قاری اسعد حسن خان موجود تھے، یہ لوگ کئی برس تک ٹونک ہی میں رہے، پھر جب ملک تقسیم ہوا تو دیگر عزیزوں کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ اور اپنے متعلقین کے ساتھ وہیں آباد ہو گئے انکے ایک قریبی عزیز مفتی ولی حسن خان بھی پاکستان میں ہیں اور دارالعلوم نیو ٹاؤن کراچی میں تدریس و افتار کی خدمت انجام دے رہے ہیں، فقہ کی کتابوں پر ان کی نظر بڑی گہری ہے، اور بڑے ذی علم اور صاحب بصیرت مفتی سمجھے جاتے ہیں کچھ اعزہ ہندوستان میں بھی ہیں شاگرد مختلف جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن انکی کوئی مفصل فہرست اب تک مرتب نہیں ہو سکی ممکن ہے اس مضمون کی اشاعت کے بعد اسکی کوئی صورت نکل آئے۔

مولوی صاحب کی بڑی آرزو تھی کہ ان کے بعد ان کے شاگرد حدیث کا درس دیتے رہیں تاکہ فیوض و برکات کا یہ سلسلہ جاری رہے اس طرح ان کا روحانی رابطہ بھی قائم رہے گا، اور انکی روح کو ثواب بھی پہونچتا رہے گا،

خانِ آرزو اور نظریۂ توافقِ لسانین

از

ریحانہ خاتون صاحبہ ایم اے، ایم۔فل، شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خانِ آرزو شاید پہلے عالم ہیں جنھوں نے توافقِ لسانین کے نظریہ کو پیش کیا، یہ نظریہ دو طرح کا ہے، ایک فارسی اور کتابی ہندی کے ایک ہونے کا نظریہ، اور دوسرا فارسی اور عربی کے ہم رشتہ زبان ہونے کا تصور، جہاں تک پہلے نظریہ کا تعلق ہے، اس میں بڑی حد تک صداقت ہے، اور مجموعی طور پر انھوں نے جو باتیں بطور کلیات بیان کی ہیں، وہ بالکل صحیح ہیں، یہ نظریہ جو اب عام ہو گیا ہے، سب سے پہلے خانِ آرزو کی بدولت ہی روشناس ہو سکا ہے، لیکن ان کا دوسرا نظریہ یعنی عربی اور فارسی کے مماثل زبان ہونے کا تصور غلط ہے، انھوں نے اس سلسلے میں جو باتیں لکھیں وہ دراصل بڑی غلط فہمی پر مبنی ہیں، عربی اور فارسی ہم رشتہ زبانیں نہیں ہو سکتیں، عربی سریانی خاندان اور فارسی آریائی زبان سے تعلق رکھتی ہے، یہ دو الگ الگ خاندانوں کی زبانیں ہیں، جو تاریخ کے کسی قدیم ترین دور میں بھی ایک نہیں تھیں، وہ فارسی اور عربی کے چند لفظوں کی مماثلت سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ مماثلت کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتی، مگر جن فارسی لفظوں کو انھوں نے عربی لفظوں کے مماثل بتایا ہے، وہ دراصل فارسی لفظ ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ پہلوی زبان کی ایک املائی صورت ہے، جس کو اصطلاح میں ہزوارش کہتے ہیں

ہزوارش کے لغوی معنی گزارش اور شرح کے ہیں لیکن اصطلاحاً اس کے معنی مخصوص ہیں،
پہلوی زبان میں ایسے بہت سے سامی الفاظ ہیں، جو اس کی ایک شاخ آرامی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح
کے الفاظ کی کتابت تو آرامی تلفظ کے اعتبار سے ہوتی ہے لیکن پڑھتے وقت اس کا متبادل پہلوی
لفظ پڑھا جاتا ہے، مثلاً جلتا لکھتے ہیں، اور پوست پڑھتے ہیں، مَلکا لکھتے ہیں، اور شاہ پڑھتے ہیں،
اب لکھتے ہیں، اور پیت پڑھتے ہیں، اخ لکھتے ہیں اور برات پڑھتے ہیں، واضح ہو کہ یہ سامی کلمات
عربی سے مشابہ ہیں، جلتا جلد ہے، ملکاً ملِک ہے، اور اب اور اخ تو دونوں زبانوں میں یکساں ہیں۔
فارسی کے فرہنگ نویس خواہ وہ ایرانی ہوں یا ہندوستانی، قدیم ایران کی تاریخ
اور وہاں کی زبانوں سے کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے تھے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اُن کے اس سلسلے
کے اکثر بیانات غلط ہیں، ہزوارش کے تصور سے وہ لوگ یکسر ناواقف تھے، جہاں تک معلوم
ہے فارسی فرہنگ نویسوں میں صاحبِ فرہنگ جہانگیری اس غلط فہمی کا شکار ہوئے، پروفیسر
نذیر احمد نے اپنے مقالے برہان قاطع میں اس پر مفصل بحث[1] کی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ جمال الدین
حسین انجوے شیرازی کو ایک قدیم کتاب[2] کے اوراق نے گمراہی میں مبتلا کر دیا، جو کسی زردشتی کے پاس
تھی، اُس نے اس کتاب کے تمام لفظوں کو جو درحقیقت ہزوارش تھے، زند و پازند کے لفظ قرار
دے کر اپنی فرہنگ میں شامل کر لیا، انجوے شیرازی کی پیروی میں محمد حسین بن خلف تبریزی
صاحب برہان قاطع نے ان ہزوارش شکلوں کو زند و پازند کے لفظ قرار دیتے ہوئے اپنی
فرہنگ میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے فارسی کے اصیل لفظوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا،
حالانکہ انجوے شیرازی نے اتنی احتیاط برتی تھی، کہ ان الفاظ کو اس نے ایک الگ فصل

---

[1] مجلۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جون، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۔

[2] جلد ۱، ص ۹۶ ذیل لغت آذر

میں درج کیا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ اگرچہ وہ اُن کو ژند و پاژند کے الفاظ سمجھتا تھا، لیکن اُن کی اصل سے ناواقفیت کی بنا پر ان کو فارسی کا اصل لفظ قرار دینے میں تامل تھا ان کی عجیب و غریب شکلیں فارسی الفاظ کے ڈھانچے میں ٹھیک نہیں اترتی تھیں، مگر خلف تبریزی نے بغیر کسی جرح و تعدیل کے ان تمام ہزوارش شکلوں کو فارسی کے اصل لفظ قرار دیا، اور اس طرح فارسی زبان کی روح کو سخت صدمہ پہونچایا۔ پروفیسر نذیر احمد نے چونکہ اس سلسلے کے سارے الفاظ اپنے مضمون میں جمع کر دیئے ہیں، اس لیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

سراج الدین علی خان آرزو بارہویں صدی میں فارسی زبان و ادب کے جید عالم تھے، وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ فارسی اور کتابی ہندی (سنسکرت) کے توافق اور وحدت کا راز معلوم کیا جائے، اس کو وہ توافق لسانین کے نام سے اپنی مشہور مگر غیر مطبوعہ کتاب مثمر میں یاد کرتے ہیں۔ یہ نظریہ بعد میں تمام مشرق و مغرب کے علما کی تحقیق کی بنیاد بنا لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ آرزو کا قدیم ایران کا مطالعہ ناقص تھا یہی، وجہ ہے کہ اوستا اور ژند و پاژند وغیرہ کے بارے میں ان کی تشریح ناقص اور ان کا بیان غلط فہمی پر مبنی ہے، یہاں تک کہ زرتشت جو مجوسیوں کا پیغمبر ہے، اس کے بارے میں ان کے بیانات غلط اور یکطرفہ ہیں، اسی طرح ہزوارش کے بارے میں بھی ان کو کوئی اطلاع نہ تھی، انھوں نے فرہنگ جہانگیری اور برہان قاطع کی پیروی میں ان کو ژند و پاژند کا لفظ قرار دے کر اپنی متذکرۂ بالا کتاب مثمر میں وہی سب باتیں دہرائی ہیں، جو پہلے حسین انجوے شیرازی، اور حسین تبریزی اپنی اپنی فرہنگوں میں بیان کر چکے تھے، غیر مناسب نہ ہوگا۔ اگر پہلے قدیم ایران کے متعلق ان کے وہ بیانات پیش کئے جائیں جو غلط ہیں، اس کے بعد ان کے ان تمام ہزوارش کی فہرست درج کی جائے،

گیومرت ۔ مرکب است از گیو بکاف فارسی قلب بعض گوی و مرت مبدل مرو بمعنی مرد گویا،

ان کا استدلال غلط ہے، گیومرت دو کلمے سے بنا ہے، گیو معنی (زندگی) اور مرتن یعنی مردنی و درگذشتنی یعنی (مرنے اور گذر جانے والا) و مردم۔ پس اس کے معنی ہوئے زندگی مردم یا زندگی جو فانی ہے۔[۱] دراصل گیو یعنی جان و زندگی اور مرتن صفت ہے، یعنی وہ چیز جو مرنے والی اور گذرجانے والی ہو۔ چونکہ آدمی فانی ہے، اس لیے اسے گیومرت کہا گیا ہے

(۳) قیاس می خواہد کہ زرادشت اصل باشد و معنی آن دشمن زراست درین صورت لقب او خواہد بود و ابراہام نامش۔

دراصل کلمہ زرتشت دو جزو پر مشتمل ہے، زرتہ و اشترہ یعنی دارندۂ شتر زرد۔[۲] بعض لوگوں نے آرزو کی طرح زرتشت کو ابراہیم بتایا ہے، اور اس کی کتاب اوستا کو صحفِ ابراہیم قرار دیا ہے، یہ بیان غلط ہے۔ نہ تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور نہ لغت سے اس کی تائید ہوتی ہے، اس لیے ابراہیم اور ابراہام دراصل سُریانی لفظ ہیں اور زرتشت آریائی، آریائی اور سریانی کا یہ جوڑ ناممکن ہے۔

(۴) نظیر این حال کتاب اوستاست کہ ابراہیم زردشت آنرا آورده و چون آن را نہ فہمیدند شرح بر آن نوشت موسوم بزند و چون آنرا ہم نہ فہمیدند شرح آن را نیز نوشت مسمی بہ پازند و عجب از وے چہ او دعوی پیغمبری داشت و پیغمبر بزبان قوم حرف می زند تا بفہمند و از آوردن کتابی کہ قوم آنرا نہ فہمند چہ حاصل[۳]

۱؎ اس سلسلے کی بحث کے لیے دیکھیے برہان قاطع ج ۳ ص ۱۸۰۲ حاشیہ۔ نیز دیکھیے پورداؤد یشتہا ج۔ ۲ ص ۴۲۔

۲؎ اس سلسلے کی مفصل بحث ڈاکٹر معین کی کتاب مزدیسنا و تاثیر آن در ادبیات فارسی ص ۶۲، ۶۳ پر ملتی ہے۔

۳؎ ورق ۱ ص ۸۰

(اس کی مثال کتاب اوستا ہے، جو ابراہیم زردشت کی لائی ہوئی ہے، اور چونکہ قوم نے اس کو نہ سمجھا تو اس نے زند کے نام سے اس کی شرح لکھی، جب لوگوں نے اسے بھی نہ سمجھا تو اس نے پازند نام سے اس کی شرح کی، اس کی یہ بات حیرت انگیز ہے کہ وہ دعوی پیغمبری کرتا تھا، اور پیغمبر اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں تاکہ لوگ اس کی بات سمجھ سکیں، ایسی کتاب لانے سے کیا فائدہ جس کو قوم نہ سمجھ سکے)

یہ قول اغلاط کا مجموعہ ہے، ازرو قدیم ایران کے مسائل سے واقف نہ تھے اس لیے اور دوسرے مصنفین کی طرح وہ ان غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے، اس سلسلے کی تفصیل درج ذیل ہے،

(۱) زردشت کا نام ابراہیم نہیں ہو سکتا، اس سلسلے کی بات اوپر آچکی ہے۔

(۲) اوستا کی شرح کا نام زند نہ تھا، بلکہ زند اوستا کی وہ شرح ہے جو پہلوی زبان میں لکھی گئی۔

(۳) زند کا مصنف زردشت قرار دیا گیا، یہ صحیح نہیں ہے، اوستا کی شرح پہلوی زبان میں دور ساسانی میں لکھی گئی، جو زردشت سے ہزاروں سال بعد کا دور ہے،

(۴) پازند زند کی مخصوص شرح بتائی گئی ہے یہ بھی صحیح نہیں ہے، دراصل زندگی وہ روایت جس میں ہزوارش کے بجائے اصل فارسی لفظ لکھ دئے گئے ہوں، پازند کہلاتی ہے، اور اسلامی دور کی یادگار ہے، زردشت کے زمانے کے ہزار سال بعد وجود میں آئی۔

(۵) اوستا، زند، پازند زردشت کی تصانیف قرار دی گئی ہیں، نہ اوستا زردشت کی تصنیف ہے، و رنہ زند و پازند، دراصل زردشت کے مذہب میں یہ آسمانی کتاب سمجھی گئی ہے، لہٰذا اصولی طور پر اس کو زردشت کی کتاب قرار دینے میں احتیاط برتنی چاہئے۔

زند نہ کوئی تصنیف ہے اور نہ یہ زردشت کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ اس کے سیکڑوں سال بعد وجود میں آئی، یہی حال پازند کا بھی ہے۔

(۶) متذکرۂ بیان سے ظاہر ہے کہ اوستا، زند، پازند ایک ہی زبان ہے، دراصل ایک متن ہے، اور باقی دو شرحیں لیکن واقعہ ایسا ہے کہ اوستا کی زبان زند اور پازند کی زبان سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، تینوں کی زبانوں میں بہت زیادہ تفاوت بھی ہے،

اس تفصیل سے واضح ہے کہ آرزو قدیم ایران کے صحایف اور السنہ کے بارے میں کس طرح کی غلط فہمی کے شکار تھے،

ذیل میں ہزوارش الفاظ کی بحث پیش کی جاتی ہے، اول مثمر سے آرزو کا قول نقل کیا گیا، پھر برہان قاطع کی عبارت نقل ہوگی، آخر میں اس کے ہزوارش کی نشان دہی کی جائےگی

(۱) مترا کہ در زبان پہلوی بمعنی باران است و در عربی مطر بطای وسند دارد۔

برہان قاطع۔ متر بلغت زند و پازند باران را گویند و بہ عربی مطر خوانند (۱۹۲۵)

دراصل اس کے معنی باران نہیں بلکہ یہ باران کا ہزوارش ہے، پہلوی میں متر لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض باران کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ باران محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۲) میا بفتح میم وتحتانی بمعنی آب کہ بعربی ما گویند

اس کے معنی آب نہیں۔ بلکہ یہ آب کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں میا لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض آب کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ آب محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳) نیرا۔ بکسر بمعنی آتش کہ بعربی نار گویند و غریب تر آنکہ نار در زبان ہندی کشمیری کہ مصداق دعوہ خان شیطانہ تیکلم بالہندیۃ باشد آتش را نار گویند و وجہ آن بخاطر رسیدہ

لیکن بسبب وقت چون کم کسی خواہد فہمید نوشتہ ، باآنکہ در الفاظ دیگر مطلقاً اشتراک نیست،

برہان قاطع بلغت زند و پازند آتش را نار گویند و بعربی نار خوانند (۲۲۲۴)

نار اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ نار کا ہزوارش ہے، پہلوی میں نیر لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ نار کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ نار محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۴) لیلیا۔ بمعنی شب کہ در عربی بمعنی لیل خوانند

برہان قاطع بلغت زند و پازند بمعنی شب است کہ عربان لیل را گویند (۱۹۲۲)

شب اس کے معنی نہیں بلکہ یہ شب کا ہزوارش ہے، پہلوی میں۔ لیلیا لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ شب کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ شب محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۵) تینا۔ بفوقانی بوزن مینا گل کہ بعربی طین گویند

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند گل را گویند و بعربی طین خوانند (۵۴۰)

دراصل گل اس کے معنی نہیں بلکہ یہ گل کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں تینا لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض گل کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ گل محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۶) تین ؛ بفوقانی بمعنی انجیر کہ در عربی تین است

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند انجیر را گویند و در عربی نیز ہمین نام دارد (۵۴۰)

واضح ہے کہ عربی اور آرامی میں یہ لفظ مشترک ہے، ہزوارش آرامی سے لیا گیا ہے نہ کہ عربی سے۔ تین کے معنی دراصل انجیر نہیں بلکہ یہ انجیر کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں تین لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض انجیر کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ انجیر محض ہزوارش

کے طور پر آیا ہے۔

(۷) توپا۔ بفوقانی بواو معروف و باء فارسی بمعنی سیب کہ بعربی تفاح است۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پا زند سیب را گویند (۵۲۶) عربی میں سیب کو

تفاح کہتے ہیں۔ گویا توپا اور تفاح کا مادہ مشترک ہے۔

دراصل توپا کے معنی سیب نہیں بلکہ یہ سیب کا ہزوارش ہے، پہلوی میں توپا

لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض سیب کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ سیب محض

ہزوارش کے طور پر آیا ہے،

(۸) توم۔ بفوقانی بوزن بوم بمعنی سیر کہ برادر پیاز است و بعربی توم و ثوم

ثاء مثلثہ ہم خوانند

برہان قاطع۔ توما بلغت زند و پازند سیر برادر پیاز را گویند و بعربی توم و ثوم

خوانند (ص ۵۳۵)

دراصل سیر اس کے معنی نہیں بلکہ یہ سیر کا ہزوارش ہے، پہلوی میں توم لفظ کا کوئی

وجود نہیں، یہ محض سیر کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ سیر محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے

(۹) سنت۔ بسین مہملہ و نون ہر دو متحرک بمعنی سال و سنتان جمع آنست

و بعربی سنہ گویند۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند سال است (یا سالہا) و بعربی سنن خوانند

(۱۳۰) ان ہزوارش الفاظ کی اصل آرامی لفظ شنتہ (Shanata) ہے جو عربی میں

سنہ با سین غیر منقوطہ آیا ہے۔

دراصل سال اس کے معنی نہیں بلکہ یہ سال کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں سنت لفظ

کا کوئی وجود نہیں، یہ محض سال کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ سال محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۱۰) بُنتمن :- بکسر بای موحدہ و نون ساکن و فتح فوقانی و میم مفتوح و نون بمعنی دختر کہ بعربی۔ بنت گویند۔

دراصل دختر اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ دختر کا ہزوارش ہے۔ پہلوی مین لفظ بُنتمن کا کوئی وجود نہیں، یہ محض دختر کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ دختر محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۱۱) بنمن :- ہمان حروف و اعراب بدون فوقانی بمعنی پسر کہ بعربی ابن گویند۔ برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند پسر را گویند (ص ۳۱۰) بظاہر ابن عربی کا ہمرشتہ ہے۔

دراصل پسر اسکے معنی نہیں بلکہ یہ پسر کا ہزوارش ہے، پہلوی مین لفظ بنمن کا کوئی وجود نہیں یہ محض پسر کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ پسر محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۱۲) شمیا :- بفتح سین معجمہ بمعنی آسمان کہ بعربی سماست

دراصل آسمان اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ آسمان کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں لفظ شمیا کا کوئی وجود نہیں، یہ محض آسمان کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ آسمان محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۱۳) دمیا :- بفتح دال وسکون میم و تحتانی بالف کشیدہ بمعنی خون کہ بعربی دم است۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند خون ما گویند و بعربی دم خوانند (۱۰۸۰)
در اصل خون اس کے معنی نہیں بلکہ یہ خون کا ہزوارش ہے۔ لفظ دمیا کا پہلوی میں
کوئی وجود نہیں۔ یہ محض خون کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ خون محض ہزوارش کے طور
آیا ہے۔

(۱۴) دما۔ بکسر اول بمعنی رود خانہ کہ در عربی داما بر وزن فعلا است معنی آب

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند، رود خانہ گویند (۸۰۷)
ڈاکٹر معین کا خیال ہے کہ یہ لفظ ہزوارش شکل نہیں بلکہ دساتیر جو جعلی کتاب ہے
اس سے ماخوذ ہے۔ (فرہنگ دساتیر (۲۴۵)

(۱۵) ملکا۔ بمعنی شاہ کہ بعربی ملک گویند۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند پادشاہ را گویند (۲۰۳۲)
در اصل پادشاہ اس کے معنی نہیں یہ بادشاہ کا ہزوارش ہے۔ لفظ ملکا کا پہلوی میں
کوئی وجود نہیں یہ محض پادشاہ کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ پادشاہ محض ہزوارش
کے طور پر آیا ہے۔

(۱۶) مشمشا۔ بمعنی زرد آلو کہ بعربی مشمش گویند۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند نوعی از زرد آلو باشد (۲۰۱۶)
در اصل زرد آلو اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ ۔ ۔ ۔ ۔ زرد آلو کا ہزوارش ہے، لفظ
مشمشا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ محض زرد آلو کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ
زرد آلو محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۱۷) کلبا۔ کہ بعربی کلب است

برہان قاطع ۔ بلغت زند و پازند بمعنی سگ باشد و بتازی کلب خوانند (۱۷۰۲)

دراصل سگ اس کے معنی نہیں بلکہ یہ سگ کا ہزوارش ہے ۔ لفظ کلبا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں ۔ یہ محض سگ کے لکھنے کی شکل ہے ۔ پہلوی میں لفظ سگ محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے ۔

(۱۸) جَلتا :۔ بفتح بمعنی پوست کہ بعربی جلد است ۔

برہان قاطع بلغت زند و پازند پوست آدمی و حیوانات دیگر باشد و بعربی جلد گویند (۱۸)

دراصل پوست اس کے معنی نہیں بلکہ یہ پوست کا ہزوارش ہے ۔ پہلوی میں جلتا کا کوئی وجود نہیں ، یہ محض پوست کے لکھنے کی شکل ہے ۔ پہلوی میں لفظ پوست محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے ۔

(۱۹) ذکر :۔ بمعنی نر کہ بعربی بعینہ ہمین است و ازیں دریافت می شود کہ سابق درفارسی ذال معجمہ بود حالا مطلق نیست چنانکہ بر محاورہ آن پوشیدہ نیست و این مخالف تحقیق سابق است و ظاہراً آنہم بزاء معجمہ است نہ ذال معجمہ

برہان قاطع ۔ بلغت زند و پازند بمعنی نر باشد کہ در مقابل مادہ است و بعربی نیز ہمین معنی دارد ، واضح ہے کہ یہ اتفاق کی بات نہیں بلکہ بعض سامی زبانوں میں یہ لفظ اس معنی میں آتا ہے ، اور یہ ہزوارش سامی الاصل ہے ۔

دراصل نر اس کے معنی نہیں بلکہ یہ نر کا ہزوارش ہے ۔ پہلوی میں ذکر کا کوئی وجود نہیں یہ محض نر لکھنے کی شکل ہے ۔ پہلوی میں لفظ نر محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے ۔

(۲۰) مزیا :۔ بفتح میم و سکون زاء معجمہ تحتانی بالف کشیدہ بمعنی ترازو کہ بعربی میزان گویند ۔

برہان قاطع ۔ دسہ برہان مرتما است ۔ بلغت زند وپا زند بمعنی ترازو باشد وبعربی میزان گویند (۲۰۰۲)

دراصل ترازو اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ ترازو کا ہزوارش ہے، پہلوی میں مزیا کا کوئی وجود نہیں، یہ محض ترازو لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ ترازو محض ہزوارش کے طور پہ آیا ہے،

(۲۱) اسوریا ۔ بمعنی سوار کہ بعربی اسوار گویند ۔

دراصل سوار اس کے معنی نہیں ۔ بلکہ یہ سوار کا ہزوارش ہے، پہلوی میں اسوریا لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض سوار کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ سوار محض ہزوارش کے طور پہ آیا ہے ۔

(۲۲) بزر ا ۔ بمعنی تخم کہ در عربی نیز بزر گویند ۔

برہان قاطع ۔ بلغت زند وپا زند تخم زراعت را گویند (۲، ۲)

دراصل تخم اس کے معنی نہیں بلکہ یہ تخم کا ہزوارش ہے ۔ پہلوی میں بزر لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض تخم کے لکھنے کی شکل ہے ۔ پہلوی میں لفظ تخم محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے ۔

(۲۳) ورتا ۔ بواو فوقانی بمعنی گل کہ بعربی ورد است وظاہرا ازہمین جہت ورد بمعنی گل را ائمہ عربی فارسی گفتہ اند چنانکہ امام سیوطی در مزہر آوردہ ودر محل خود بیاید

برہان قاطع ۔ بلغت زند وپا زند گل را گویند وبعربی ورد خوانند (۲۲۴۴)

دراصل گل اس کے معنی نہیں بلکہ یہ گل کا ہزوارش ہے، پہلوی میں ورتا لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض گل کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ گل محض ہزوارش کے طور پہ آیا ہے ۔

(۲۴) ارشیا ۔ بمعنی سر یکہ بعربی ... وش گویند ۔

برہان قاطع ۔ بلغت زند و پازند تخت دا ورنگ شہان را گویند (۱۰۵)

دراصل سر یہ اس کے معنی نہیں بلکہ یہ سر یہ کا ہزوارش ہے ۔ لفظ ارشیا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، یہ محض سر یہ کے لکھنے کی شکل ہے ۔ پہلوی میں لفظ سر یہ محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے ۔

(۲۵) کذیا ۔ بکاف تازی و سکون ذال بمعنی دروغ کہ بعربی کذب باشد

برہان قاطع ۔ بلغت زند و پازند بمعنی دروغ باشد و بعربی کذب خوانند (۱۶۰۴)

دراصل دروغ اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ دروغ کا ہزوارش ہے، لفظ کذیا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، بلکہ یہ محض دروغ کے لکھنے کی شکل ہے ۔ پہلوی میں لفظ دروغ محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے ۔

(۲۶) شجاری ۔ بفتح شین معجمہ و جیم تازی بالف کشیدہ و رای مہملہ بیا کشیدہ بمعنی درخت کہ بعربی شجر خوانند

برہان قاطع ۔ در برہان شجارا است ۔ بلغت زند و پازند بمعنی درخت باشد کہ عربان شجر گویند (۱۲۵۴)

صاحب برہان کے خیال میں یہ نہ آیا کہ شجارا کا ریشہ اسی شجر میں ہے ۔

دراصل درخت اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ درخت کا ہزوارش ہے ۔ لفظ شجاری کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، یہ محض درخت کے لکھنے کی شکل ہے ۔ پہلوی میں لفظ درخت محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے ۔

(۲۷) پیلچل ۔ بکسر اول و فتح بار فارسی و جیم فارسی بمعنی ہی کہ میوہ است معروف

وبعربی سفرجل گویند۔

دراصل میوہ اس کے معنی نہیں بلکہ یہ میوہ کا ہزوارش ہے۔ لفظ سلچل کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ محض میوہ کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں میوہ محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے،

(۲۸) شپتینا:۔ بفتح اول وسکون بارفارسی وفوقانی بیاد سیدہ ونون بالف کشیدہ بمعنی لب کہ بعربی شفت گویند۔

دراصل لب اس کے معنی نہیں یہ لب کا ہزوارش ہے۔ لفظ شپتینا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، یہ محض لب کے لکھنے کی شکل ہے۔ لب پہلوی میں محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۲۹) تبنا:۔ بفتح فوقانی وسکون بائے موحدہ ونون بالف کشیدہ بمعنی کاہ کہ درعربی تبن گویند۔

برہان قاطع:۔ بلغت زند پازند کاہی کہ اندر گندم وجو باہم رسد (۴۰۸)

دراصل کاہ اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ کاہ کا ہزوارش ہے۔ لفظ تبنا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں یہ محض کاہ کے لکھنے کی شکل ہے۔ لفظ کاہ پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۰) کالوب کالود بمعنی کالبد کہ بعربی قالب خوانند وبعضے از فضلا گفتہ اند کہ قالب بکسر لام نیز آمدہ لہذا شیخ شیراز قافیہ غالب آوردہ۔

گر یکی زیں چہار شد غالب جان شیرین برآید از قالب

دراصل کالبد اس کے معنی نہیں، یہ کالبد کا ہزوارش ہے۔ لفظ کالود کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، یہ صرف کالبد کے لکھنے کی شکل ہے۔ کالبد پہلوی میں محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۱) زاپا:۔ بزای معجمہ بالف کشیدہ بمعنی تلاکہ متاخران طلا پیا نویسند و در

عربی ذہب۔

در اصل تلا اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ طلا کا ہزوارش ہے۔ لفظ زابا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، یہ صرف تلا کے لکھنے کی شکل ہے۔ تلا پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۲) اموتیا :۔ بواو معروف و فوقانی مکسور و تحتانی بالف کشیدہ کنیز و پرستار کہ زن بود و بعربی امہ خوانند۔

در اصل کنیز و پرستار اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ کنیز و پرستار کا ہزوارش ہے، لفظ اموتیا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ صرف کنیز و پرستار کے لکھنے کی شکل ہے۔ کنیز و پرستار پہلوی مین ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۳) بیا :۔ بہر دو بای موحدہ مفتوح در خانہ کہ بعربی باب گویند۔

برہان قاطع۔ بروزن سبا، در خانہ و در سرا را گویند (۲۳۱)

در اصل یہ پہلوی لفظ در کا ہزوارش ہے۔

(۳۴) مدینا :۔ بمعنی شہر کہ بعربی مدینہ گویند۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند بمعنی شہر است و بعربی مدینہ گویند (۸، ۱۹)

در اصل یہ پہلوی لفظ شہر کا ہزوارش ہے۔

(۳۵) یدمن :۔ بفتح تحتانی و سکون دال و کسر میم و نون بمعنی دست کہ بعربی ید شہر

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند بمعنی دست است کہ بعربی ید خوانند (۲۲۳۸)

در اصل دست اس کے معنی نہیں بلکہ یہ دست کا ہزوارش ہے۔ لفظ یدمن کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ دست کے لکھنے کی شکل ہے۔ دست پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۶) زک :۔ بفتح زاء معجمہ وسکون کاف تازی بمعنی آن ذلک کہ بعربی زلی است ۔

برہان قاطع ۔ بلغت زند و پازند، بمعنی آن باشد کہ کلمۂ اشارہ باشد (۱۰۲۵)

عربی ذاک، ذلک کا ہم ریشہ ہے۔

دراصل آن اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ آں کا ہزوارش ہے، لفظ زک کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ بلکہ یہ آں کے لکھنے کی شکل ہے۔ آں پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۷) سکینا :۔ بوزن مدینا بمعنی کارد کہ بعربی سکّین بود بہ تشدید۔

دراصل کارد اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ پہلوی لفظ کارد کا ہزوارش ہے ۔

(۳۸) بیتا :۔ بکسر خانہ کہ بعربی بیت است ۔

برہان قاطع ۔ بلغت زند و پازند بمعنی خانہ است کہ بعربی بیت خوانند (۳۳۱)

دراصل خانہ اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ خانہ کا ہزوارش ہے۔ لفظ بیتا کا پہلوی مین کوئی وجود نہیں بلکہ یہ خانہ کے لکھنے کی شکل ہے ۔ خانہ پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۹) بیل وبیلا :۔ بکسر چاہ کہ بتازی بیر خوانند

برہان قاطع ۔ بلغت زند و پازند بمعنی چاہ کہ بعربی بیر خوانند (۳۳۹)

دراصل چاہ اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ چاہ کا ہزوارش ہے۔ لفظ بیل وبیلا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ چاہ کے لکھنے کی شکل ہے۔ لفظ چاہ پہلوی میں محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے خوب واضح ہو گیا کہ دراصل ہزوارش شکلوں کی اصل قرأت جو عربی سے ملتی جلتی ہے، تمام تر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقتاً وہ شکلیں حروف تہجی کے اعتبار سے پڑھنے کے لئے لکھی نہیں جاتی تھیں، بلکہ وہ پہلوی الفاظ کی مقررہ علامتوں کے طور پر سمجھی جاتی تھیں، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ان کی اصل قرأت سے فارسی کے لفظ نہیں بنتے بلکہ وہ آرامی کے الفاظ تھے، جو عربی کی طرح سریانی کی ایک شاخ ہے پس ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ فارسی اور عربی میں الفاظ کی گہری مماثلت ہے غلط ہے۔ اور اسی طرح یہ نتیجہ بھی غلط ہوگا۔ کہ فارسی اور عربی میں توافقِ لسانین ہے۔

دار المصنفین کی نئی کتابیں

خریطۂ جواہر

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم ناظم دار المصنفین کی یہ آخری تصنیف ہے، اس میں مرزا مظہر جان جاناں کی بیاض خریطۂ جواہر کے منتخب اشعار کی تشریح و ترجمہ کے ساتھ خود مصنف مرحوم کے اپنے خیالات بھی درج ہیں،

ضخامت :- ۱۲۴ صفحے   قیمت ۴-۷۵

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

اس میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی تفصیلات درج ہیں۔

مرتبہ :- سید صباح الدین عبد الرحمن ، ضخامت :- ۱۷۰ قیمت - ۵ - - -

ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں حصہ دوم

اس میں ظہیر الدین بابر سے لیکر نور الدین جہانگیر سے متعلق دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں ہیں،

مرتبہ۔ سید صباح الدین عبد الرحمن، ضخامت ۳۰۱ صفحے، قیمت ۶ روپے ۲۵ پیسے۔

منیجر

جامع مسجد برہان پور کے کتبات

(بسلسلۂ معارف ماہ اپریل ۲۹ء)

تعمیر مسجد کا کتبہ

از جناب مولوی معین الدین صاحب ندوی استاد اردو فارسی سیوا سدن کالج برہان پور،

جامع مسجد برہان پور میں فارقی دور کا دوسرا کتبہ منبر کے پاس کی وسطی محراب پر ہے، جسکی عبارت حسب ذیل ہے،

(۱) بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۲) وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا ۔ الحمد للہ الموفق للطاعات المعین۔

(۳) بفضلہ علی العبادات ۔ والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الخلق محمد الذی حرض العباد علی العبادۃ وعلی آلہ واصحابہ الذین قاموا۔

(۴) بواجبہا وزیادۃ ۔ وبعد فان اولی ماینفق فیہ شرائف الاموال القربات التی یعود نفعہا فی المآل ۔ ومن اجل ذالک الصدقۃ الجاریۃ فان ثوابہا مدی الازمان ساریۃ ۔ وقد وردت السنۃ ۔ بان یصرفا لیہا

(۵) الاعنۃ ۔ ولان امر بنایۃ المساجد من شعار الدین وقمع

المتمردین۔ لما یترتب من بناءها مزید الثواب۔ وان بانیها ملهم للصواب حیث ورد عنه صلی الله علیه وسلم انه قال من بنی لله مسجداً ولو کمفحص قطاة بنی الله له بیتاً فی الجنة فلذالک۔

(۶) امر مولانا السلطان الاعظم، والخاقان المکرم۔ الفائق بفضله علی سلاطین العرب والعجم۔ عادلشاه بن مبارکشاه الفاروقی خلد ملکه هذا المسجد الذی هو بالوصف جدیر۔ لانه قل ان یوجد له نظیر خالصاً لوجهه۔

(۷) الکریم۔ وطالباً لمرضاته الجسیم تقبل الله ذلک منه بفضله ومزید کرمه وطوله۔ وکان ابتداءه سنة سبع وتسعین وتسعمایة واتمامه سنة ـــ۔ خدم بکتبه اقل عبیده الله اعنی له ولته مصطفی بن نور محمد خطاط عفی الله عنه۔

کتبہ کا ترجمہ:۔ میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا رحم کرنے والا اور بہت مہربان ہے .... اور بیشک مسجدیں اللہ (کی عبادت) کے لیے ہیں، پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو طاعتوں کی توفیق دینے والا اور اپنے فضل وکرم سے عبادتوں میں مدد دینے والا ہے، اور درود وسلام ہو اشرف خلق حضرت محمدؐ پر جنھوں نے (اللہ کے) بندوں کو عبادت کی ترغیب دی، اور آپ کے آل واصحاب پر بھی (درود وسلام) ہو جنھوں نے (فرائض و) واجبات اور نوافل کی پابندی کی۔ حمد وصلوٰۃ کے بعد (معلوم ہو کہ) بیشک جن کاموں میں عمدہ قوتیں خرچ کی جاتی ہیں، ان میں سب سے بہتر وہ نیک کام ہیں جن کا فائدہ عقبیٰ میں بار بار ملتا ہے، اور اسی لیے وہ صدقۂ جاریہ (کہلاتے) ہیں۔

کیونکہ ان کا ثواب زمانوں کی مدّت تک یعنی قیامت تک جاری رہتا ہے، اس (صدقۂ جاریہ) پر توجہ کرنے کے لیے حدیث بھی وارد ہوئی ہے، اور یہ بات بھی ہے کہ مسجد کی تعمیر کا کام دین کا امتیازی نشان اور نافرمانوں کی ذلت (کا سبب) ہے۔ کیونکہ ان کی تعمیر کا ثواب کثیر ملتا ہے، اور ان کے بانی کے دل میں خدا کی طرف سے حق بات ڈالی جاتی ہے چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث وارد ہوئی ہے، کہ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کے لئے مسجد بنائے اگرچہ وہ قطاۃ پرندہ کے گھونسلے کی طرح (مختصر) ہو، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔ پس اسی لیے ہمارے آقا سلطانِ اعظم، خاقانِ مکرم، از روئے فضل و کرم برتر از سلاطین عرب و عجم، عادل شاہ بن مبارک شاہ فاروقی نے اللہ ان کی حکومت کو ہمیشہ قائم رکھے، خداوند کریم کی خوشنودی کی نیک نیت رکھتے ہوئے، اور اس کی عظیم رضامندی کو طلب کرتے ہوئے اس مسجد (کی تعمیر) کا حکم دیا جو (مسجد) قابلِ تعریف ہے، کیونکہ اس کی نظیر کمیاب ہے، اللہ اس (مسجد) کو اس (بادشاہ) کی طرف سے اپنے فضل، مزید کرم اور احسان سے قبول فرمالے۔ اس کی (تعمیر کی) ابتداء ۹۹۰ سنہ (ہجری) میں ہوئی، اور اس کی تکمیل سنہ میں ہوئی، اس کتبہ کو تحریر کرنے کی خدمت اس (بادشاہ) کے کمترین غلام اور اس کی سلطنت کے دعاگو مصطفےٰ بن نور محمد خطاط نے انجام دی۔ اللہ اس کے گناہ معاف کرے۔

کتبہ پر تبصرہ:- اس کتبہ کی زبان عربی اور رسم الخط خط ثلث ہے، عبارت نہایت خوشخط فصیح اور مقفّٰی ہے اسکی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زمین نقرئی اور حروف سیاہ ہیں۔ نقرئی زمین پر ابھرے ہوئے سیاہ حروف عجیب دلکش منظر پیش کرتے ہیں، یہ کتبہ سات سطروں پر مشتمل ہے، اس کی پہلی سطر جو محراب کے بالائی حصے

تنگ زاویہ میں ہے، نہایت مختصر ہے، جس میں صرف "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" درج ہے، باقی سطریں محراب کی بتدریج بڑھتی ہوئی وسعت کے ساتھ طویل ہوتی گئی ہیں، اس کتبہ میں بھی وہی آیت اور وہی حدیث ہے جو دو لسانی کتبہ میں ہے۔ حمد و نعت اور درود و سلام کے بعد صدقۂ جاریہ کی فضیلت اور تعمیر مساجد کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر بانی مسجد کا نام اور مسجد کی تعمیری شان کا ذکر کرنے کے بعد آغاز تعمیر کا سنہ لفظوں میں تحریر ہے، تکمیل کا سنہ ہندسوں میں درج کرنے کے لیے "داتمامہ سنۃ" کے اوپر جو خالی جگہ چھوڑی گئی تھی، وہ اب تک خالی ہے، سب سے آخر میں کاتب کا نام مصطفیٰ بن نور محمد خطاط درج ہے۔

سلاطین فاروقیہ کے ۲۲۵ سالہ دورِ حکومت میں صرف اسی کاتب کا نام تین کتبوں میں آیا ہے، اور وہ کتبے یہ ہیں، جامع مسجد برہان پور کی وسطی محراب کا کتبہ، جامع مسجد اسیرگڈھ کی وسطی محراب کا کتبہ اور حضرت شاہ منصورؒ کی مسجد واقع برہان پور کا کتبہ جو شمالی رخ کی دیوار پر نصب ہے، ان کتبوں کے سوا فاروقی دور کے کسی بھی کتبہ میں کسی بھی کاتب کا نام درج نہیں ہے۔[1]

سنہ تکمیل کے سلسلہ میں غلط فہمی جس طرح اس مسجد کے جنوبی مینار کے کتبہ میں لفظ "الہٰ آباد" سے بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہوئے۔ اسی طرح اس کتبہ میں "داتمامہ سنۃ" کے الفاظ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ عظیم الشان مسجد صرف ایک سال میں مکمل ہوگئی۔ چنانچہ شری ہیرالال، جناب زوّار حسین ایڈیٹر البرہان اور مسٹر رسل (Russ) کی یہی رائے ہے، زوّار حسین صاحب مرحوم نے کتبۂ مذکورہ کا ترجمہ درج کرنے کے بعد تحریر

---

[1] تفصیل کے لیے راقم کے مقالہ بعنوان "جامع مسجد برہان پور کے کتبات" مطبوعہ معارف بابت ماہ مارچ ۱۹۷۵ء کا ص ۲۰۳ ملاحظہ کیجیے۔

کیا ہے کہ "ترجمۂ مذکورہ" بالا سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مسجد کی اتنی بڑی سنگین اور عالی شان عمارت صرف ایک سال میں بنکر تیار ہوگئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کچھ دشوار نہیں کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کو دین کے کاموں سے کس قدر شغف تھا، سلطنت کے تمام کاموں پر مسجد کے کاموں کو انھوں نے ترجیح دی ہوگی، اور سینکڑوں معمار، سنگ تراش اور ہزاروں مزدور لگائے گئے ہوں گے، تب کہیں اتنی مدت میں اتنا بڑا کام تیار ہوا۔[۱]

یہ تینوں حضرات چونکہ عربی زبان کے قواعد اور اسلوبِ بیان سے ناواقف تھے اسلئے انھیں "اتما مدے سنتہ" کے الفاظ سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسجدِ مذکور ایک سال میں مکمل ہوگئی۔ حالانکہ اگر اس فقرہ میں یہی مطلب ادا کرنا ہوتا تو سنتہ کے پہلے لفظ "فی" ضرور آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد کی تکمیل کے پہلے ہی فاروقی سلطنت ختم ہوگئی۔ اس لیے کتبہ میں تکمیل کا سنہ درج نہیں ہوا۔ یہی رائے مسٹر کننگھام (Cunningham) کی ہے، چنانچہ اس نے ہندوستان کی تاریخی عمارتوں کا جائزہ لیکر ان پر جو رپورٹ شائع کی ہے اس میں تحریر کیا ہے کہ جامع مسجد برہان پور اکبر کے حملہ کی وجہ سے نامکمل رہ گئی۔[۲]

بعض احباب کا خیال ہے کہ مسجد مذکور ۱۰۲۲ھ میں مکمل ہوئی، جس کے ثبوت میں وہ کوثر پرنٹنگ پریس برہان پور کی مطبوعہ تاریخ برہان پور کا ایک قطعہ پیش کرکے کہتے ہیں کہ اس کے آخری مصرع میں جو دو تاریخی مادے ہیں، ان میں سے پہلا مادہ آغازِ تعمیر کا ہے اور دوسرا تکمیلِ تعمیر کا۔ ان حضرات نے یہ فیصلہ کرتے وقت مصنف مرحوم کی اس عبارت پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جو اسی تاریخ برہان پور میں قطعہ سے پہلے بطور تمہید موجود ہے، اور جس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں تاریخی مادّے ایک ہی سنہ

---

[۱] البرہان نمبر، ص ۹۴۔ [۲] E. I. P. S. for 1962

کے اور آغازِ تعمیر کے ہیں۔ ذیل میں وہی تمہیدی عبارت مع قطعہ اس مستند تاریخ برہانپور سے درج کی جاتی ہے، جو مصنف کی زندگی میں بڑی احتیاط کے ساتھ ۱۸۹۹ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی تھی، اور اب کمیاب ہے۔

"تاریخ مکرر مشعر سالِ بنائے مسجدِ جامع بلدۂ برہان پور کی یہ ہے۔

شاہِ عادل خلفِ شاہ مبارک فاروق　　بسلاطین جہاں بود وجودے کامل
مسجدے ساختہ از مال مزکّٰی بیشک　　کہ زبان است بتوصیف وثنائش عاطل
خوش دو تاریخ خرد گفت دریں یک مصرع　　مسجد فیض بنا گشت بفیض عادل"

مذکورۂ بالا تمہیدی عبارت میں دو لفظ "تاریخ مکرر"[۹۹۶] اور "سالِ بنا"[۹۹۶] قابلِ غور ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس قطعہ میں ایک ہی تاریخ دو مرتبہ کہی گئی ہے، اور وہ تاریخ سالِ بنا کی ہے، جس میں مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا، مصنف نے مزید احتیاط سے کام لیتے ہوئے دونوں تاریخی مادوں پر خط کھینچکر ہر ایک کے نیچے ۹۹۶ درج کر دیا ہے، جو مسجد کے آغازِ تعمیر کا سنہ ہے۔ کوثر پرنٹنگ پریس کی مطبوعہ تاریخ برہانپور میں بھی یہ قطعہ مع تمہیدی عبارت موجود ہے، لیکن اس میں کسی بھی مادۂ تاریخ کے نیچے سنہ درج نہیں ہے،

اس سلسلہ میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جب کسی شعر یا قطعہ میں ایک ہی سنہ کے دو یا زیادہ تاریخی مادّے پیش کئے جاتے ہیں تو کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن جب ان تاریخی مادوں کے سنہ مختلف ہوں تو شاعر کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے شعر یا قطعہ میں اس کا اشارہ کر دے، ذیل میں دونوں صورتوں کی ایک ایک مثال درج ہے۔

ایک شاعر نے فرمانروائے دکن آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں مرحوم کی تاریخ وفات کے قطعۂ ذیل کے ایک ہی مصرع میں ایک ہی سنہ کے دو تاریخی مادے پیش کئے تو اس نے کسی قسم کی وضاحت نہیں کی۔

بروح پاکِ میر نظام علی مدام — خوانند باوضو ہمہ اشخاص فاتحہ

این مصرع عجیب دو تاریخ راجوں — مستوجب بہشت و باخلاص فاتحہ

۱۲۱۸ — ۱۲۱۸

لیکن جب دوسرے شاعر نے علامہ اقبال کی تاریخ وفات[۵] کے ایسے دو تاریخی مادے پیش کئے جن کے سنہ مختلف تھے تو اس نے یہ وضاحت کر دی کہ ان میں سے فلاں تاریخی مادہ ہجری سنہ کا ہے، اور فلاں عیسوی سنہ کا، ملاحظہ کیجئے۔

شمع خاموش سال ہجری ہے — عیسوی شمع شاعری خاموش

۱۳۵۷ — ۱۹۳۸

تاریخ برہانپور کے مذکورہ قطعہ میں اس بات کا ذرا سا بھی اشارہ نہیں ہے کہ ان میں سے ایک تاریخی مادہ آغازِ تعمیر کا ہے اور دوسرا تکمیل تعمیر کا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں مادے ایک ہی سنہ کے ہیں، اس قطعہ میں شاعر کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ مسجد کے سالِ بنا کے سلسلہ میں ایک ہی مصرع میں ایک ہی سنہ کے ایسے دو تاریخی مادے پیش کر دے جن میں سے ایک میں مسجد کا وصف ہو اور دوسرے میں بانی مسجد کا۔ چنانچہ اس نے "مسجد فیض" سے اس روحانی فیض کو واضح کیا ہے۔ جو مسجد سے جاری ہے اور "تفیضِ عادل" سے بانیِ مسجد (عادل شاہ فاروقی) کی فیاضی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سنہ ۱۰۰۲ھ میں جامع مسجد برہان پور کے مکمل نہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ

---

۵ تاریخ حیدر آباد حصہ دوم ص ۱۴۱ء

اس سنہ کے تقریباً بیس سال بعد بھی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفہ حضرت میر محمد نعمان[1] نقشبندیؒ نے اسے نامکمل فرمایا تھا، چنانچہ جناب منشی مطیع اللہ صاحب راشد برہان پوری نے میر محمد نعمانؒ کے ذکر میں تحریر کیا ہے کہ "خان خانان (عبدالرحیم خان) میر محمد نعمان نقشبندیؒ سے بہ اعتقادِ تمام ملتا تھا، انھیں اپنی محفلوں میں اور تقریبات کے موقع پر شریک رکھتا تھا، انھوں نے انکی خدمت میں گران قدر نذرانے پیش کیے لیکن انھوں نے کبھی کچھ قبول نہیں فرمایا۔ آخر ان سے التجا کی کہ میں عنداللہ کارِ خیر میں کچھ خرچ کرنا چاہتا ہوں، برائے خدا مجھے مشورہ دیجیے۔ آپنے فرمایا کہ فاروقی سلطنت ختم ہوجانے سے جامع مسجد برہان پور کا جو بیرونی حصہ نامکمل رہ گیا ہے۔ اس کی تکمیل کرا دو۔ خان خانان نے آپ ہی کی نگرانی اور مشورہ سے احاطۂ جامع مسجد مشرقی اور جنوبی دروازے اور ہر سہ جانب پختہ اور وسیع حجروں کی قطار بے ونسگ خارا کے دو وسیع حوض تعمیر کرادیے جو آج بھی اچھی حالت میں موجود و مستعمل ہیں۔[2]

---

[1] حضرت میر محمد نعمانؒ ۹۷۷ھ میں سمرقند میں پیدا ہوئے، جب یہ اپنی والدۂ ماجدہ کے شکم مبارک میں تھے امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے ان کے والدِ ماجد کے خواب میں آکر فرمایا تھا کہ تمھارے ہاں جو فرزند پیدا ہونے والا ہے اس کا نام میرے نام پر نعمان رکھنا چنانچہ ان کی ولادت پر ان کا نام میر محمد نعمان رکھا گیا موصوف نے سالہا سال تک حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں رہ کر فیوضات و کمالاتِ باطنی حاصل کیے۔ اس کے بعد حضرت مجدد الفِ ثانیؒ نے انھیں طالبانِ حق کی ہدایت کے لیے برہانپور روانہ کیا، آپ کی ساری زندگی خلق خدا کو فیض پہنچانے میں گزری۔ مزار مبارک برہان پور میں ہے، آپ کے مرید حضرت خواجہ ہاشم کشمیؒ نے زبدۃ المقامات میں آپ کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔

[2] برہان پور کے سندھی اولیا، ص ۱۵۱-۲۔

بہرحال سنہ ۱۰۰۲ھ میں جامع مسجد برہان پور کے مکمل نہ ہونے کے دلائل حسب ذیل ہیں:-

(۱) اگر یہ مسجد سنہ ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوجاتی تو فاروقی سلطنت جو اس کے بعد بھی سات سال تک قائم رہی کتبہ میں سنہِ تکمیل درج کرنے کی غرض سے جو جگہ خالی رکھی گئی تھی، وہاں تکمیل کا سنہ ضرور کندہ کرادیتی، اور یہ کام صرف چند منٹ کا تھا، کیونکہ کاتب کو صرف دو ہندسے اور دو صفر کندہ کرنے تھے۔

(۲) مسٹر کننگھام کی رائے آپ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں کہ فاروقی دورِ سلطنت میں یعنی سنہ ۱۰۰۹ھ تک مسجد مذکور مکمل نہیں ہوئی تھی۔

(۳) محکمۂ آثارِ قدیمہ نے بھی سنہ ۱۰۰۲ھ کو مسجد مذکور کا سنہِ تکمیل ماننے سے صاف الفاظ میں انکار کیا ہے۔[۱]

(۴) اگر یہ مسجد سنہ ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوجاتی تو اس کے تقریباً بیس سال بعد بھی حضرت میر محمد نعمانؒ اسے نامکمل نہ فرماتے۔

(۵) بعض حضرات نے تاریخ برہانپور کے جس قطعہ کے جس تاریخی مادہ کو تاریخ تکمیل سمجھا ہے، مصنفِ تاریخ برہانپور نے اسی قطعہ کو اسی تاریخی مادہ کو آغازِ تعمیر کی تاریخِ مکرر کہا ہے، نہ کہ تاریخِ تکمیل۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عادل شاہ فاروقی نے سنہ ۹۹۰ھ سے ۹۹۷ھ تک تقریباً سات سال میں حضرت شاہ منصورؒ کی مسجد واقع برہان پور، اسیرگڈھ کی عظیم جامع مسجد اور اسی اسیرگڈھ کی شاندار عیدگاہ جیسی تین عالی شان عمارتیں تعمیر کرالیں تو وہ سنہ ۹۹۰ھ سے سنہ ۱۰۰۸ھ تک اپنی زندگی کے آخری آٹھ سال میں بھی

---

[۱] F.I.P.S. for 1961

برہان پور کی ایک جامع مسجد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کیوں قاصر رہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی زندگی کا یہ دور بڑا پُر آشوب تھا۔ وہ سیاسی کشمکش اور جنگ و پیکار میں الجھا ہوا تھا۔ سیاسی الجھنیں تو مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں جن میں بعد میں اور اضافہ ہو گیا تھا، چنانچہ ۹۹۴ھ میں جب شہنشاہ اکبر کے صوبے دار مالوہ خانِ اعظم مرزا عزیز کوکہ کی بیجا ضد کی وجہ سے تصادم کا موقع آگیا تو عادل شاہ فاروقی نے لشکرکشی کی۔ خان اعظم مقابلہ کی تاب نہ لاکر فرار ہو گیا۔ عادل شاہ نے گجرات تک اس کے لشکر کا تعاقب کر کے اسے اپنے بہنوئی عبدالرحیم خانِ خاناں صوبہ دار گجرات کی پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔[1] ۱۰۰۰ھ میں احمد نگر کی تخت نشینی کی جنگ میں اس نے برہان الملک کی حمایت میں جمال خاں دکنی سے سخت جنگ کر کے اسے شکست فاش دی اور برہان الملک کو احمد نگر کے تخت پر بٹھایا۔[2] وہ ۱۰۰۳ھ میں شہزادہ مراد کے ساتھ احمد نگر کی مہم میں شریک رہا[3] اس کے بعد ۱۰۰۵ھ میں اکبر کی حمایت میں احمد نگر، گولکنڈہ اور بیجاپور کی ساٹھ ہزار فوج سے لڑتا ہوا اپنے ۳۵ نامی سرداروں اور بے شمار سپاہیوں کے ساتھ دکنیوں کے توپ خانہ کی زد میں آکر قتل ہو گیا۔[4] ان ہی سیاسی الجھنوں اور جنگ و جدال کی مصروفیتوں کے ساتھ تعمیر مسجد کا کام بھی آہستہ آہستہ جاری رہا۔ اس لئے اس کی تکمیل میں تاخیر ہوتی رہی، اس کے بعد اس کا فرزند بہادر شاہ تخت نشین ہوا، اسے اپنے نام پر بہادر پور آباد کر کے اسے دارالسلطنت بنانے اور وہاں جامع مسجد اور شاہی عمارتیں تعمیر کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی، اس لیے وہ جامع مسجد برہانپور کی تکمیل پر توجہ نہیں کر سکا۔ اس کے علاوہ اس کا دور بھی

---

[1] ظفر الوالہ (عربی) جلد اول ص ۶۸ تا ۷۱، [2] ایضاً ص ۷۱ تا ۷۴، [3] ایضاً ص ۷۵ تا ۷۶،
[4] دربار اکبری تقطیع خورد ص ۶۹۵

پر آشوب دور تھا، وہ تین سال بھی اطمینان سے حکومت نہیں کر پایا تھا، کہ اکبر نے حملہ کر کے اسیر گڑھ کا محاصرہ کر لیا، اور طویل محاصرہ کے بعد اس کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

بہر حال جامع مسجد برہان پور نہ بقول جناب زوّار حسین، شری ہیرا لال اور مسٹر رسل ایک سال میں مکمل ہوئی نہ بقول بعض احباب پانچ سال میں یعنی ۱۰۰۲ھ میں بلکہ وہ آغازِ تعمیر کے تقریباً ستائیس سال بعد شہنشاہ جہانگیر کے عہدِ سلطنت میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، عادل شاہ فاروقی کی زندگی میں دونوں میناروں سمیت مسجد کی اندرونی عمارت اور ایک حوض تعمیر ہو چکا تھا، صحن کو پختہ بنانے کا موقع نہیں ملا تھا، اس لیے وہ بقول مصنف مآثرِ رحیمی بہت جلد خراب و خستہ ہو گیا تھا، تکمیل مسجد میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ یہ تھی، صحن کا پختہ فرش، مسجد کا احاطہ، احاطہ میں طالبانِ علم دین اور عباد و زہاد کے لیے حجروں کی سہ طرفہ قطاریں، آمد و رفت کے لیے مسجد کے شایانِ شان بلند دروازہ، مزید ایک حوض اور حوضوں میں پانی مہیا کرنے کے لیے کنوئیں کی تعمیر۔ چونکہ اتنے کام باقی رہ گئے تھے، اس لیے کتبہ میں تکمیل کا سنہ درج نہیں کیا گیا، یہ سب کام ۱۰۲۴ھ میں نواب عبد الرحیم خان خاناں کے خرچ سے حضرت میر محمد نعمانؒ کی نگرانی میں انجام پا گئے۔ کنوئیں کی تعمیر کے بجائے لعل باغ سے ایک زمین دوز نہر جامع مسجد تک لائی گئی جس کا تاریخی نام "نہر جاری" ۱۰۲۴ھ ہے۔

جامع مسجد برہان پور کی وسطی محراب کے اس عربی کتبہ پر تبصرہ ہو چکا۔ اب برہانپور و اسیر گڑھ کی جامع مسجدوں کے سنسکرت کتبوں کا بعض لوگوں پر جو ردِّ عمل ہوا ہے اس کا جائزہ لینا ہے۔ ان لوگوں نے یہ غلط خیال قائم کر لیا تھا کہ دربارِ الٰہی میں جو نذرانۂ عقیدت سنسکرت زبان میں پیش کیا جائے گا، وہ یقیناً مشرکانہ جذبات کا حامل ہو گا۔

اسی غلط خیال کی بنا پر مسٹر بلاک نے ایک غلط نظریہ پیش کیا، اور جناب مولوی عبد الحق صاحب فاروقی نے اس پر حاشیہ آرائی کرکے سلاطینِ فاروقیہ پر بے بنیاد الزام عائد کیا۔ حالانکہ سب زبانیں خدا کی بنائی ہوئی ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے، وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اخْتِلَافُ اَلْوَانِکُمْ وَاَلْسِنَتِکُمْ۔ یعنی خدا کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمھارے رنگ اور تمھاری زبانیں الگ الگ بنائی ہیں، اگر سنسکرت مسلمانوں کی مذہبی زبان نہیں تو اردو، فارسی، ترکی بھی مسلمانوں کی مذہبی زبانیں نہیں ہیں۔ اگر اردو و فارسی میں اسلامی خیالات کا اظہار جائز ہے تو سنسکرت میں بھی جائز ہے۔

مسٹر بلاک نے جامع مسجد اسیر گڈھ کے سنسکرت کتبہ کو دیکھ کر جو نظریہ پیش کیا تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عادل شاہ فاروقی نے یہ مسجد اس لیے تعمیر کی تھی کہ مسلمان اس میں نماز پڑھیں اور ہندو پوجا کریں۔ اس لئے اس نظریہ کی تائید میں یہ دلیل پیش کی تھی، کہ سنسکرت کتبہ کا آغاز ہندوانہ دعائیہ کلمات سے ہوا ہے[1]۔ اس دلیل کی تردید راقم نے ماہنامہ معارف کی ماہ ستمبر ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں کردی ہے، جس کا لب لباب یہ ہے کہ سنسکرت کتبہ کے جن ابتدائی جملوں پر اعتراض ہوا ہے ان میں اوصافِ الٰہی کا وہ مضمون ادا ہوا ہے، جو قرآن اور حدیث میں موجود ہے، سلطان عادل شاہ فاروقی قابل مبارکباد ہے، کہ اس نے اسلامی عقائد کو اپنی ہندو رعایا کی مذہبی زبان میں کندہ کرا کر انھیں خدا کے بارے میں اسلامی تصورات سے آگاہ کرایا ہے، اب رہا مسٹر بلاک کا یہ نظریہ کہ مسجد اس لیے تعمیر کی گئی تھی کہ مسلمان اس میں نماز پڑھیں

---

[1] معارف بابت ماہ جون ۱۹۷۳ء عنوان "اسیر گڑھ کے کتبات"۔

اور ہندو پوجا کریں، اس کا جواب یہ ہے کہ برہانپور و اسیر گڑھ کی جامع مسجدوں کے عربی و سنسکرت کتبوں کے کسی بھی جملہ سے اس نظریہ کی تائید میں ذرا سا بھی اشارہ نہیں ملتا۔ اس کے برخلاف ان کتبوں کی داخلی شہادت اس نظریہ کی تردید کرتی ہے، ان دونوں مسجدوں میں عربی کے دو دو کتبے ہیں، ان چاروں کتبوں کا آغاز قرآن مجید کی اس مبارک آیت سے ہوا ہے، وانّ المساجد للّٰہ فلا تدعوا مع اللّٰہ احدا ۰ یعنی بیشک سب مسجدیں اللہ کی عبادت کے لیے ہیں، پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو، صاحب تفسیر مظہری نے اس آیت کی تشریح میں تحریر کیا ہے کہ "مسجدیں اللہ کے لیے مخصوص ہیں، اللہ کی عبادت میں دوسروں کو شریک قرار دینے کے لیے نہیں ہیں، پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہودی اور عیسائی عبادت خانوں میں جاکر عبادت الٰہی میں دوسروں کو شریک کرتے تھے، اس پر اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ مسجدوں میں جائیں تو اپنی دعائیں خالص اللہ ہی سے کریں" [۱] عادل شاہ فاروقی نے اس مبارک آیت کا انتخاب کرکے اسے ان چاروں کتبوں کی تحریر میں جو اولیت دی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ان مسجدوں کو غیر اللہ کی عبادت سے پاک رکھنا چاہتا تھا، اس کے علاوہ جامع مسجد اسیر گڑھ کی وسطی محراب کے کتبہ میں کلمۂ طیبہ کے علاوہ آیۃ الکرسی، سورۂ اخلاص، اور سورۂ کافرون بھی کندہ ہیں کلمۂ طیبہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، اس کے پہلے جزو میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اس لئے اللہ کے سوا کسی کی عبادت کی اجازت نہیں ہے، آیۃ الکرسی اور سورۂ اخلاص میں توحید خالص کی تعلیم دیکر یہ واضح کیا گیا ہے، کہ خدا کی

---

[۱] تفسیر مظہری، اردو، آخری جلد ص ۱۳۵۔

خدائی میں کوئی شریک نہیں ہے، سورۂ کافرون کا مضمون اسلامی عبادت کے ساتھ غیر اسلامی پرستش کی نفی کرتا ہے، ان سب دلائل سے مسٹر بلاک کے نظریہ کی تردید ہوتی ہے۔ آیئے اب ایک نظر سنسکرت کتبوں کی داخلی شہادت پر بھی ڈال لیں، جامع مسجد برہان پور کے سنسکرت کتبہ میں تعمیر مسجد کی غرض وغایت بتاتے ہوئے کہا گیا ہے،

(आदल शाह राज्ञा मसी तिरियं नि मिता स्व धर्म पाल नार्थं) اس فقرہ کا آخری لفظ دو لفظوں پالن اور ارتھ سے مرکب ہے، ارتھ کے معنے ہیں غرض ومقصد، پالن کے ایک معنے ہیں، اصولوں کے مطابق عمل کرنا، اور دوسرے معنے ہیں حفاظت کرنا۔ پالن کے پہلے معنی کے اعتبار سے اس فقرہ کا مطلب یہ ہوا کہ عادل شاہ بادشاہ نے اپنے مذہب کے اصولوں کے مطابق عمل کرنے کے لیے مسجد تعمیر کی، ظاہر ہے کہ بادشاہ کا مذہب اسلام تھا، اس لیے یہ مسجد اسلامی احکام پر عمل کرنے کے لیے ہی بنائی گئی تھی نہ کہ غیر اسلامی احکام کی بجاآوری کے لیے۔ دوسرے معنی کے اعتبار سے یہ مطلب ہوگا کہ سلطان عادل شاہ نے اپنے مذہب کی حفاظت کیلئے مسجد تعمیر کی، ضمناً اس بات کیطرف اشارہ ہے کہ مسجد میں کسی ایسے کام یا ایسی عبادت کی اجازت نہیں ہے، جس سے اسلامی احکام محفوظ نہ رہیں۔

مسٹر بلاک کے نظریہ کا جواب ہوچکا۔ اب محترم مولوی عبد الستار صاحب فاروقی نے اپنے اس مقالہ[1] میں جس کا عنوان "اسیر گڑھ کے کتبات" ہے، اس نظریہ پر جو حاشیہ آرائی کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ فاروقی خاندان نے اکثر ہندوانہ مراسم وخیالات کو قبول کر لیا تھا" یہ لوگ ہندو جوتشیوں کی بڑی قدر کرتے تھے، مسجد کا سنگ بنیاد

---

[1] مطبوعہ معارف بابت ماہ جون سنہ ۱۹۳۲ء

ایسے زمانہ میں رکھا گیا" جب کہ دکن میں ہندو ملمانی ہوا چل رہی تھی، اور آج تک اس قرب وجوار میں ایسے پیرزادے ہیں"

"جن سے ہر دو قوموں کو عقیدت و ارادت ہے، اور وہ اوتاروں کو مانتے ہیں"

فاضل مقالہ نگار کا مذکورہ بیان چار فقروں پر مشتمل ہے، اور اس کا ایک ایک فقرہ غور طلب ہے۔ پہلے فقرہ میں بڑے وثوق کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ "فاروقی خاندان نے اکثر ہندوانہ مراسم وخیالات کو قبول کر لیا تھا" دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ کونسے ہندوانہ مراسم وخیالات تھے، جو سلاطینِ فاروقیہ نے قبول کر لیے تھے، اور ان کا ثبوت آپ کے پاس کیا ہے؟ ہمیں تو کسی بھی تاریخ میں اس کا ادنیٰ سا بھی ثبوت نہیں ملا۔ نہ انھوں نے ہندوانہ لباس وطرز معاشرت اختیار کی نہ ہندوؤں کے تہوار منائے، نہ ان کے مذہبی عقائد قبول کئے، نہ ان سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کئے، نہ شہنشاہ اکبر اور والی گول کنڈہ ابوالحسن تانا شاہ کی طرح اپنے شاہی قلعوں میں مندر تعمیر کئے۔ اس کے برخلاف کتب تاریخ سے ان کی دین داری اور عقائد کی پختگی کے ثبوت ملتے ہیں۔ جناب مفتی مطیع اللہ صاحب راشد برہانپوری نے اپنی کتاب برہانپور کے سندھی اولیاء کے دیباچہ میں سلاطینِ فاروقیہ کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ

"فاروقی سلاطین کی بابت یہ ظاہر کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ بانی سلطنت سے لے کر "خاتم سلطنت" تک اس سلسلہ کے تمام بادشاہ راسخ العقیدہ سُنی ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی، "عالم وفاضل، درویش دوست اور صوفیانہ ذوق سے بہرہ ور تھے، اور علماء صلحاء وصوفیاء" کی سرپرستی اور معارف نوازی میں ایک دوسرے پر تفوق رکھتے تھے۔ نیز ہر بادشاہ اپنے زمانہ "کے کسی نہ کسی خدا رسیدہ

بزرگ کی بیعت وخلافت سے فیضیاب تھا؟

اذکار ابرار کے مصنف نے بھی عادل شاہ فاروقی بانی جامع مسجد برہان پور کو "درویش دوست اور ولی سرشت" تحریر کیا ہے (صفحہ ۲۵۸)

دراصل ہندوانہ مراسم وخیالات اکبر جیسے بادشاہوں نے قبول کر لئے تھے جس کے ثبوت تاریخ میں بکثرت موجود ہیں، نمونہ کے طور پر ایک ثبوت ملاحظہ ہو، جو مولانا محمد حسین آزاد نے شہنشاہ اکبر کے جشنِ نوروز کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے۔

" روز جشن سے ایک دن پہلے مبارک ساعت شبھ لگن میں ایک سہاگن بی بی اپنے ہاتھ سے دال دلتی، اسے گنگا جل مین بھگوتی، پیٹھی پیس کر رکھتی جشن کی ساعت قریب آئی، بادشاہ اشنان کو گئے، رنگین جوڑا ساعت اور ستاروں کے موافق حاضر، جامہ پہنا، کھڑکی دار پگڑی راجپوتی انداز سے باندھی، مکٹ سر پر رکھا، کچھ اپنا خاندانی کچھ ہندوانی گہنا پہنا، جوتشی اور نجومی اصطرلاب لگائے بیٹھے ہیں، جشن کی ساعت آئی، برہمن نے ماتھے پر ٹیکا لگایا، جواہر نگار کنگن ہاتھ مین باندھا، کوٹلے دہک رہے ہیں، خوشبوئیاں تیار ہیں، ہون ہونے لگا، چوکے میں کڑھائی چڑھی ہے۔ یہاں اس میں بڑا پڑا اوہاں بادشاہ نے تخت پر قدم رکھا، نقارۂ دولت پر چوب پڑی، نوبت خانہ میں نوبت بجنے لگی کہ گنبد گردوں گونج اٹھا۔"[1]

ہندوانہ مراسم وخیالات قبول کرنے کا کیسا واضح ثبوت ہے۔ ایسا کوئی ثبوت برہان پور کے سلاطین فاروقیہ کے طویل دورحکومت میں کہیں نظر نہیں آتا۔

---

[1] دربار اکبری تقطیع خورد ص ۱۶۶

فاروقی بادشاہوں پر مولانا عبدالستار فاروقی کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "یہ لوگ ہندو جوتشیوں کی بڑی قدر کرتے تھے"، اس فقرہ میں کتنی پتہ کی بات کہی گئی ہے کہ سلاطین فاروقیہ نجوم کے معتقد تو تھے ہی، لیکن ان کے دربار میں مسلمان نجومیوں کے بجائے ہندو جوتشیوں کی بڑی قدر تھی۔ حالانکہ سوائے اس کے کہ ایک فاروقی بادشاہ کے ایک کتبہ میں مسجد کا سنگِ بنیاد رکھنے کی مبارک ساعت کا ذکر ہے، کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا کہ اس خاندان کے بادشاہ نجوم یا جوتش کے قائل تھے۔ ممکن ہے کہ دیگر شاہانِ اسلام کی طرح سلاطینِ فاروقیہ بھی نجومیوں اور جوتشیوں کے قدرداں رہے ہوں، مگر ہندو جوتشیوں کی تخصیص کی نہ کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے، نہ مولانا نے اپنے دعوے کی تائید میں کوئی ثبوت پیش کیا ہے۔

نجوم کی شرعی حیثیت سے قطع نظر، اس زمانہ میں عام رجحان یہ تھا کہ کسی اہم کام کو انجام دینے کے لیے مبارک ساعت تلاش کی جاتی تھی، اسی لئے علمِ نجوم کی عام مقبولیت تھی، اور یہ علم شہزادوں اور امیرزادوں کے درس میں داخل تھا، نیز شاہی درباروں میں اس کی بڑی قدر تھی، چنانچہ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب دربارِ اکبری میں اس سلسلہ میں یہ تحریر کیا ہے کہ

> "شاہانِ گذشتہ وامرائے سلف علوم کے ذیل مین علمِ اخلاق، تاریخ دانی، ہیئت، نجوم، رمل، شاعری، انشاپردازی، خوش نویسی، مصوری، وغیرہ وغیرہ کو فنون کے اجزائے کامل سمجھ کر بڑی کوشش سے حاصل کرتے تھے، اور جو لوگ ان باتوں میں کمال رکھتے تھے، ان کی عزت و توقیر کرتے تھے، خود بھی ان باتوں میں کمال یا اچھی مداخلت پیدا کرتے تھے"[۵]

۵؎ دربارِ اکبری تقطیع خورد ص ۷۶۵۔

تقریباً تمام مسلمان بادشاہوں، امیروں اور رئیسوں کو نجوم سے دلچسپی تھی اور وہ نجومیوں کے قدر داں اور معتقد تھے، جس کے ثبوت میں چند سلاطین و امراء کے واقعات بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔

شہنشاہ اکبر ابھی آپ شہنشاہ اکبر کے حال میں پڑھ چکے ہیں کہ اس کے جشن وزن کے سلسلہ میں جو بڑا تلا جاتا تھا، اس کے لیے دال بھی مبارک ساعت میں پیسی جاتی تھی، اس جشن کے موقع پر جو لباس پہنا جاتا تھا اس کے رنگ کا انتخاب بھی ساعت اور ستاروں کی مناسبت سے کیا جاتا تھا۔ تخت پر قدم رکھنے کی ساعت بتانے کے لیے نجومی اور جوتشی ہاتھ میں اصطرلاب لیے ہوئے دربار میں موجود رہتے تھے، نجومیوں اور جوتشیوں کی تجویز کردہ ساعت پر اکبر برہمن کے ہاتھ سے اپنے ماتھے پر ٹیکا لگواتا تھا۔

ہمایوں بادشاہ شہنشاہ اکبر کا باپ ہمایوں بھی نجوم کا معتقد تھا، اور خود بھی اس فن میں ماہر تھا، چنانچہ جب اس نے حمیدہ بانو سے نکاح کرنا چاہا تو خود اصطرلاب ہاتھ میں لیکر نکاح کی مبارک ساعت دریافت کی اور اس ساعت میں نکاح پڑھوایا۔[۴]

شہزادی گلبدن بیگم اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم بھی نجومیوں کی معتقد تھی، چنانچہ اس نے اکبر کی ولادت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

قمر در برج اسد بود، تولد برج ثابت شدہ، بغایت خوب است و منجمان گفتند فرزندے کہ دریں ساعت شود صاحب اقبال و دراز عمری شود۔[۵]

(اکبر کی ولادت کے وقت) قمر برج اسد میں تھا، اس برج میں ولادت ثابت ہو گئی۔ یہ بات نہایت اچھی ہے، نجومیوں نے کہا ہے کہ جو فرزند اس ساعت میں پیدا ہوتا ہے[۵]

---

[۴] و [۵] ہمایوں نامہ گلبدن بیگم ص ۹۸۔

وہ صاحبِ اقبال اور عمر دراز ہوتا ہے۔

سلطان محمد تغلق | یہ بادشاہ عالمِ دین تھا۔ اور اسے ہدایہ کی چاروں جلدیں زبانی یاد تھیں اس کے باوجود وہ نجوم کا معتقد تھا، چنانچہ جب اس نے امرائے دکن کی بغاوت کے سلسلہ میں قلعۂ دولت آباد کا محاصرہ کرنا چاہا تو شاہی دربار کے نجومیوں نے آگاہ کر دیا کہ محاصرہ شروع کرنے کے لیے آج سے تین دن تک کوئی نیک ساعت نہیں ہے۔ اس لیے سلطان کے حکم کے مطابق شاہی فوج ان ایام میں بغیر کسی کارروائی کے قلعہ سے دور کھڑی رہی جب چوتھا دن نکلا تو اس نے منجنیقیں نصب کر کے سرنگ کھودنی شروع کی[۱]

سلطان علاء الدین بہمنی | جب ظفر خان نے سلطان محمد تغلق کا اقتدارِ حکومت ختم کر کے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی تو برہمن جوتشیوں کی تجویز کردہ نیک ساعت پر تاج پوشی کی اور علاء الدین بہمنی کے لقب سے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔[۲]

سلطان احمد شاہ بہمنی | سلطان احمد شاہ بہمنی نے اپنے شہزادہ کی شادی والیِ برہان پور نصیر خاں کی شہزادی زینب سے بڑی دھوم دھام سے کی اور دلہن کو اپنے دار السلطنت احمد آباد بیدر لے گیا۔ چونکہ نجومیوں نے بتایا تھا کہ دولہا دلہن کے ملنے کی مبارک ساعت دو ماہ بعد آئے گی۔ اس لیے اس نے دلہن کو اس کی کنیزوں سمیت شہر کے باہر اس عالی شان بارہ دری میں ٹھہرایا جو ایک دلکش باغ میں تھی اور شہر کی آئین بندی کرا کر دو ماہ تک جشن مناتا رہا۔ پھر جب نجومیوں کی تجویز کردہ ساعت آئی تو دلہن کو شہر میں داخل کر کے دولہا سے ملایا[۳]

اس طرح عروس و نوشاہ کو نجومیوں کی طے کردہ مبارک ساعت کے انتظار میں

۱؎ تاریخ فرشتہ اردو جلد اول ص ۴۴۳　۲؎ ایضاً ص ۴۴۳　۳؎ ایضاً ص ۵۱۴

دو ماہ تک ایک دوسرے سے جدا رہنا پڑا۔

صوبہ دار داؤد خان پنی داؤد خان پنی اورنگ آباد کا صوبہ دار تھا۔ فرخ سیر کے فرمان کے مطابق اس کا تبادلہ احمد آباد (گجرات) کو ہوا تو وہ احمد آباد پہنچکر تین روز تک شہر کے باہر دریائے نربدا کے کنارے محمد بیگ خان نائب صوبہ دار کے مکان میں مقیم تھا اور چوتھے روز شہر میں داخل ہوا۔ کیونکہ نجومیوں کے فیصلہ کے مطابق شہر میں داخل ہونے کی مبارک ساعت تین روز کے بعد آنے والی تھی[1]

شہنشاہ شاہ جہان شاہجہاں نے دہلی کے قلعہ کی بنیاد مبارک ساعت میں رکھی تھی[2]

شہنشاہ اورنگ زیب۔ شہنشاہ اورنگ زیب جو شریعت کی پابندی میں ضرب المثل ہے، اسے ایام شہزادگی ہی سے نجوم سے دلچسپی تھی، اس کا مصاحب فاضل خاں علم نجوم کی رو سے پیشینگوئیاں لکھ کر اسے دیا کرتا تھا، جن میں سے اکثر صحیح ثابت ہوئیں۔ خصوصاً دکن کی مہم میں جو واقعہ بمقام خواص پور پیش آیا۔ اس کی پیشینگوئی وہ سالہا سال پہلے کر چکا تھا[3]

اورنگ زیب کی علم نجوم سے یہ دلچسپی بعد میں بھی باقی رہی، چنانچہ دارا شکوہ پر فتح حاصل کرنے کے بعد جب وہ دہلی کے باغ اعز آباد میں جو شالامار باغ کے نام سے مشہور ہے، لشکر سمیت مقیم تھا، نجومیوں نے تخت نشینی کی مبارک ساعت روز جمعہ یکم ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ تجویز کی اور اتنا وقت نہیں تھا کہ سلطنت مغلیہ کے تاجداراایسے موقع پر جس پیمانہ کی تیاری کرتے تھے، اس کا اہتمام ہو سکے۔ لہذا شہنشاہ اورنگ زیب نے اس خیال سے کہ نجومیوں کی طے کردہ ساعت سعید ٹل نہ جائے۔ اسی باغ میں وقت مقررہ پر سادگی کے ساتھ رسم تخت نشینی ادا کرلی[4]

---

[1] مرآۃ احمدی فارسی جلد اول ص ۴۰۳ [2] معارف بابت ستمبر ۷۴ء، ۶ [3] قاموس المشاہیر جلد دوم ص ۱۱۶، ۱۱۵ [4] مآثر الامراء فارسی جلد سوم ص ۴۹۰، ۵۰۵، ۵۰۰، میر ابوالفضل معموری کے ذکر میں ضمناً۔

علم نجوم سے شاہانِ اسلام کے اس گہرے تعلق کو دیکھتے ہوئے، والی برہان پور سلطان عادل شاہ فاروقی نے جامع مسجد برہان پور کے سنسکرت کتبہ میں آغازِ تعمیر کی جو مبارک ساعت درج کرائی ہے، وہ کوئی ایسی حرکت نہیں معلوم ہوتی جس کی بنا پر نہ صرف اسے بلکہ پورے فاروقی خاندان کو مطعون کیا جائے کیونکہ

ع:- این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

پھر یہ نجومی ساعت کسی عربی کتبہ میں نہ ہو کر سنسکرت کتبہ میں ہے جس کا تعلق عادل شاہ کی ہندو رعایا سے تھا، چونکہ ہندو ہر اہم کام میں مبارک ساعت کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ ان کی اسی دلچسپی کے پیشِ نظر کتبۂ مذکورہ میں مبارک ساعت درج کی گئی ہو۔

فاضل مقالہ نگار مولانا عبدالستار صاحب فاروقی کا تیسرا فقرہ یہ ہے "مسجد کا سنگ بنیاد ایسے زمانہ میں رکھا گیا جب کہ دکن میں "ہندو لمانی" ہوا چل رہی تھی"، پروفیسر حمید الدین سلیم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان اردو کے لیے "ہندولمانی کی اصطلاح وضع کی تھی، لیکن فاروقی صاحب نے اپنے مقالہ کے فٹ نوٹ میں ہندو لمانی کو ہندو مسلم قوم کا متحدہ نام تحریر کیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ سولہویں صدی عیسوی میں ہندو مسلم اتحاد کی جو تحریک جاری ہوئی تھی، اسے موصوف نے ہندولمانی ہوا چلنے سے تعبیر کیا ہے، لیکن یہ ہوا تو شہنشاہ اکبر کی وجہ سے شمالی ہند میں بڑے زوروں سے چل رہی تھی نہ کہ خاندیس و دکن میں، پھر سوال یہ ہے کہ اس ہوا سے تعمیر مسجد کا کیا تعلق؟

فاروقی صاحب کا چوتھا فقرہ یہ ہے "آج تک اس قرب و جوار میں ایسے پیرزادے موجود ہیں جن کو ہر دو قوموں کو عقیدت و ارادت ہے اور وہ اوتاروں کو مانتے ہیں"

اس کا جواب یہ ہے کہ برہان پور سے چار میل دور بہادر پور میں "ست پنتھی" مسلک کے ایسے پیرزادے موجود ہیں، جن سے ہندوؤں کے ایک فرقہ کو عقیدت ہے، اور وہ بھی صرف ہندوؤں کو مرید بناتے ہیں، اور انھیں یہ سمجھاتے ہیں کہ ہر قوم میں وقتاً فوقتاً خدا کا پیغام پہنچانے اور نیکی کا راستہ بتانے والے بزرگ آتے ہیں[1] جنھیں ہم پیغمبر کہتے ہیں، اور تم اوتار سمجھتے ہو، سب سے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلعم عرب میں تشریف لائے جن کے بارے میں تمھاری مذہبی کتابوں میں بھی پیشنگوئیاں موجود ہیں[2] لہٰذا یہ دور انہی کی تعلیمات پر عمل کرنے کا دور ہے، چنانچہ وہ اپنے مریدوں سے اسلام کی کئی تعلیمات پر عمل بھی کراتے ہیں، اگر ان ست پنتھی بزرگوں کا یہ طریقہ محترم فاروقی صاحب کی نظر میں قابلِ اعتراض ہے۔ تو اس سے برہان پور کے سلاطینِ فاروقیہ کا کیا تعلق، کیونکہ بمبئی گزیٹیر کی صراحت کے مطابق ست پنتھی مسلک کے سب سے پہلے مبلغ جو بہادر پور نواح برہان پور میں تشریف لائے وہ فاروقی سلطنت ختم ہونے کے پچاس سال بعد ۱۶۵۰ء میں تشریف لائے تھے۔ فاروقیوں کے سوا دو سو سالہ دورِ حکومت میں نہ یہاں ایسے پیرزادے تھے، نہ ایسی کوئی تحریک تھی

فاروقی صاحب کے اعتراضات کے تسلی بخش جوابات تحریر ہو چکے۔ اب سب سے آخر میں مع جناب جاوید صاحب انصاری کے مقالہ کے اس حصہ پر تبصرہ کرتا ہے، جس میں جا

---

[1] اس عقیدہ کی بنیاد قرآن مجید کی ان آیتوں پر ہے۔ (۱) اِن مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ یعنی کوئی قوم ایسی نہیں ہے، جس میں (برے کام کے) برے نتیجوں سے ڈرانے والے نہ آئے ہوں۔ (۲) وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ اور ہر قوم کے لئے ایک ہدایت کرنے والا آیا ہے۔ [2] یہ پیشنگوئیاں بھوشیہ پران (भविष्य पुराण) اور کلکی پران (कल्की पुराण) میں موجود ہیں۔

برہان پور کے کتبوں کا ذکر ہے، موصوف کا ایک قابل قدر مقالہ ماہ نامہ معارف کی ماہ اپریل ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، جس کا عنوان "فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ" اور ذیلی عنوان "جامع مسجد برہان پور" ہے۔ مقالۂ مذکورہ میں مسجد مذکور کی تعمیری شان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، جو قابل تعریف ہے، مگر کتبات کا بیان تشنہ رہ گیا ہے۔ موصوف نے فاروقی دور کے دونوں کتبوں کا مختصر سا تعارف تو کرایا ہے۔ مگر نہ ان کی عبارتیں نقل کی ہیں نہ ترجمہ تحریر کیا ہے، دور مغلیہ کا کتبہ جو جنوبی مینار پر کندہ ہے، اس کی صرف عبارت بلا ترجمہ و تبصرہ نقل کر دی ہے، ان تینوں کتبات کے اس سرسری ذکر میں بھی کچھ فرد گذاشتیں ہو گئی ہیں، جو حسب تفصیل ذیل ہیں۔

۱۔ دو لسانی کتبہ (عربی و سنسکرت کا مشترکہ کتبہ) :- (۱) محترم مقالہ نگار نے اس کتبہ کے حصۂ عربی کا رسم الخط خط طغرا تحریر کیا ہے، حالانکہ وہ خط نسخ ہے۔

(۲) سنسکرت حصہ کی ابتدائی عبارت کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ "اس میں کلام اللہ کی آیت اور حدیث کا ترجمہ ہے"۔ اس سے ان کی مراد وہی آیت اور وہی حدیث ہے جسکی وہ کتبہ مذکورہ کے حصۂ عربی میں نشان دہی کر چکے ہیں۔ حالانکہ نہ اسمیں نہ اس آیت کا ترجمہ ہے نہ اس حدیث کا بلکہ دربار الٰہی میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے اوصاف الٰہی کا ذکر ہے۔

۲۔ وسطی محراب کا کتبہ :- یہ کتبہ منبر کے پاس کی وسطی محراب پر ہے جس کا خط خط ثلث ہے، مگر موصوف نے اسے خط کوفی تحریر کیا ہے۔

۳۔ جنوبی مینار کا کتبہ :- (۱) محترم جاوید صاحب نے اسکی پہلی سطر میں "ظل الٰہ اکبر بادشاہ غازی" تحریر کیا ہے، حالانکہ کتبہ میں "ظل الٰہ اکبر بادشاہ شاہ اکبر" صاف تحریر ہے۔ پہلا اکبر الٰہ کی صفت ہے اور دوسرے اکبر سے

شہنشاہ اکبر مراد ہے۔

(۲) موصوف نے اس کتبہ کی دوسری سطر کا شعر اس طرح تحریر کیا ہے۔ سے

گشت آباد اسیر از رائے نامی ... سنہ بشش گفت الہ آباد

حالانکہ کتبہ میں "از راں" کے بجائے "از اں" اور "سنہ بشش گفت" کے بجائے "سنہ بیش گفت" تحریر ہے۔ ممکن ہے کہ "از راں" کتابت کی غلطی ہو مگر دوسرے مصرع کی غلط تحریر میں معارف کے کاتب کا کوئی دخل نہیں ہے۔ کیونکہ مقالہ نگار نے جس کتاب سے نقل کیا ہے اس میں یہ اسی طرح درج ہے۔

(۳) اس کتبہ میں تیسری سطر کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں "بتاریخ ۱۲ فروردین ماہ الٰہی سنہ ۴۵ موافق رمضان سنہ ۱۰۰۹" مگر موصوف کے مقالہ میں "۱۲ فروردین" کے بجائے "۱۱ فروردین اور ۲ رمضان سنہ ۱۰۰۹" کے بجائے "۵ رمضان سنہ ۱۰۰۹" تحریر ہے۔ کاتب کتبہ میں رمضان کی تاریخ جو ۲ تھی درج کرنا بھول گیا، اس لیے کتبہ کی نقل میں لفظ رمضان سے پہلے ۵ کے ہندسہ کا کوئی جواز نہیں ہے۔

(۴) موصوف نے ساتویں سطر میں "والمنتسب الٰہی سید شیر قلندر ابن بابا حسین ابدال" تحریر کیا ہے جبکہ کتبہ میں "انا" کے بجائے "اما" اور "حسین ابدال" کے بجائے "حسن ابدال" موجود ہے۔ بابا حسن ابدال ایک مشہور بزرگ تھے ان ہی کے نام پر وہ بستی بھی حسن ابدال کہلاتی ہے جس میں ان کا مقبرہ ہے، کاتب نے والمنتسب اما کے الفاظ سے اپنے مادری سلسلۂ نسب کا ان سے انتساب کیا ہے۔

(۵) کتبہ کی نویں سطر میں "فتح خاندیس" درج ہے، مگر مقالۂ مذکورہ میں فتح خاندیش تحریر ہے۔

جنوبی مینار کے کتبہ کی عبارت نقل کرنے میں موصوف سے جو فرو گذاشتیں ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کوٹر پہ ننگ مطبوعہ تاریخ بدایونی سے عبارت مذکورہ نقل کر لی، اور اسے کتبۂ مینار کی اصل عبارت سے نہیں ملایا۔

ادبیات

قطعات

از۔ جناب خسروی صاحب۔ ناظم آباد کراچی

۱۔ بے پردہ رخِ حیات کبتک ہوگا؟　　عرفانِ کمالِ ذات، کبتک ہوگا؟
انسان بنے گا اپنے لائق کبتک؟　　شائستۂ کائنات، کبتک ہوگا؟

۲۔ ہر ایک رند یہاں غرق اپنے جام میں ہے　　ہر ایک جام ابھی گردشِ مدام میں ہے
وہ مے فروش، کہ میخانہ جس سے رقص میں ہے　　کشیدِ تازہ کے ہر آن اہتمام میں ہے

۳۔ تسلیم کہ بے سوزِ دروں آج ہیں سینے　　جینے کے نہ آتے ہیں، نہ مرنے کے قرینے
ملت کے خرابے سے نہ جا روحِ محمدؐ　　شاید تجھے مل جائیں کہیں اب بھی دفینے

۴۔ اے کہ مستقبل کا کرنا ہے تجھے ہردم سفر　　دولتِ ماضی سے کیسہ حال کا خالی نہ کر
اے مسافرِ انفس و آفاق کے رُک رُک کے چل　　سوئے یثرب ڈالتا رہ پیچھے مُڑ مُڑ کر نظر

۵۔ گرچہ شعلے کچھ فروزاں اب اپنے دل میں ہیں　　بجلیاں پنہاں ابھی گو انکے آب و گل میں ہیں
راہ کعبہ پوچھتے ہیں دیر والوں سے مگر　　اے محمدؐ، راہرو تیرے یہ کس منزل میں ہیں؟

۶۔ انفس و آفاق میں کرتا رہا قرنوں سفر　　مل نہ پائی یک نفس بھی تو کہیں جائے حضر
دیکھ ڈالے عرش و کرسی کے مقاماتِ جلیل　　کوئی بھی اپنے سوا پایا نہ اپنا مستقر

۷۔ کیوں لئے بیٹھا ہے یہ پشتارۂ علم و عمل؟　　تو "نعم" کا ہے مسافر، وادیِ "لا" سے نکل

---

۱۵ اتھم لفی سکرتھم یعمھون (القرآن)

بوجھ سے اپنے ہی گر جانے تو اس راہ میں　　اگلی منزل تک پہنچنا ہے تو ہلکا ہو کے چل
وادیِ گیسو میں کیوں سالک رُخِ زیبا کے ہیں؟　　دشتِ لا میں کیوں ابھی تک قافلے آ آ کے ہیں؟
صبحِ انساں کو وہ حرا سے ہو چکی کب کی طلوع　　کس خرابے میں پڑے رہرو ابھی بطحا کے ہیں؟

غزل

از جناب فضا ابن فیضی

سنگ ریزوں میں ہیں یا آب گینوں میں ہیں　　ہم رہیں جیسوں میں بھی اپنے قرینوں میں ہیں
کم سے کم اس دور میں اتنا ہنر بھی ہے بہت　　بے ہنر ہیں جو وہ میرے نکتہ چینوں میں ہیں
خاک ہو کر بھی بچا لے جاؤ تم اپنا انا　　قتل ہو جاؤ مگر تیور جبینوں میں ہیں
اب یہ بیٹھے سوچتے ہیں قتل کھا جانے کے بعد　　ہم بھی خنجر بن کے کچھ دن آستینوں میں ہیں
پاؤں کی زنجیر ٹھہری وسعتِ قلب و نظر　　ورنہ ہم سے لوگ کیا کوتاہ بینوں میں ہیں
زندگی بے لذتِ آشوب تو کچھ بھی نہیں　　موج تو دریا میں ہے ہم کیا سفینوں میں ہیں
جلتی شمعوں کا مقدر اور کیا اس کے سوا　　سرد راتوں میں بھی یہ ڈوبی پسینوں میں ہیں
پوچھتی ہیں آج مجھ سے مرے دل کی دھڑکنیں　　ہم لبوں سے پھوٹ نکلیں یا کہ سینوں میں ہیں
ہم اُگیں گے جب تو فصلِ صد ہنر کاٹیں گے لوگ　　آؤ! تخمِ آگہی بن کر زمینوں میں ہیں

آنچ دیں عصری ردیّے تو چٹخ جائیں فضاؔ
اس ادا سے کیا سخن کے تازمینوں میں ہیں

مطبوعات جدیدہ

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین - از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، طباعت خوبصورت ٹائپ، صفحات ۳۲۴ قیمت تحریر نہیں۔ پتہ ؟

اس مفید مشہور اور مقبول کتاب کو خود فاضل مصنف نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا تھا، یہ عربی کا دسواں ایڈیشن ہے، اس کے اردو اور انگریزی کے بھی متعدد ایڈیشن چھپے ہیں، اور فارسی و ترکی میں بھی ترجمے ہو چکے ہیں، معارف میں پہلی دفعہ عربی ایڈیشن تبصرے کے لیے آیا ہے، اس میں فاضل مصنف نے یہ دکھایا ہے کہ اسلام سے پہلے جب خدا پرستی کی تعلیم مفقود اور جاہلیت کا گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا تو دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں کی مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشی، تمدنی اور معاشرتی حالت نہایت ابتر تھی لیکن اسلام نے لوگوں کے افکار و اعمال میں عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا، خدا فراموشی کو خدا پرستی میں تبدیل کر دیا، اور جاہلیت کی تمام خرابیوں کی اصلاح کر کے ایک ایسی امت پیدا کر دی جو نہایت برگزیدہ اور انسانیت کے لیے نمونۂ عمل تھی، لیکن جب اس کا زوال و انحطاط شروع ہوا تو قوموں کی قیادت و امامت اس کے ہاتھوں سے نکل کر ان مغربی قوموں کے ہاتھوں میں آگئی، جنکا نقطۂ نظر تمامتر مادی، نفس پرستی اور خدا بیزاری تھا، اسکے نتیجہ میں پھر وہی پرانی جاہلیت عود کر آئی جس کو اسلام نے بیخ و بن سے ختم کر دیا تھا، مصنف کا بجا خیال ہے کہ یہ نئی جاہلیت علم و تہذیب کے جامہ میں ملبوس اور خوشنما الفاظ اور

نمائشی اصطلاحات کا سہارا لیے ہوئے ہے، اس لئے اس کی تباہی اور نقصانات پرانی جاہلیت سے بھی زیادہ خطرناک ہیں، اس طرح امت مرحومہ کے زوال سے پوری دنیا اور ساری انسانیت اس خیر و برکت سے محروم ہو گئی، جو اسلام لیکر آیا تھا، ع زوال مرد مومن سے زوالِ عالم خاکی۔ فاضل مصنف کے نزدیک موجودہ جاہلیت کی لائی ہوئی مشکلات کا واحد حل یہ ہے کہ دنیا کی قیادت مادہ پرست اور خدا بیزار لوگوں کے بجائے خدا شناس اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھوں میں آجائے، مگر یہ اسی وقت ممکن ہے، جب مسلمانوں کے اندر اپنی اس مجرمانہ کوتاہی کی تلافی کا جذبہ پیدا ہو جو انھوں نے انسانیت کے حق میں کی ہے، اور خود دنیا کو بھی اپنی اس بدقسمتی کا احساس ہو جائے، جس سے اس کو مسلمانوں کی قیادت سے محروم ہو جانے کی بنا پر دوچار ہونا پڑا ہے، چنانچہ وہ مسلمانوں اور اسلامی ملکوں کو عموماً اور عالم عرب کو خصوصاً خدا پرستی، اسلامی تعلیمات اور اخلاق حسنہ سے آراستہ ہو کر دنیا کی اصلاح و قیادت کے لیے کمربستہ ہونے کا پیام دیتے ہیں، ؎

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ معمارِ حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز

یہ کتاب کے اُن مباحث کا مختصر خاکہ ہے، جو اس کے پانچ مبسوط ابواب میں نہایت اخلاص و درد مندی بڑی جامعیت و تحقیق، مکمل تجزیہ استدلال اور پورے جوش بیان کے ساتھ سلیس و شگفتہ زبان اور دلآویز و موثر پیرایے میں قلمبند کئے گئے ہیں، شروع میں مصر کے نامور فضلا ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، سید قطب اور شیخ احمد الشرباصی کے مقدمے ہیں، ان میں کتاب کی خوبیاں اور خصوصیات اور مصنف کے مختصر حالات اور علمی و تصنیفی اور دینی و ملی کارنامے بیان کئے گئے ہیں؛

یادِ یارِ مہرباں ۔ از جناب ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی تقطیع متوسط کاغذ کتابت عمدہ، صفحات ۱۳۰ قیمت ۔ ۱۲/۵۰ ر پتہ ۔ گلستاں پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶

اردو کے ممتاز ادیب وانشا پرداز ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اس مختصر کتاب میں ملک وملت کے مندرجۂ ذیل گیارہ مشاہیر علم وتعلیم اور ناموران ادب وسیاست کا سوانحی خاکہ تیار کیا ہے، سرتیج بہادر سپرو، آصف علی، مرد آزاد (مولانا آزاد) صدیقی مرحوم (صدیق احمد علیگ) مولوی عبدالحق، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا حامد حسن قادری، ذاکر صاحب، سیدین صاحب، راجہ جی اور ڈاکٹر تاراچند فاضل مصنف نے اپنے مخصوص اور دل پذیر انداز بیان میں ان اکابر کی سیرت وشخصیت اور خدمات وکمالات کا نہایت پرکیف اور دلکش مرقع پیش کیا ہے، یہ مضامین پہلے مختلف رسالوں میں چھپے تھے، اب ان کو کتابی صورت میں بڑی نفاست واہتمام سے شائع کیا گیا ہے ہر مضمون میں رعنائی خیال کے ساتھ رنگینی بیان اور حسن ادا بھی ہے، عبارت، اشارت اور کنایت کا ماہرانہ انداز بھی، خواجہ صاحب کے قلم کی خوبی سے یہ سوانحی خاکے ادب وانشا کا گلدستہ بن گئے ہیں۔

نذیر احمد شخصیت اور کارنامے ۔ مرتبہ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۴۰۸ مجلد مع گردپوش قیمت ۷۵ روپئے پتہ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔

زیر نظر کتاب وہ تحقیقی مقالہ ہے۔ جس پر ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی لکچرر شعبۂ اردو شبلی ڈگری کالج اعظم گڈھ کو گورکھپور یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی تھی، اس میں ڈپٹی نذیر احمد کے حالات وکمالات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، یہ چھ ابواب کا مجموعہ ہے،

شروع کے دو ابواب میں نذیر احمد کے حالات اور شخصیت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، ان کی شخصیت پر دلی کالج اور علی گڑھ تحریک کا بھی اثر تھا، اس لئے ان اداروں کی سرگزشت بھی بیان کی گئی ہے، اور اسی ضمن میں اردو نثر کی مختصر تاریخ بھی تحریر کی گئی ہے، تیسرے باب میں اردو میں قصہ گوئی کا جائزہ لیکر ناول کے اجزائے ترکیبی اور نذیر احمد کی ناول نگاری کا پس منظر بیان کیا گیا ہے، چوتھے اور پانچویں باب میں ان کے ناولوں پر مفصل تبصرے کرکے ناول نگاری میں ان کا درجہ متعین کیا گیا ہے، آخری باب میں ان کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے، جو انھوں نے انگریزی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کیں، اسی حصہ میں مذہبی کتابوں پر بھی تبصرہ ہے، آخر میں ان کے اسلوب تحریر اور زبان و بیان کے محاسن تحریر کئے گئے ہیں، مصنف نے بعض نقادوں کی رایوں سے کہیں کہیں اختلاف کیا ہے جن سے توازن کا اظہار ہوتا ہے، نذیر احمد کی کتابوں پر ان کے تبصرے بھی بڑی حد تک معتدل ہیں، لیکن امہات الامہ کی خامیوں کو صرف زبان و بیان ہی تک محدود کرنا اور اسکو جدید مذہبی تحقیق کی بنیاد قرار دینا (ص ۱۱) مذہبی معلومات کی کمی کا نتیجہ ہے، بعض مباحث جیسے قصہ گوئی کا ارتقا، ناول نگاری اور علی گڑھ تحریک کے پس منظر اور تصنیفات پر تبصروں کی تمہید میں غیر ضروری طوالت سے کام لیا گیا ہے، غیر معروف ناموں جیسے عبدالخالق و عبدالقادر (ص ۲۰) اور حاجی امداد العلی (ص ۸۴) پر مختصر تشریحی حواشی لکھنے کی ضرورت تھی، کہیں کہیں طرز ادا اور طریقۂ تعبیر میں بھی خامی پائی جاتی ہے، سید احمد شہید بریلوی کے متعلق "ہیجانی کیفیت" (ص ۴۰) سرسید احمد خان مرحوم کے بارہ میں "بے ہنگم پن" (ص ۵۰) منشی ذکاء اللہ مرحوم کے لیے "صفحات کالے کئے" (ص ۸۰) ڈاکٹر احسن فاروقی کے بارہ میں "اپنا مطلب توسیدھا کرلیا" (ص ۱۱۰) اور مذہبی حلقوں کی تحقیر کے لیے "کٹھ ملاؤں" اور "ملائیت" وغیرہ کی پھبتی

شائستگیٔ تحریر کے خلاف ہے، دست وگریباں کو غلطی سے دست وگریباں (ص ۲۸) پیش یا افتادہ کو پیش افتادہ (ص ۹۰) طلاق وخلع کو طلاق وخلا (ص ۲۶۰) ماخوذ ہیں کو ماخوذ کی گئیں (ص ۲۹۶) اور شمس الائمہ سرخسی کو سرحسن (ص ۳۳۱) لکھا گیا ہے، یہ مصنف کی ابھی پہلی تصنیف ہے اسلئے اس طرح کی فروگذاشتوں کا رہ جانا قابل تعجب نہیں، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، جس کا اندازہ کتابیات کی طویل فہرست سے بھی ہوتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے کارنامے اظہرمن الشمس ہیں، وہ ان اساطین خمسہ میں ایک تھے جنھوں نے اردو نثر کا معیار بلند کرنے میں اہم حصہ لیا ہے، اس لئے ان پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کی ضرورت تھی، مصنف نے یہ کتاب لکھکر اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

جرس کارواں - از جناب عمر انصاری صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۹۴ مجلد مع رنگین گردوپوش، قیمت عہ پیسے ناشر مکتبہ فردوس ادب ۲۰۰ امین آباد پارک لکھنؤ۔

جناب عمر انصاری ممتاز پختہ مشق شاعر ہیں، یہ انکی نظموں کا ایک مختصر مجموعہ ہے، اس میں وطن کی عظمت وشوکت کا نغمہ اور اتحاد ویکجہتی کا درس بھی ہے، فرقہ آرائی، طبقہ داریت تفریق وامتیاز اور ذات پات وغیرہ کی مذمت بھی ہے، ایک نظم میں اردو کی گذشتہ شاندار تاریخ اور موجودہ دور میں اسکی مظلومیت بیان کی گئی ہے، اور دوسری میں گاندھی جی کے ایثار وقربانی کا ذکر ہے، اس مجموعہ کی زیادہ موثر اور کامیاب نظم "دہر آشوب" ہے، جو دراصل موجودہ دور کی ذہنی، اخلاقی اور تہذیبی پستی کا نوحہ ہے، یہ مجموعہ مصنف کی قادرالکلامی کے علاوہ ان کی قوم پروری اور حب الوطنی کا نمونہ بھی ہے۔

شیخ احمد عبدالحق ردولوی رح مرتبہ جناب شاہ معین احمد صاحب

منظر فاروقی، متوسط، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۰۰، قیمت عہ
مصنف سے قصبہ رودلی، ضلع بارہ بنکی سے ملے گی۔

حضرت مخدوم احمد عبدالحق رودلویؒ آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مشہور بزرگ گذرے ہیں۔ ان کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے، مگر اس سے تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوتی ہیں، اس لیے ابھی تک ان کی کوئی مبسوط سوانح عمری نہیں لکھی گئی ہے، زیر نظر کتاب میں ان کے حالات و کمالات سیرت و اخلاق، سیر و سیاحت، طریقۂ رشد و اصلاح کے علاوہ بعض ممتاز خلفا اور ان کے سلسلہ کے کئی نامور بزرگوں کا مختصر تذکرہ ہے، خانقاہ اور عرس کی مروجہ رسموں اور طریقت و خاندان کے شجرے بھی تحریر کیے گئے ہیں، آخر میں مخدوم صاحب کے خاندان کے موجودہ صدی کے بعض نامور اشخاص کا مختصر حال دیا گیا ہے، مصنف اسی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں اس لئے اس میں عقیدت مندانہ رنگ زیادہ نمایاں ہو گیا ہے، گو اس کتاب کے سب واقعات کو مستند نہیں کہا جا سکتا، تاہم مخدوم صاحب اور ان کے سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے بارہ میں جو مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں، ان سے آیندہ سوانح نگار کو مستند اور غیر مستند باتوں کی چھان بین میں مدد مل سکتی ہے۔

آئینے کے سامنے ا۔ مرتبہ۔ جناب مبشر علی صدیقی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۱۰۶ قیمت للعہ پتہ مبشر علی صدیقی۔ گلی وحید بخش محلہ سوتھ بدایوں۔

جناب مبشر علی صدیقی کے پندرہ ۱۵ ہلکے پھلکے ادبی و تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں سر سید احمد اور ان کے ہمعصر دوسرے نامور مصنفین مولانا شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی اور عبدالحلیم شرر کے ادبی پہلوؤں پر چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں، اسی حصہ میں اقبال کے فلسفہ و شاعری کے متعلق ایک دلچسپ مکالمہ بھی ہے، دوسرے حصہ میں مصنف نے اپنے وطن بدایوں کے بعض شاعروں اور وہاں کے نظامی پریس سے شائع ہونیوالے ادیوان غالب کے مختلف ایڈیشنوں کی خصوصیات تحریر کی ہیں، تیسرے حصہ میں بعض نئی ادبی کتابوں پر ریویو ہیں مصنف کی تحریر میں متانت اور خیالات میں توازن ہے، اور یہ مضامین طلبہ کے استفادہ کے لائق ہیں۔ ض،،

مختصر فہرست کتب

سلسلہ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

دین رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے۔ وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت دس روپے شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکت خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبدالسلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالات زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آ گئے ہیں، قیمت :- ۶ روپیہ ۲۵

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریزی کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت :- ۱۲ روپے پچیس پیسے،

مؤلفہ:۔ قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

ہماری نئی کتب

حیات سلیمان

حیات سلیمان جس کا شائقین کو شدت سے انتظار تھا، بحمد اللہ چھپ کر شائع ہو گئی یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ داستان عمری ہی نہیں ہے، بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک پھیلا تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی و علمی و ادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک جنگ آزادی، مسئلۂ ملکیت حجاز، انہدام مقابر و آثار حجاز وغیرہ کی بھی مختصر تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دار المصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترک قیام دار المصنفین، سفر بھوپال، ہجرت پاکستان، اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انہوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر وفد کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ، پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بھی مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنیٰ ہے۔ ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ،

قیمت ۱۷ روپے

مؤلفہ:- شاہ معین الدین احمد ندوی

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۰۰   ستمبر ۱۹۷۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن   عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب تبلہ

مجلس ادارت

۱- مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

۲- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھنؤ

۳- مولانا محمد اویس نگرامی ندوی لکھنؤ

۴- مولانا ضیاء الدین اصلاحی

(مرتبین)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ⁂ عبدالسلام قدوائی ندوی

بزم تیموریہ جلد اول

بزم تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امراء، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء و فضلاء و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیر ترتیب ہے،

قیمت:- ۱۴ چودہ روپیے ۵۰

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۱۶ ماہ ستمبر ۱۹۷۵ء مطابق ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ عدد ۳

مضامین

شذرات	عبدالسلام قدوائی ندوی	۱۶۲-۱۶۴

مقالات

دیار پورب کا تیسرا علمی دور	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی	۱۶۵-۱۸۶
مولانا شمس الحق عظیم آبادی،	جناب مولوی محمد عزیر صاحب مرکزی دارالعلوم بنارس،	۱۸۷-۲۰۳
جرأت حق گوئی	محمد نعیم ندوی صدیقی	۲۰۴-۲۱۶
ایک ہندوستانی شاعر حافظ کے دیوان کا ایک نادر مخطوطہ،	جناب کبیر احمد جائسی شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی،	۲۱۷-۲۳۰

بَابُ التَّقرِیظِ وَالاِنتِقَاد

کتاب النبات	محمد نعیم صدیقی	۲۳۱ - ۲۳۷
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۲۳۸ - ۲۴۰

شذرات

اس وقت ملک ایک بڑے انقلاب کے دور سے گذر رہا ہے، حالات جس تیزی سے بدلے اور بدلتے جا رہے ہیں، اس کا چند برس پہلے کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا، بڑے بڑے جہاندیدہ اور دور بین مبصّروں نے آیندہ واقعات کا جو تصوّر قائم کیا تھا، وہ بالکل بے حقیقت ثابت ہوا، ماضی میں لگائے ہوئے اندازے ایسے بدل گئے کہ پرانے نقشے تقویم پارینہ معلوم ہونے لگے، حالات برابر نیا رنگ اختیار کرتے جا رہے ہیں، اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل کیا ہوگا، ملک کی تعمیر نو کا پورا نقشہ تو ابھی سامنے نہیں آیا ہے مگر آہستہ آہستہ جو خطوط ابھر رہے ہیں، اُن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبدیلیوں کا یہ سلسلہ ابھی جاری رہے گا، معیشت و سیاست اور تہذیب و معاشرت کی نئی طرحیں پڑیں گی، اور قدم برابر جدید سے جدید تر کی طرف اٹھتے رہیں گے، ماضی کی یادیں کتنی ہی خوشگوار اور عہد رفتہ کے نظارے کیسے ہی مسرّت افروز ہوں، ہمارا دل کتنا ہی چاہے کہ لیت الزمان یعود اور ہم عمر رفتہ کو کتنی ہی آوازیں دیں لیکن اب نہ پرانی غزل چھڑ سکتی ہے، نہ ساز کہن ہاتھ میں دیا جا سکتا ہے،

اس عہد انقلاب میں یوں تو ملک کے سبھی باشندوں کو اپنے حالات کا جائزہ لینا ہے، لیکن مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اس صورت حال پر غور کرنا ہے کہ ان کے لئے قیادت میں تبدیلی، اور پارٹیوں کا ردّ و بدل بے سود ہے، وہ تمام سیاسی جماعتوں کا تجربہ کر چکے ہیں، انھیں اچھی طرح یہ معلوم ہو چکا ہے کہ "الف" ہو یا "ب" "ج" ہو یا "د" ان میں کوئی اُن کے درد کی دوا نہیں ہے، انھوں نے مختلف پارٹیوں کا ساتھ دیا، بہتوں کو تخت حکومت تک پہنچایا، بہتوں کے جلوس نکالے، اور اُن کی شان میں قصیدے پڑھے

لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا، وہ پیاس کی شدت میں چلتی ہوئی ریت کی طرف دوڑتے رہے لیکن سمراب سے پیاس کہاں بجھ سکتی تھی، اُن کی حلق سوکھتی رہی، اور جان لبوں پہ آگئی، مگر اُن کے نام نہاد دوستوں نے پانی کی ایک بوند بھی اُن کی حلق میں ٹپکانے کی کوشش نہیں کی۔

......

پُرانے زمانہ میں جب کسی کو کوئی جلوس نکالنا ہوتا تھا، تو فیل خانہ سے ہاتھی نکال کر لائے جاتے تھے، اُن پر زرتار جھولیں ڈالی جاتی تھیں تاکہ اِن کے جُلوس کی شان بڑھے، اور اس کی رونق دوبالا ہو جائے، مگر جب جلوس نکل چکتا تھا تو زریں جھولیں اور مرصع عماریاں اتار کر انھیں پھر فیل خانہ میں بند کر دیا جاتا تھا یہی سلوک مسلمانوں کے ساتھ مختلف پارٹیوں کا رہا ہے، اُن سے اپنے جلوس کی رونق سب نے بڑھائی ہے لیکن اس کے بعد پھر کسی نے اُن کی خبر نہیں لی، شاعروں کے روایتی معشوق تو قتل کے بعد جفا سے تائب ہو جاتے تھے، مگر ان سیاسی محبوبوں کو کبھی اس کی بھی توفیق نہیں ہوئی، ہماری وفا خطا سمجھی گئی، اور ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی رہی، غالب نے تو انداز گفتگو کی شکایت بھی کی تھی، مگر ہم نے تسلیم و رضا کی خو نہیں چھوڑی، اور گالیاں کھا کر بھی بدمزہ نہ ہوئے، مگر مزاج یار ہمیشہ برہم ہی رہا،

......

ماضی کے یہ تجربے ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں، عقل کا تقاضا ہے کہ ہم خود اپنے حالات پر غور کریں، گزشتہ تجربوں سے فائدہ اٹھائیں، زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھیں، وقت کے تقاضوں کو سمجھیں، طوفان کی شدت کا اندازہ کریں، اور منجدھار میں ڈالنے سے پہلے اپنی کشتی کے کل پرزوں کو دیکھ لیں، اس کے تختوں کو ٹھونک بجا کر پرکھ لیں، اور خوب سوچ سمجھ کر ایسا فیصلہ کریں کہ ہمارا حال بہتر ہو جائے، اور ہم اپنی آئندہ نسلوں کو اس سے بہتر مستقبل کا یقین دلا سکیں،

ہیں مادی خوشحالی اور فارغ البالی بھی درکار ہے اور دماغی سکون و اطمینان بھی لیکن اگر ہم ایک باعزت اور پُر وقار قوم کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی خودی کی نگہبانی کرنا پڑے گی، اور دریوزہ گری کی وہ خو چھوڑنا پڑے گی، جو مدتوں سے ہمارا شعار ہے، عرصہ سے ہم نے اپنے آپ کو نیلامی مال بنا رکھا ہے، کہ جو زیادہ بولی بول دے، لے جائے، ہمیں اب یہ طرز عمل ترک کرنا چاہئے، حقوق نہ مانگنے سے ملتے ہیں، نہ دستاویزوں سے اُن کی حفاظت ہوتی ہے، ہمیں اپنے اندر وزن پیدا کرنا چاہئے، راکھ کے ڈھیر ہوا کے ایک جھونکے میں اُڑ جاتے ہیں، لیکن طوفانی جھکڑ بھی چٹانوں میں جنبش نہیں پیدا کر سکتے ہیں، ہمیں گنتی کے پھیر میں نہیں پڑنا چاہئے بلکہ اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کرنے چاہئیں کہ محبوب خلائق اور سرتاج عالم بن جائیں۔

معارف کے قارئین مولانا ابو الوفا افغانی کے نام اور کام سے بخوبی واقف ہیں، اُن کی پیدائش افغانستان میں ہوئی، لیکن تعلیمی مراحل ہندوستان میں طے ہوئے، اور یہاں کے باکمال اساتذہ سے استفادہ کیا، زندگی کا بڑا حصہ حیدرآباد میں گزرا، عرصہ تک مدرسہ نظامیہ میں مدرس رہے، فقہ حنفی سے خاص مناسبت تھی، اور امام ابوحنیفہ، ان کے تلامذہ اور ائمہ احناف سے بڑی عقیدت تھی، لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ اُن کی اس عقیدت کی گواہ ہے، انھوں نے قاضی ابو یوسف، امام محمد اور شمس الائمہ سرخسی کی کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کیں، بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ مختلف نسخوں کا مقابلہ کیا، جانکاہی کے ساتھ ان کی تصحیح کی، حواشی لکھے اور نہایت حسن وخوبی کے ساتھ طباعت کا انتظام کیا، وہ پرانے مدرسوں کے پڑھے ہوئے تھے لیکن نئے محققین بھی اُن کا لوہا مانتے تھے، افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ علم وتحقیق کی یہ شمع خاموش ہوگئی، اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے، اور اُن کے بیش بہا کاموں کے جاری رکھنے کا انتظام فرمائے۔

مقالات

دیار پورب کا تیسرا علمی دور

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، اڈیٹر البلاغ، بمبئی

دیار پورب کا تیسرا علمی دور قیام سلطنت تیموریہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء سے ۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۸ء تک ہے، اس دو سو سالہ مدت میں ہندوستان کے مختلف دیار و امصار کی طرح دیار پورب میں بھی بہت سے علمی و دینی مرکز پورے انبساط و نشاط کے ساتھ اپنے حلقوں میں کام کرتے رہے، کہنا چاہئے کہ گذشتہ دونوں ادوار کے حسنات و برکات تیسرے دور میں پوری طرح کھل کر سامنے آگئے تھے، اور اس دیار کے قصبات و قریات علم و علماء کی کثرت اور سرگرمی کی وجہ سے ہرات و نیشاپور معلوم ہوتے تھے، اور اس دور کے پانچویں سلطان شہاب الدین محمد شاہ جہاں کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ "پورب شیراز ماست"۔

تیموری سلطنت کا قیام اس سے پہلے لودھی دور مختصر ہونے کے ساتھ بڑا پُرفتن تھا، پورے ملک میں جگہ جگہ راجے، مہاراجے اور زمیندار سر اٹھا رہے تھے، آخر میں خود لودھی حکمرانوں میں اندرونی انتشار و خلفشار اور طوائف الملوکی حالت برپا تھی، آخری بادشاہ ابراہیم لودھی کے دور میں یہ سلطنت تقریباً دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی، اس کے بھائی جلال الدین

لودی نے جونپور میں اپنی حکومت قائم کرلی تھی، اور ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ پچاس سال کے بعد جونپور میں شرقی سلطنت کی طرح ایک نئی سلطنت قائم ہونے والی ہے۔ مگر سلطان ابراہیم لودی نے جلال الدین لودی سے جنگ کرکے اس کو گوالیار بھاگنے پر مجبور کردیا، اور بعد میں گرفتار ہوکر قتل کردیا گیا،

بھائی کے فتنے سے نجات پانے کے بعد سلطان ابراہیم لودی کو بابر سے مقابلہ کرنا پڑا، جس نے پانی پت کے میدان میں اسے شکست دے کر ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء میں تیموری سلطنت کی بنیاد رکھی، جسے مغل سلطنت بھی کہتے ہیں، دہلی پر تیموری قبضہ کے بعد دیار پورب بھی اس کے زیر تصرف آگیا، اور اسی دور سے گویا یہ علاقہ شیراز ہند بن گیا، تیموری سلطنت کے اقبال مند سلاطین جن کے دور میں علم وفن کی بہار شباب پر رہی، یہ ہیں، (۱) ظہیرالدین محمد بابر متوفی ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء (۲) نصیرالدین محمد ہمایون متوفی ۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء، (۳) جلال الدین محمد اکبر متوفی ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء (۴) نورالدین محمد جہانگیر متوفی ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء (۵) شہاب الدین محمد شاہجہاں متوفی ۱۰۹۸ھ/۱۶۶۶ء، (۶) محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر متوفی ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء

(۷) شاہ محمد معظم بہادر شاہ ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۱ء، (۸) محمد معز الدین جہاندار شاہ الخ

سلطان محمد عالمگیر کے بعد اگرچہ اس خاندان میں کئی بادشاہ گذرے ہیں مگر انکی حیثیت دور خزاں کے بے رنگ و بو پھولوں کی ہے، ہر دور سلطنت میں دیار پورب پر اسکے کسی ایک بادشاہ نے خصوصی توجہ دیکر اسے گلزار علم بنایا، مگر تیموری دور میں دو بادشاہوں نے یہاں کے چمن کی رکھوالی کی جس طرح تغلق دور میں سلطان فیروز شاہ تغلق، شرقی دور میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی اور لودی دور میں سلطان سکندر شاہ لودی اس بارے میں نمایاں ہیں، اسی طرح تیموری دور میں یہ سہرا سلطان جہانگیر اور سلطان شاہجہان

دونوں کے سر ہے،

واضح ہو کہ صوبہ الہ آباد، اور صوبہ اودھ اور صوبہ عظیم آباد تینوں کے مجموعہ کو ملک پورب کہا جاتا تھا اور تینوں علاقوں میں مسجدیں، مدارس، خانقاہیں، ارباب علم وفن اور علماء و مشائخ سے آباد تھیں، البتہ ان میں صوبۂ الہ آباد اور صوبہ اودھ تیموری عہد میں جداگانہ شان رکھتے تھے، پھر ان دونوں میں صوبۂ اودھ کو نمایاں حیثیت حاصل تھی،

پورے تیموری دور میں دیار پورب کی علمی سرگرمی کا نقشہ مولانا غلام علی آزاد نے ان الفاظ میں کھینچا ہے، ان کو اس دور کا آئینہ کہنا چاہئے،

واما صوبہ اودھ وصوبہ الہ آباد خصوصیتے
اودھ اور الہ آباد کے دونوں صوبے خصوصی

دارد کہ در ہیچ صوبہ نتوان یافت، چہ تمام قلمرو
حیثیت رکھتے ہیں، جو کسی اور صوبہ میں

اودھ واکثر صوبہ الہ آباد بہ فاصلہ پنج کروہ
نہیں مل سکتی ہے، کیونکہ پورا صوبہ اودھ

نہایت دہ کروہ تخمیناً آبادیٔ شرفاء ونجباءٔ
اور صوبہ الہ آباد کا اکثر علاقہ پانچ وس کوس

است کہ از سلاطین وحکام وظائف و
کے فاصلہ میں شرفاء کی آبادی پر مشتمل ہے،

زمین مدد معاش داشتہ اند ومساجد ومدارس
جو سلاطین وحکام کی طرف سے وظائف

وخانقاہات بنا نہادہ ومدرسان عصر در
اور جاگیر رکھتے ہیں، اور ان میں مسجدوں

ابواب علم بروئے دانش پژوہان کشادہ
مدرسوں اور خانقاہوں کی کثرت ہے، ہر جگہ

وصدائے "اطلبوا العلم" در دادہ، و طلبہ
مدرسین ومعلمین طلبۂ علوم کے لئے اپنے دروازے

خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند وہر جا
کھلے رکھتے ہیں، اور ان کو علم کی دعوت دیتے

موافقت دست بہم داد بہ تحصیل مشغول
ہیں، جس کے سبب طلبۂ علوم جماعت در جماعت

می شوند، وصاحب توفیقان ہر معمورہ
ایک بستی سے دوسری بستی میں آتے جاتے ہیں،

طلبۂ علم را نگاہ می دارند، و خدمت این جماعت را سعادت عظمیٰ می دانند صاحب قران ثانی شاہجہان انار اللہ برہانہ می گفت،

"پورب شیراز ماست"[1]

اور ہر جگہ سکون و اطمینان سے علم حاصل کرتے ہیں، ہر بستی کے مستطیع لوگ طالب علموں کا پورا پورا خیال کرتے ہیں، اور ان کی خدمت کو سعادت عظمیٰ سمجھتے ہیں، اس لیے شاہ جہان بادشاہ کہا کرتے تھے کہ پورب ہمارا شیراز ہے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل دور میں پورا ملک پورب بشمولیت صوبہ الہ آباد وصوبہ اودھ وصوبہ عظیم آباد، علم و علماء سے معمور تھا، لیکن صوبہ الہ آباد اور اودھ کی علمی و دینی رونق کچھ اور ہی تھی، خاص طور سے صوبہ اودھ معدن علم و فن اور مرکز علماء و فضلاء تھا،

آزاد بلگرامی کے اس بیان سے دیار پورب اور اطراف جونپور کی عام علمی و دینی سرگرمی اور عام مسلمانوں کے علمی و دینی ذوق و شوق کا پتہ چلتا ہے، اور مولانا خیرالدین محمد جونپوری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل سلاطین امراء اور شاہزادے اس دیار کی علمی سرگرمی سے کس قدر دلچسپی رکھتے تھے، اور علمائے پورب سے ان کو کتنی عقیدت و محبت تھی، وہ لکھتے ہیں۔

القصہ شہر جونپور از عہد سلطان فیروز شاہ تا آخر سلطنت محمد شاہ کہ خاتم السلاطین است، در ہر طبقہ مجمع فضلاء و مرجع طلبہ بود، پیوستہ فرامین سلاطین بحکام جونپور جہت تعظیم و توقیر علماء و مشائخان می رسید

شہر جونپور سلطان فیروز شاہ کے عہد سے لیکر خاتمۃ السلاطین محمد شاہ کی سلطنت تک ہر طبقہ کے فضلاء کا مجمع اور طلبہ کا مرجع تھا، علماء و مشائخ کی تعظیم و توقیر کیلئے سلاطین زمانہ کے فرامین حکام جونپور کے

[1] مآثر الکرام ج ۱، ص ۲۲۱ و ۲۲۲،

صدر، و بخشی جہت محافظت مدد معاش
وحفظ مرتبہ آن بزرگان مامور می گردیدند،
وقائع نگار کہ از حضور سلاطین جہت ترقیم
سوانح جونپور مقرر می شدند، در ہر مدرسہ
وخانقاہ حاضر شدہ کوائف ہر مدرسہ و خانقاہ
دریافتہ می نوشتند بادشاہانِ عہد بعد ادراک
مداخل و مخارج ہر مدرسہ و مشائخ بقدر حال
وے در وظائف و تعطاعات او می افزودند
شاہزادہا و امرا کہ ازیں طرف می
گذشتند صرف برائے استرضائے سلاطین
معتقدانہ در ہر مدرسہ و خانقاہ حاضر می شدند
و نذرِ فراوان می گذرانیدند،[1]

پاس پہونچا کرتے تھے، ان بزرگوں کے
درجات و مراتب اور معاشی امداد کی حفاظت
کے لیے صدر، اور بخشی مقرر کیے جاتے تھے،
جو وقائع نگار سلاطین کی طرف سے جونپور
کے حالات لکھنے پر مامور ہوتے تھے، وہ
ہر مدرسہ اور خانقاہ میں خود حاضر ہو کر
ان کے حالات خود معلوم کرتے اور لکھتے
تھے، اور سلاطین ہر مدرس اور مرشد کے آمد
خرچ کی تفصیل معلوم کر کے ان کے وظائف
اور جاگیر میں بقدر ضرورت اضافہ کرتے
تھے، نیز جو شاہزادے اور امرار اس دیار
سے گذرتے تھے، بادشاہوں کی خوشنودی
کے لیے ہر مدرسہ اور خانقاہ میں حاضر ہو کر
زیادہ سے زیادہ نذر پیش کرتے تھے،

اس بیان کا لفظ لفظ بتا رہا ہے کہ تیموری سلاطین وامرار اور شاہزادے اس دیار کے گلشنِ علم و فضل کو اپنی بے حساب محبت و عقیدت سے پر بہار رکھتے تھے، اور ان کے دور میں یہ علاقہ واقعی دارالعلم والعلماء تھا، اب ہم ہر تیموری بادشاہ کے دور میں پورب خاص طور سے اودھ اور اطراف جونپور کی علمی سرگرمی کو بیان کرتے ہیں، اور مختصر طور سے اس کا جائزہ لیتے ہیں،

[1] تذکرۃ العلماء، ص ۵

جس میں زیادہ مثالین علماء و سلاطین کے باہمی تعلقات کی ہیں،

سلطان محمد بابر (۹۳۲ھ تا ۹۳۷ھ / ۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۰ء) تیموری سلطنت کا بانی دموسس بابر شاہ جمادی الاخری ۹۳۲ھ میں سلطان ابراہیم لودی کو قتل کرکے خود بادشاہ بنا، وہ کامیاب حکمران اور سیاست دان ہونے کے ساتھ نہایت ستھرا علمی ذوق رکھتا تھا، اور علوم و معارف کا قدردان تھا، فارسی اور ترکی کا شاعر تھا، اس نے متعدد کتابیں لکھیں، تصوف کی ایک کتاب منظوم کی، تزک بابری لکھی اور فقہ حنفی میں مُبَیَّن کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کی شرح شیخ زین الدین خانی نے مُبَیَّن کے نام سے تحریر کی، علاقہ ترکستان کے مہاجرین سے معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب آج بھی تاشقند اور دیگر بلادِ ماوراء النہر میں پڑھائی جاتی ہے، اس نے خط بابری ایجاد کیا اور اسی خط میں قرآن شریف لکھکر مکہ مکرمہ روانہ کرتا تھا، سات سال حکومت کرکے جمادی الاولی ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء میں فوت ہوا، بابر اور ہمایوں کے دور کے علماء مُخضرم الدَّولتَین تھے یعنی انھوں نے لودی اور تیموری دونوں سلطنتوں کو پایا تھا، اور حکومتوں کے انقلاب و تغیر میں ان کی بزم علم و مشیخت برابر قائم رہی، ساتھ ہی بابر شاہ ان کی طرف سے غافل نہیں رہا، اور پورے ملک کے علماء و مشائخ کی طرح بلادِ پورب کے اہل علم و فضل بوقت ضرورت اسکی نگاہ التفات کے مستحق بنے، چنانچہ مفتی آدم بن محمد حنفی گوپامئو متوفی ۱۰۱۱ھ کو بابر شاہ نے ایک گاؤں جاگیر میں دیکر معاش کی طرف سے بے فکر کردیا تھا، مفتی آدم نے جونپور میں شیخ معروف بن عبدالواسع حسینی جونپوری سے علم و طریقت کی تعلیم پائی اور گوپامئو میں رہ کر افتاء و تدریس میں زندگی بسر کی، ابتداء ہی میں بابر شاہ نے ان کو جاگیر دیکر دینی اور علمی خدمت کے لئے فارغ کردیا تھا،[1]

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲

سلطان محمد ہمایوں ۹۳۷ھ تا ۹۶۳ھ (۱۵۳۰ء تا ۱۵۵۶ء) بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں بادشاہ ہوا، اس نے اولین فرصت میں جونپور کو محمود لودی کے قبضہ سے نکال کر اپنی سلطنت میں شامل کیا، اور کہنا چاہئے کہ اس کے بعد یہ علاقہ تیموری سلطنت کا باقاعدہ حصہ بنا، اس مہم کے لیے ہمایوں خود جونپور گیا، ۹۴۶ھ میں بہار گیا، اور شیر خان سے جنگ میں ناکام رہا، ۹۴۷ھ میں اس کے مقابلہ میں دوبارہ ہزیمت اٹھائی، اور لاہور، سندھ، ہرات، مشہد ہوتا ہوا قزوین جاکر طہماسپ شاہ صفوی سے مدد چاہی۔

اسوقت تک تیموری سلطنت پر پندرہ سال گذر چکے تھے، اور یہاں علماء و فضلاء اور مدارس کی کثرت کا یہ حال تھا کہ ان کے تذکرہ سے شیراز و اصفہان کے علماء و فضلاء کا ستارۂ اقبال چمک اٹھا، مولوی خیر الدین محمد نے جونپور نامہ اور تذکرۃ العلماء میں ملا محمد اصفہانی کی کتاب سیر الملوک کے حوالہ سے لکھا کہ

شہنشاہ ایران طہماسپ مرحوم از سلطان الہند ہمایوں، اور تحسین ملاقات از فضلائے جونپور پرسید، دبادراک کثرت وانبوہ علماء دران دیار بر ویرانیٔ شہر شیراز متحیر گردیدہ ہماں روز کارپردازان سلطنت جہت تاسیس مدارس شیراز و تعظیم وتوقیر علمائے آں شہر فرمان داد، در شہر اصفہان دحوالی آں نیز مدارس وخانقاہات بنا نمود او علماء را تعلیم وتدریس طالبان مامور فرمود[1]

سلطان ہند ہمایوں سے شہنشاہ ایران طہماسپ نے پہلی ہی ملاقات میں فضلائے جونپور کے بارہ میں سوال کیا، اور وہاں کے علماء کی کثرت کو معلوم کرکے شیراز کی ویرانی پر حیران ہوگیا اور اسی دن کارکنان سلطنت کو اس شہر کے مدرسوں کی تاسیس اور وہاں کے علماء کی تعظیم وتوقیر کا فرمان جاری کیا، اصفہان اور اسکے اردگرد کے مقامات میں بھی اس نے مدرسوں اور خانقاہوں کی تعمیر کرکے علماء کو درس وتدریس پر

[1] تذکرۃ العلماء ص ۲۴ و جونپور نامہ قلمی ص ۴ (دار المصنفین اعظم گڈھ)

دیارجونپور کی یہ علمی و دینی بہار شرقیوں اور لودیوں کے ادوار سے گذر کر تیموریوں کے دور میں آئی تو اس قدر پر کیف اور وجد آفریں تھی کہ قزوین و شیراز اور اصفہان تک اسکی نسیم جان فزا پہونچی اور ان مقامات کے خزاں رسیدہ گلستانوں میں تازہ دم بہار آگئی، اس دوران میں حکومتوں کے تخت و تاج بدلتے رہے، مگر مدرسوں اور خانقاہوں کے خاک نشینوں کی بوریا۔۔۔ کی بزم سجی رہی، ہمایوں کا بیشتر زمانہ حریفوں سے نبرد آزمائی میں گذرا حتیٰ کہ اسے ایک بار ہندوستان چھوڑکر ایران جانا پڑا، مگر اس کے علماء و فضلاء اپنے دار الامان اور دار العلم میں پوری جمعیت خاطر کے ساتھ اپنے اعمال و وظائف میں مشغول رہے۔

ہمایونی دور میں دیار پورب میں کئی ایسے علماء و مشائخ آباد ہوئے جن کے خانوادوں میں صدیوں تک علم و فضل اور علماء و فضلاء کی رونق رہی، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میر علی عاشقاں سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ (میر سید علی بن قوام الدین) اسی دور میں علاقہ سرہند کے مقام سوانہ سے آکر یہاں آباد ہوگئے، اور اپنے نام سے ایک بستی سرائمیر (اعظم گڈھ) بسائی، جس کا اصل نام مرتضیٰ پور ہے، یہیں فوت ہوئے اور یہیں دفن کیے گئے، ان کے خاندان میں مشیخت کا سلسلہ آخری دور تک چلتا رہا۔

اسی زمانہ میں خانوادہ حامدیہ چشتیہ کے چشم و چراغ راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد مانک پوری متوفی ۲ شوال ۹۶۵ھ نے مبارکپور (اعظم گڈھ) کو اپنے نام سے آباد کیا، اس خاندان کے مشائخ بھی مدتوں اس دیار میں رشد و ہدایت کی خدمت انجام دیتے رہے

میر علی عاشقان سرائمیری کے مرید و خلیفہ شیخ مبارک بن خیرالدین ظفرآبادی نے ماہل میں بود و باش اختیار کرکے اس کے قریب خیرالدین پور گادمن آباد کیا۔

میر علی عاشقان سرا میری کے دوسرے مرید و خلیفہ قاضی حبیب اللہ بن احمد عثمانی اصفہانی گھوسی (اعظم گڑھ) کے قاضی مقرر ہوئے، جہاں ان کی اولاد میں کئی علماء پیدا ہوئے،

اسی دور میں چریا کوٹ (اعظم گڑھ) کا نام دینی و علمی تاریخ کے صفحہ پر نظر آتا ہے، شیخ عبد الحق دہلوی نے اخبار الاخیار میں شیخ یوسف چریا کوٹی کا ذکر کیا ہے، جو سلسلہ شطاریہ کے درویش تھے، گیارہویں صدی میں ان کی اولاد دوآبہ کے درمیان آباد تھی، اس کے بعد ہی سے چریا کوٹ حکمت و ادب کا گہوارہ بنا اور آخری دور تک یہاں سے مشاہیر پیدا ہوتے رہے۔

ہمایونی دور میں قاضی خان ظفر آبادی متوفی ۹۹۰ھ علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے، شیخ حسن بن طاہر جونپوری کے مرید و خلیفہ تھے، ان کی قناعت پسندی اور بے نیازی کا یہ حال تھا کہ سلطان ہمایوں نے ہر چند التماس کی کہ کچھ نذرانہ اور عطیہ قبول کر لیں، مگر قاضی صاحب نے سلطانی پیش کش کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

از خدا خواہم و از غیر نخواہم کہ نیم بندۂ غیر و نہ خدائے دگر ست

اور جب ان کے بڑے صاحبزادے شیخ عبد اللہ کے نام معافی کا فرمان آیا، تو یہ کہہ کر انھوں نے بھی قبول نہیں کیا "بسر باید کہ بہ متابعت پدر رود" بیٹے کو چاہئے کہ باپ کی پیروی کرے، شہنشاہ ہمایوں کے تیئس سالہ دور سلطنت میں ایسی متعدد مثالیں کتابوں میں ملتی ہیں کہ اس دیار کے علماء و فضلاء و مشائخ پر نظر خسروانہ رہی اور اس نیک دل بادشاہ نے ان سے نیازمندانہ تعلق رکھا،

سلطان محمد اکبر ۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ ہمایوں کا بیٹا اکبر بھی اپنے بزرگوں کی طرح

سلہ تذکرۃ العلمائے ہند ص ۱۶۶۔

علماء و مشائخ کا قدر داں اور علوم و فنون کا بڑا دلدادہ تھا، اس نے دینی انحراف و زیغ کے باوجود علم و فن کی خوب خدمت کی، پورب کے ارباب علم و فضل کے ساتھ بہتر سلوک کیا اور ان کی خدمت کو سعادت جانا، مولانا الہ داد بن کمال الدین حسینی لکھنوی متوفی ۹۹۱ھ زبردست عالم و مدرس اور مفتی و مصنف تھے، سنہ ۹۸۰ھ میں خان زمان خان کی سرکوبی کے لیے اکبر جونپور گیا، راستہ میں لکھنؤ آیا تو شیخ عبدالنبی گنگوہی کو بھیجا تاکہ وہ مولانا الہ داد سے مل کر ان کے علمی کمالات کا اندازہ لگائیں، اور بادشاہ کو اس کی خبر دیں، شیخ عبدالنبی نے واپس آکر اکبر سے ان کے علم و فضل کا تذکرہ کیا تو اس نے ملاقات کے لیے مولانا کو اپنے یہاں بلانا چاہا، مگر اقلیم علم کے بادشاہ نے صاف انکار کر دیا، بعد میں اکبر نے ان سے اس وقت ملاقات کی جب وہ نماز کے لیے مسجد میں تشریف لائے، اور افتار کا عہدہ با اصرار پیش کیا جسے مولانا کو قبول کرنا پڑا۔[1]

قاضی کمال الدین بن یعقوب مانک پوری متوفی ۹۹۶ھ فقہ، اصول فقہ اور قضاء کے مشہور عالم تھے، اکبر نے ان کو لشکر کا قاضی بنایا، پھر ترقی کر کے پورے ملک کے قاضی القضاۃ بن گئے، اور مدتوں اس عہدۂ جلیلہ پر رہ کر علحدہ ہوئے، تو بنگال کے قاضی مقرر کئے گئے، اسی زمانہ میں محمد معصوم کابلی نے بنگال میں اکبر کے خلاف شورش برپا کی اور قاضی کمال الدین نے اس کا ساتھ دیا، جس کی سزا میں اکبر نے انکو گوالیار کے قلعہ میں قید کرنے کا حکم دیا، مگر وہاں پہونچنے سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔

راجہ سید مصطفیٰ مانک پوری متوفی ۹۸۹ھ راجہ سید مبارک مانک پوری کے صاحبزادے ہیں جنھوں نے ہمایونی دور میں مبارکپور آباد کیا تھا، راجہ سید مصطفیٰ

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۴ و تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۵

اکبری عہد کے درباری علماء و مشائخ میں سے تھے، ۹۸۲ھ میں اکبر کا لشکر آگرہ سے مالوہ کی طرف گیا، جس میں دیگر علماء و فضلاء، مشائخ، شعراء اور اہل دربار کی طرح راجہ سید مصطفیٰ بھی موجود تھے، گلزار ابرار کے مصنف محمد غوثی نے اسی موقع پر ان سے نیاز حاصل کیا تھا[1] انھوں نے اپنے والد راجہ سید مبارک شاہ کا روضہ مانک پور میں اکبر کے زمانہ میں تعمیر کرایا تھا، تاریخی کتبہ میں اس کا خاص طور سے ذکر ہے، دو شعر یہ ہیں۔

در زمان جلال دین اکبر　　که بدادش خدا جہاں بانی
روضہ ساخت مصطفیٰ راجی　　کش حور رضواں سزد بدربانی[2]

شیخ جمال الدین ہانسوی کی اولاد میں شیخ ابراہیم دانشمند نبیرۂ شیخ اسمٰعیل کلان خرد آباد لکھنؤ میں صاحب خوارق و کرامات بزرگ تھے، مرآۃ الاسرار میں ہے کہ اکبر نے تسخیر بنگالہ کی مہم پر جاتے ہوئے ان کی خدمت میں حاضری دی اور ان کی زبان سے نیک فالی کے الفاظ سنے،[3]

مولانا شمس نور (شمس الدین بن نور الدین) جونپوری متوفی ۱۰۰۱ھ اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء و فضلاء میں سے تھے، دیوان محمد رشید جونپوری کے ماموں اور استاد تھے، ملا محمود جونپوری نے بھی ان سے پڑھا تھا، اکبر نے مولانا شمس نور کو اپنے شاہزادہ پرویز کی تعلیم پر مقرر کیا، اور انھوں نے الہ آباد جاکر یہ خدمت انجام دی، اس کے بعد اکبر نے مولانا کو جونپور میں عہدۂ قضاء دیا۔[4]

قاضی اللہ داد حنفی بلگرامی اور قاضی کمال عثمانی بلگرامی کے درمیان ۹۹۰ھ میں

---

[1] گلزار ابرار قلمی ص ۱۱۴ (سالار جنگ میوزیم حیدرآباد) [2] گنج ارشدی قلمی ص ۱۰ (خانقاہ رشیدیہ جونپور) [3] مرآۃ الاسرار بحوالہ حدائق البیان ص ۲۳۲، [4] تجلی نور

منصب قضا پر تنازع ہوا، اور معاملہ اکبر کے دربار تک پہونچا، اس نے قاضی الہ داد کو بلگرام کا قاضی بنایا بعد میں جب معلوم ہوا کہ قاضی کمال یہاں کے خاندانی قاضی ہیں تو ان ہی کو یہ عہدہ دیدیا۔

شیخ محمد بن منیؒ ... سعدی کاکوری متوفی ۱۰۰۱ھ تجوید و قرأت اور تصوف کے زبردست عالم تھے، فارسی ... شاطبیہ کی شرح لکھی تھی، اکبر ان کی بزرگی سے بہت متاثر تھا اور گجرات سے ... واپس جاتے ہوئے کاکوری میں ان کی خدمت میں حاضر ہوکر دعا کی درخواست کی، ... جاگیر بھی عطا کی، شیخ عبدالواحد بن ابراہیم بلگرامی متوفی ۱۰۱۷ھ فضائل و کمالات اور عبادات و ریاضات میں بے مثال عالم ہونے کے ساتھ کئی کتابوں کے مصنف تھے، اکبر نے کمال تعظیم و تکریم کے ساتھ ان کو طلب کرکے جاگیر عطا کی[1]،

سلطان محمد جہانگیر ۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۶ھ، اکبر کا بیٹا جہانگیر تقریباً بائیس سال تک حکمران ... اپنے باپ اکبر کے برخلاف صحیح العقیدہ تھا، اور اکبری دور کے اثرات سے اس کا دماغ بہت جلد صاف ہوگیا، اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات نے بڑا کام کیا، جہانگیر نے حدیث کی تعلیم شیخ محمد سعید ہرویؒ سے حاصل کی تھی، جو میر کلاں کے لقب سے مشہور تھے، نیز مفتی صدر جہاں پہانوی اس کے اساتذہ میں سے ہیں۔

مغل بادشاہوں کی طرح جہانگیر بھی ارباب فضل و کمال کا بڑا قدردان تھا، اور دیار پورب کے علماء و فضلاء اور مشائخ سے عقیدت مندانہ تعلق رکھتا تھا۔

استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ اس دیار کے اساتذۂ عظام میں سے تھے، ملا محمود جونپوری اور دیوان محمد رشید جونپوری جیسے فضلائے دہر کے استاد تھے

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۶

علم و فضل کا شہرہ دور دور تک تھا، یہ جہانگیر کا دورِ سلطنت تھا، جونپور کی وقائع نگار نے ملا محمد افضل کی علمی شہرت و حیثیت کے بارے میں جہانگیر کو اطلاع دی تو اس نے انکو استاذ الملک کا لقب دیکر جونپور کے شاہی مدرسہ کی مدرسی اور ساتھ ہی جاگیر کا پروانہ بھیجا مگر ملا صاحب نے اسکو قبول نہیں فرمایا، اور پوری زندگی تدریس میں توکل کے ساتھ بسر کی۔[1]

شیخ عبد الرزاق امیٹھوی کے بھانجے شیخ جعفر بن نظام الدین امیٹھوی متوفی ۱۰۲۵ھ نے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے ماموں سے خرقہ خلافت پہنا، اور بستی کے باہر ایک دیہات میں سکونت اختیار کی، جب جہانگیر کو ان کے علم و فضل اور مقام و مرتبہ کا علم ہوا تو اس نے مفتی صدر جہاں کی سفارش پر ان کو دو سو بیگھہ زمین کی جاگیر عنایت کی، جس میں شیخ جعفر نے مسجد تعمیر کی، بعد میں اسی میں شیخ حسن سارنگ پوری نے ایک مدرسہ کی عظیم الشان عمارت بنائی جس میں طلبہ کے رہنے کے لئے کمرے بھی تھے۔

شیخ مصطفیٰ جونپوری اس دیار کے علمائے کبار میں سے تھے، ان سے چین قلیچ خان لاہوری نے تعلیم حاصل کی تھی، جب چین قلیچ خان جہانگیر کے خلاف بغاوت میں قتل کیا گیا تو شیخ مصطفیٰ بھی گرفتار ہوئے اور ۱۰۲۲ھ میں اجمیر میں جہانگیر کے سامنے پیش کئے گئے، اس نے شیخ محمد یوسف تتوی سندھی کو حکم دیا کہ شیخ مصطفیٰ سے معقولات کے دقیق مسائل میں مناظرہ کریں، چنانچہ دونوں بزرگوں میں ایک ہفتہ تک مباحثہ و مناظرہ کی مجلس گرم رہی، آخر میں شیخ محمد یوسف نے ان کے علم و فضل کا اعتراف کرکے جہانگیر سے ان کے بارے میں سفارش کی، جہانگیر نے شیخ مصطفیٰ کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ حرمین شریفین روانہ کیا، اور وہ حج و زیارت سے واپسی کے بعد جونپور میں آکر فوت ہوئے۔

مولانا علم اللہ بن شیخ عبد الرزاق امیٹھوی متوفی ۱۰۳۲ھ فقہ و حدیث اور عربیت کے

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۴۴۴ و ۴۵، نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۰۵ و ص ۴۰۶ ملخص،

مشہور عالم تھے، شیخ ابن حجر کی سے حدیث پڑھی تھی، اور برہان پور میں سکونت پذیر تھے، عبدالرحیم بیرم خان ان سے بے حد عقیدت رکھتا تھا، زیادہ سے زیادہ ان کی صحبت میں رہتا تھا، ان کو عطایا و انعامات سے نوازتا تھا، اور دوسروں کے بارے میں ان کی سفارش سنتا تھا، حاکم برہان پور عادل شاہ بھی ان کے قدم برہانپور کو غنیمت جان کر ان کی انتہائی تعظیم کرتا تھا، ایک مرتبہ مولانا علم اللہ اور ان کے داماد قاضی نصیر الدین کے درمیان ایک دینی مسئلہ میں شدید ترین اختلاف ہوگیا اور نوبت محضر نامہ تک پہونچ گئی، عبدالرحیم بیرم خان نے اس قضیہ کو جہانگیر کے سامنے پیش کیا، اس نے خسر اور داماد کو لشکر میں طلب کیا اور معاملہ اس نتیجہ پر جاکر رفع دفع ہوا کہ قاضی نصیر الدین حجاز روانہ ہوئے، اور مولانا علم اللہ بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ کے یہاں چلے گئے، قاضی نصیر الدین حدیث کی ترجیح میں قیاس کے منکر تھے، اور حدیث علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کو موضوع بتاتے تھے اسی پر یہ ہنگامہ برپا ہوا تھا۔

سلطان محمد شاہ جہان (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ) جہانگیر کے بعد اس کے بیٹے شاہجہان نے تقریباً بتیس[۳۲] سال حکومت کی اس کا طویل دور سلطنت علم و علماء کے حق میں بڑا پر بہار تھا اس نے اپنے خاندان کی کئی بدعات اور مظالم ختم کرکے عدل و انصاف اور امن و امان کے ساتھ حکومت کی، مساجد و مشاہد تعمیر کئے، دور دراز سے علماء و فضلاء اور مشائخ اس کے دربار میں آئے، اور عزت و احترام کے مستحق ٹھہرے، اس کا زمانہ ہر اعتبار سے بہتر تھا، بلاد پورب میں علم و فن کی نشاۃ ثانیہ ہوئی، اور جونپور دار العلم، دار الامان اور دہلی ثانی کے القاب کے بعد شیراز ہند کے لقب سے یاد کیا گیا، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے شاہجہان نے علاقہ پورب کو شیراز ہند کہکر افتخار کیا صاحب قران ثانی شاہجہان انار اللہ برہانہ

می گفت پورب شیراز ماست [۱] مولانا خیرالدین محمد نے اس بارے میں تاریخ شاہجہانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

حضرت صاحبقران شاہ جہان بادشاہ	صاحبقران شاہجہان بادشاہ نے جونپور
شہر جونپور را شیراز ہند می فرمود، وبدارالعلم	کو شیراز ہند کہکر دارالعلم کے نام سے
موسوم می نمود [۲]	موسوم کیا ۔

شاہجہان نہایت دیندار اور شریعت کا پابند تھا، پورے ہندوستان میں امر ونواہی کے اجراء میں کوشش کرتا تھا، تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد امراء و حکام کو اس بارے میں تاکیدی احکام دیتا تھا، جس کے نتیجہ میں بقول محمد صالح کنبوہ، "متکفلان مہمات شرعی متصدیان خدمات عرفی شرائط تفحص و تجسس بجا آرند" یعنی شرعی امور کے ذمہ دار اور عام حکام انتہا شدت کے مطابق عمل کرتے تھے، عمل صالح میں ان کی تفصیلات موجود ہیں اور ایک جگہ تو یہاں تک لکھدیا ہے کہ

وشبستان ہند را از سرنو بہ پرتو چراغ	شاہجہان نے شبستان ہند کو شریعت
شریعت محمدی نور آگیں ساختہ [۳]	محمدی کے چراغ کی روشنی سے از سرنو منور کیا،

ان شرعی و دینی مہمات کے لیے علماء و فضلاء کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں اور یہی قاضی و محتسب وغیرہ بنائے جاتے تھے ،

ہمایونی دور کے شروع میں بنگال، بہار اور بلاد پورب میں بہت انتشار پایا جاتا تھا، شاہجہان نے اس کا خاتمہ کیا، سنہ ۱۰۴۱ھ میں پرتگیزیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو ختم کرنے کے لئے حاکم بنگالہ خواجہ قاسم صفدرخان اور دیگر امراء و حکام کو حکم دیا، ہوگلی میں

---

[۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۱ [۲] تذکرۃ العلماء ص ۴ وص ۵ [۳] عمل صالح ج ۱ ص ۱۰۱ مطبوعہ لاہور

فرنگیوں نے طاقت جمع کرلی تھی، اور آس پاس کے راجوں اور زمینداروں کے قریات کو پٹہ اور رہن پر لیکر باشندوں کو عیسائی بنانا شروع کر دیا تھا، شاہجہان نے ان کے خلاف سخت اقدام کرا کر شاندار فتح پائی، ۱۰۴۳ھ میں عبدالرحیم خانخانان کے بیٹے لشکر شکن کو لکھنؤ کا فوجدار بنایا، جلوس کے دسویں سال ۱۰۴۶ھ میں بھوجپور (بہار) کے اطراف کے سرکش راجوں اور زمینداروں کی سرکوبی کے لیے شاہجہاں کے حکم سے عبداللہ خان بہادر فیروز جنگ، باقر خان نجم ثانی الہ آباد، اور رعد اندازخان زمیندار گورکھپور نے ان سب پر فوج کشی کی اور کئی ماہ کی شدید جنگ کے بعد فتح پائی ۱۰۵۲ھ میں اعتقاد خاں، زبردست خاں، صوفی بہادر، اور عبداللہ نجم ثانی نے پلاموں (بہار) کے راجہ پرتاب کو زیر کیا، ان واقعات کی تفصیل کے لیے محمد صالح کنبوہ کی کتاب عمل صالح ملاحظہ ہو۔

۱۰۴۶ھ میں بھی بھوج پور کی جنگ و فتح کے سلسلہ میں صوفی بہادر کا نام ملتا ہے، عمل صالح میں ہے۔ "زبردست خان و صوفی بہادر حسب الامر سردار بفتح قلعہ کالاپور شتافتہ، بعد از محاصرۂ یک ماہ آں را بہ کشش و کوشش تمام مسخر گردانیدند" (ج ۲ ص ۱۹۲) غالباً اسی فوجی افسر صوفی بہادر کے نام پر سکھٹی پورہ صوفی بہادر کی بستی ہے، جو اب مبارکپور کا مغربی محلہ ہے، اور پورہ صوفی کے نام سے مشہور ہے، راقم کے پاس اللہ خدائی" نامی کتاب کا قلمی نسخہ ہے، جس کے آخر میں ہے "تمام شد کارم نظام ...... نسخہ اللہ خدائی بپاس خاطر میان عبدالرحیم بن والی ساکن سکھٹی پورہ صوفی بہار" نیز اس کتاب پر ایک تملیکی تحریر یوں ہے، جان محمد پسر عبدالواحد ساکن پورہ صوفی بہادر، ۱۲۲۳ھ فصلی" دونوں تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محلہ اسی صوفی بہادر کے نام پر ہے، اِلا یہ کہ دوسرا مشہور آدمی اسی نام

نام کا رہا ہو۔

قصبہ متو شاہجہانی دور میں خصوصی توجہ کا مستحق ٹھہرا، علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ کہتے ہیں کہ یہ قصبہ شہزادی جہاں آرا بنت شاہجہان کی جاگیر میں تھا، اسی لئے اس کا نام جہاں آباد رکھا گیا، شہزادی نے اپنے شوق سے یہاں کپڑے بننے والے کاریگروں کو جمع کیا، اور جامع مسجد بنوائی جس کے چاروں طرف طلبہ کے لیے حجرے تھے۔[1]

شاہجہاں اور اس کے وزراء، امراء اور حکام میں آصف خان، سعد اللہ خاں، شائستہ خاں، شہزادہ محمد شجاع وغیرہ شرقی علماء وفضلاء کو حضرات میں سے تصور کرتے تھے، اور اس دیار کے کئی علماء سلطانی دربار سے منسلک ہو کر مراحم خسروانہ وملوکانہ سے حصہ پارہے تھے۔

معلوم ہو چکا ہے کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے شیخ محمد بن خضر کے صاحبزادے شیخ منیہ کو پرگنہ محمد آباد میں کئی قریات جاگیر میں دیئے تھے، اور بعد میں ان کا خاندان یہیں آباد ہو گیا، اسی میں ایک بزرگ مولانا حاجی ابوالخیر بن شیخ ابو سعید بھیردی متوفی ۱۰۵۹ھ ملا محمود جونپوری کے بہنوئی، اور معاصر تھے، وہ شاہجہانی دور میں پورب کے علمائے ل میں شمار ہوتے تھے، اور شاہی دربار سے ان کے تعلقات نہایت گہرے تھے، اوائل ہی میں ان کی علمی شہرت دہلی تک پہونچ گئی تھی، انھوں نے دہلی کا قصد کیا تو امیر الامراء نواب شائستہ خاں نے ان کی آمد کو غنیمت جان کر بڑی عقیدت مندی اور گرم جوشی سے استقبال کیا اور ان سے حدیث، تفسیر اور تصوف کی تعلیم حاصل کی، شائستہ خاں کی اس والہانہ عقیدت اور استفادہ کی وجہ سے شاہجہان بھی مولانا ابوالخیر کی زیارت کا مشتاق ہوا، اور مل کر بڑی خوشی کا اظہار کیا، اور شائستہ خاں کے مشورہ سے ہر چند چاہا کہ مولانا کوئی شاہی منصب

---

[1] مقدمہ حیات شبلی ص ۵۰،

یا جہانگیر قبول کر لیں، مگر انھوں نے انکار کر دیا، نواب شائستہ خان کی والدہ نہایت نیک اور پارسا تھیں ایک مرتبہ انھوں نے کمال عقیدت سے کچھ رقم سے مولانا کی خدمت کرنی چاہی مگر اس سے بھی انکار کر دیا، مولانا نے ۱۰۵۶ھ میں حج و زیارت کی دولت پائی اس موقع پر نواب شائستہ خان نے عرض کیا کہ خادم کا جہاز حجاز آتا جاتا ہے، حکم دیں تو اسکے عملا کو حکم کر دوں کہ آپ کو راحت و آرام کے ساتھ لیجائیں، اس پر مولانا نے کہا

"وائے بر ہمت وے کہ در راہ دوست وسیلۂ غیر درمیان آرد۔"

ایک مرتبہ مولانا ابوالخیر شاہجہاں کے ساتھ سیالکوٹ میر صاحب کی خدمت میں گئے شاہجہاں ...... نے ان کی خدمت میں نذر پیش کی، میر صاحب نے مولانا ابوالخیر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ اس ہدیہ کے زیادہ مستحق ہیں، انھوں نے محنت و مشقت سے علم حاصل کیا ہے" یہ جملہ مولانا ابوالخیر کے دل پر تیر و نشتر کا کام کر گیا، اور دینی غیرت و علمی حمیت سے مغلوب ہو کر دلیر پور بھیرا میں آکر گوشہ نشین ہو گئے[1]

مولانا ابوالخیر بھیروی کی تین شادیوں میں سے ایک شادی شیخ محمود قریشی بانسی مبارکپوری کی دختر سے ہوئی تھی، مگر اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، شیخ صاحب بڑے رعب داب کے رئیس اور بائیس گاؤں کے زمیندار تھے، اور ریاست و زمینداری کی رقابت میں قتل کیے گئے۔

جہانگیر نے ملا محمد افضل جونپوری کو استاذ الملک کے خطاب سے نوازا تھا، اور انکے دو شاگردوں کو شاہجہاں نے عقیدت و احترام کی مسند پر بٹھایا، یہ دونوں شاگرد علم و فضل اور حکمت میں اتنے اونچے تھے کہ استاد الملک فرمایا کرتے تھے کہ علامہ جرجانی

---

[1] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی (دار المصنفین)

اور علامہ تفتازانی کے بعد ایک عہد اور ایک شہر میں ان دونوں فضلاء کے جیسے ابتک دو فاضل جمع نہیں ہو سکے تھے، ایک دیوان محمد رشید جونپوری متوفی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ ان دونوں فضلائے عصر کو شاہجہاں نے مراسم خسروانہ کے ذریعہ قدردانی کرنی چاہی، مگر دیوان محمد رشید نے امراء و سلاطین کی طرف سے بے رغبتی و بے اعتنائی کے باعث یہ پیش کش قبول نہیں فرمائی، شاہجہاں نے ان کے اوصاف وکمالات اور علمی و دینی شہرت سنکر زیارت کی خواہش کی، اور ایک خاص وکیل کے ذریعہ فرمان بھیجکر ان سے دہلی آنے کی گذارش کی مگر دیوان صاحب نے حاضری سے معذوری ظاہر کر دی،[1] البتہ ملا محمود نے شاہی دربار سے منسلک ہو کر شاہجہاں کی تمنا پوری کی، ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد سے حکمت و فلسفہ میں ان کی ٹکر کا کوئی عالم پیدا نہیں ہوا، ملا صاحب فراغت کے بعد تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے، چند دنوں میں ان کے علم و کمال کا شہرہ جونپور کے مدرسہ کی چہار دیواری سے نکل کر دار الخلافہ کے شاہی دیوان میں گونجا اور شاہجہاں نے کمال عقیدت مندی سے دہلی بلا کر فضلائے شاہی میں شامل کر لیا، اور منصب سہ صدی ذات سے نوازا، اس سفر میں جب ملا صاحب دہلی کے قریب پہونچے تو بادشاہ کے حکم سے وزیر سعد اللہ خان نے جو خود زبردست عالم بھی تھے استقبال اور پیشوائی کی خدمت انجام دی، اور جب ملا صاحب دربار میں پہونچے تو بادشاہ کے پہلو میں بیٹھائے گئے، اس اعزاز و اکرام کے بعد ان کو جونپور روانہ کر دیا گیا، جہاں شاہی مدرسہ میں درس دیتے رہے، اور وقتاً فوقتاً دہلی جایا کرتے تھے۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۹۔

شاہجہاں بہ اوقات ان سے علمی مسائل میں استفادہ کرتا تھا، شاہزادہ محمد شجاع کی تعلیم کے لیے ان کو بنگال بھیجا، وزیر سعد اللہ خان، نواب شایستہ خان اور آصف خان ملا صاحب کے خوشہ چینوں میں تھے، ایک مرتبہ بادشاہ نے دربار میں ایک ایرانی فاضل، کچھ اور ملا صاحب میں مناظرہ کرایا، جس میں ملا صاحب کو کھلی کامیابی حاصل ہوئی اور بادشاہ نے ان کو خوب خوب نوازا، ایک مرتبہ شاہجہاں اور ملا صاحب لاہور گئے، میر عبد الحکیم سیالکوٹی بھی ساتھ تھے، اسی سفر میں حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں تینوں حضرات حاضر ہوئے اور میر صاحب کی ایک توجہ سے فضلائے شاہی دربار سے یکسو ہو گئے، ملا صاحب نے علم بلاغت میں الفرائد لکھکر شاہجہاں کے نام سے معنون کی، اور نہایت علمی و ادبی انداز میں اس کا تذکرہ کیا۔[۱]

ملا رکن الدین بہریا باری غازی پوری ملا محمود جونپوری کے ہم سبق استاد بھائی تھے، وہ بھی شاہجہانی امرار کے منظور نظر تھے، امیر الامرار نواب شایستہ خان کا بڑا قدردان تھا، اور وہ اسی سے منسلک تھے، ایک مرتبہ ملا رکن الدین دہلی سے غازی پور آئے اور نہایت اعلیٰ قسم کی کشمیری شال جو شایستہ خان نے ان کو دی تھی، اپنے استاد زادے ملا محمد صادق بن ملا شمس نور متوفی ۱۰۶۲ھ کی خدمت میں پیش کی، مگر ملا صادق نے یہ کہکر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا، من دلق را با طلس شاہان نمی خرم" فقیر گلیم لبس است لائق شال خود را نمی انگارم"[۲]

مفتی عبد السلام دیوی متوفی ۱۰۴۷ھ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے، مفتی عبد السلام

---

[۱] ان واقعات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ ملا محمود جونپوری" معارف مئی جون جولائی ۱۹۷۳ء [۲] تجلی نور ج ۲ ص ۸۵،

لاہوری سے تعلیم حاصل کر کے فقہ، اصول فقہ اور علم کلام میں یکتا ہوئے، اور لاہور ہی میں تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری کیا، بعد میں شاہجہاں نے ان کو لشکر کا قاضی بنایا، اس منصب پر ایک زمانہ تک رہ کر خدمت انجام دی، پھر علحدگی اختیار کر کے لاہور چلے گئے۔

قاضی محمد حسین جونپوری متوفی سنہ ۱۰۶۶ھ اپنے زمانہ کے مشہور ارباب علم و کمال میں سے تھے، شاہجہان کی نگاہ جوہر شناش نے ان کو جونپور کا قاضی مقرر کیا تھا۔

مفتی مبارک بن مفتی ابوالبقاء جونپوری متوفی سنہ ۱۰۵۹ھ شاہجہانی دور کے مشاہیر علماء میں سے تھے، جونپور اور الہ آباد میں تحصیل علم کرنے کے بعد دہلی گئے، اور وہاں سے مفتی جونپور کا پروانہ لیکر لوٹے،

ملا محب اللہ الہ آبادی متوفی سنہ ۱۰۵۸ھ مشائخ چشتیہ میں بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ تھے، لاہور جاکر مفتی عبدالسلام لاہوری سے پڑھا، شیخ محمد میر اور سعد اللہ خان ان کے ہم سبق تھے، جب شاہجہاں نے سعد اللہ خان کو وزارت دی تو انھوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو یاد کیا، اور ان کو شاہی منصب پر رکھنا چاہا، شیخ محمد میر نے زہد و تقویٰ کی وجہ سے دربار کی تعلق کو پسند نہیں کیا، اور مولانا محب اللہ کو سعد اللہ خان نے الہ آباد کی نظامت کا عہدہ دیکر رخصت کیا، مگر ملازمت ان کے ذوق کے خلاف تھی، اس لئے کچھ دنوں کے بعد اسے چھوڑ کر شیخ ابوسعید گنگوہیؒ کی خدمت میں چلے گئے، اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر شیخت کے مرتبہ کو پہونچے [1]

مفتی محمد صادق بن شیخ شمس نور جونپوری، متوفی سنہ ۱۰۶۶ھ شاہجہانی دور کے مشہور عالم و بزرگ تھے، ملا محمود جونپوری کے تلامذہ میں زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بلند مقام کے مالک تھے،

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۲۳،

اور حکام وقت ان کا بے حد اقرار کرتے تھے، ایک مرتبہ حاکم وقت نواب اللہ وردی خاں نے
ایک غیر شرعی تحریر پر مفتی صاحب سے اپنی مہر ثبت کرنے کی گذارش کی، آپ نے صاف
انکار کر دیا، نواب اللہ وردی خان سیر دریا کے بہانے سے ان کو کشتی میں سوار کرکے بیچ دریا
میں لے گیا، اور ان سے کہا کہ کاغذ پر مہر لگانے کا اقرار کیجئے، ورنہ میں آپ کو دریا میں پھینک
دوں گا، آپ نے فرمایا جبر و اکراہ کی حالت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس کے بعد انگوٹھی
نکال کر نواب کو دیدی، مگر نواب پر تقویٰ کا کچھ ایسا رعب چھایا کہ وہ مہر نہ لگا سکا، اور
معذرت خواہ ہوا، [۱] (باقی)

ضروری اطلاع

دو باتوں کا خاص طور سے خیال رکھئے۔

۱۔ خط و کتابت میں اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کیجئے۔ اس سے ہمیں
بڑی آسانی ہو جائے گی۔

۲۔ معارف ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی صاحب
کو ۲۵ تاریخ تک نہ ملے تو ہمیں اطلاع دے دیں۔ بہت دیر میں اطلاع ملتی ہے
تو رسالے ختم ہو چکے ہوتے ہیں، اور تعمیل نہیں ہو پاتی ہے۔

معارف کے پرانے پرچے

معارف کے پرانے پرچے بھی مل سکتے ہیں، لیکن وہ مسلسل نہیں ہیں، ۱۹۱۶ء
سے ۱۹۷۵ء تک متفرق پرچے مل سکیں گے۔ اور کچھ مکمل فائلیں بھی ہیں جن حضرات کو
ضرورت ہو وہ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔

"منیجر"

مولانا شمس الحق عظیم آبادی

از مولوی محمد عزیر صاحب مبارکپوری مرکزی دارالعلوم بنارس

تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری کے جن ہندوستانی علما نے اپنی زندگی خدمت حدیث کے لیے وقف کر دی تھی، ان میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی نہایت ممتاز ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک ان کے بارہ میں بہت کم لکھا گیا ہے، تلاش و تفحص کے بعد جو معلومات فراہم ہو سکی ہیں ان کو اس مضمون میں پیش کیا جا تا ہے،

نام و نسب | ابو الطیب محمد شمس الحق بن امیر علی بن شیخ مقصود علی بن شیخ غلام حیدر بن[۱] شیخ ہدایت اللہ بن شیخ محمد زاہد بن شیخ نور محمد بن شیخ علاء الدین . . . .

مکمل شجرہ مولانا کے صاحبزادے حکیم محمد ادریس ڈیانوی کے پاس موجود تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ (م ۱۳ھ) سے نسبی تعلق تھا[۲] والدہ کی جانب سے بھی ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ پر منتہی ہوتا ہے،[۳] اس طرح وہ

---

[۱] علامہ عظیم آبادی عموماً اپنی کتابوں میں والد، دادا، اور پردادا کے نام اس طرح لکھتے ہیں، امیر بن علی بن حیدر، (غایۃ المقصود ج ۱ ص ۲، التعلیق المغنی ج ۱ ص ۲ و اعلام اہل العصر باحکام رکعتی الفجر ص ۲) غالباً شیعیت کے اشتباہ کی وجہ سے ان ناموں کو مرکب کے بجائے مفرد لکھنا پسند کرتے رہے ہونگے

[۲] یادگار گوہری ص ۱۰، و ہفتہ وار اہلحدیث امرتسر ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۹ء ص ۸ [۳] یادگار گوہری ص ۶۰

نانہال اور دادیہال دونوں طرف سے صدیقی ہیں۔ مسکن ومولد کی نسبت سے عظیم آبادی[1]
اور ڈیانوی کہلاتے ہیں۔ "محدث ڈیانوی" "علامہ عظیم آبادی" صاحب عون المعبود اور
مولف غایۃ المقصود سے بھی ان کی شہرت ہے،

خاندان وماحول | ان کے آباء و اجداد کا اصل مکان موضع بڑاس بگہ تھا جو فتوحہ اسٹیشن
(ضلع پٹنہ) سے دو میل کے فاصلہ پر واقع ہے ان کے پردادا مولوی شیخ غلام حیدر ذی ثروت
اور صاحب مقدرت شخص تھے، گزری (محلہ عظیم آباد پٹنہ) میں ان کی کئی عالیشان کوٹھیاں
تھیں، ان کے والد مولوی شیخ امیر علی کا قیام کبھی بڑاس بگہ اور کبھی گزری میں رہتا، ۱۲۶۳ھ
میں جب ان کا نکاح دھنہ (محلہ عظیم آباد (پٹنہ) اور ڈیانواں کے رئیس مولانا گوہر علی (م ۱۲۷۶ھ)
کی صاحبزادی سے ہوا تو وہ اکثر زمانہ میں اپنے خسر صاحب ہی کے مکان پر قیام کرنے لگے
کیونکہ مولانا گوہر علی اور ان کی بیوی اپنی اکلوتی لڑکی کو فرط محبت کی وجہ سے اپنے سے
جدا کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

سلہ موجودہ شہر پٹنہ پہلے عظیم آباد کہلاتا تھا، اٹھارہویں صدی میں جب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر
(م ۱۱۱۸ھ) نے اپنے پوتے شہزادہ عظیم الشان (بن شاہ عالم م ۱۱۲۴ھ) کو بہار کا صوبہ دار
مقرر کیا تو اسی کے نام پر پٹنہ کا نام عظیم آباد رکھا، یہ قدیم تاریخی شہر ہے مفصل معلومات کے لئے
دیکھئے۔ نیا دور (لکھنؤ) (مئی ۱۹۵۹ء ص ۱۰۰) محمد محفوظ الحسن کا مقالہ عظیم آباد۔ آئینہ ایام میں

سے پٹنہ شہر سے جنوب مشرق کی جانب ۲۰ میل کے فاصلہ پر اور فتوحہ اسٹیشن سے ۸ میل
کی دوری پر دا کنانہ کراے پرسراے سے متصل ڈیانواں، ایک چھوٹی سی بستی ہے، علامہ
عظیم آبادی کا نانہال یہیں تھا، ان کی پرورش و پرداخت اور نشو و نما بھی یہیں ہوئی، اور وہ آخر
عمر تک اسی بستی میں مقیم رہے۔

مولانا کے والد ماجد شیخ امیر علی بڑے نیک اور منکسر المزاج شخص تھے، انھوں نے فارسی کے اسباق اپنے بزرگوں سے پڑھے، اور مولوی عبدالحکیم، مولوی مسیح اللہ اور مولوی ابوالحسن (م ۱۲۹۳ھ) وغیرہ سے رمنہ میں شرح وقایہ، شرح جامی اور دیگر کتابیں پڑھیں، اس کی وجہ سے شرعی مسائل میں ان کو اچھی سوجھ بوجھ ہو گئی تھی، ان کی ولادت ۱۲۴۳ھ میں اور وفات رمنہ میں ۱۳۰۳ھ میں ہوئی، اور ہر داس جگہ میں مدفون ہوئے۔

مولانا کی والدہ ماجدہ ماہ صفر ۱۲۴۵ھ میں بمقام رمنہ پیدا ہوئیں، جب سن شعور کو پہنچیں تو منشی بشارت کریم نے ان کو نماز روزہ کے ضروری مسائل کی تعلیم دی اور پارۂ عم اور مختلف سورتیں اور ادعیۂ ماثورہ پڑھائیں، ربیع الاول ۱۲۶۳ھ میں نکاح مولوی شیخ امیر علی سے ہوا۔ یہ بڑی نیک بخت خاتون تھیں اور ابتدا ہی سے صوم و صلوٰۃ اور اوراد و وظائف کی پابند تھیں، نفل نماز و ں اور نفلی روزے، التزام سے رکھتی تھیں، اعتکاف و قیام رمضان کی بھی پابند تھیں، روزآنہ تین پارے قرآن تلاوت کرتیں اور دعائیں بھی پڑھتی تھیں، رمضان میں روزآنہ دس پارے قرآن پڑھنے کا معمول تھا، وہ اتباع سنت کا بڑا خیال رکھتی تھیں اور ان پر ہمیشہ خشیت الٰہی غالب رہتی تھی، توحید کی صحیح حقیقت اور دین کی اصل روح سمجھ لینے کے بعد وہ ان غلط عقیدوں اور شرعی ممنوعات سے بالکل تائب ہو گئیں، جن کو نادانستہ طور پر اختیار کئے ہوئے تھیں، ۱۳۱۲ھ میں اپنے پوتوں اور خاندان کے بعض اعزہ کے ساتھ مکہ مکرمہ کی زیارت کی اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئیں[1]، حج سے واپسی کے بعد کتنے دنوں زندہ رہیں، تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا، اللہ تعالیٰ نے انھیں پانچ لڑکیاں اور چار لڑکے عطا کئے تھے

---

[1] مکتوب حکیم محمد ادریس ڈیانوی بنام مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی (مورخہ ۲۲ محرم ۱۳۳۰ھ) یہ خط اتفاق سے راقم کو مل گیا اور اب میرے پاس محفوظ ہے۔

بڑے لڑکے کبیر الحق اور چھوٹے ظہیر الحق کم سنی ہی میں رحلت کر گئے، تیسرے لڑکے مولانا شمس الحق (م ۱۳۲۹ھ)، اور چوتھے مولانا محمد اشرف (م ۱۳۲۶ھ) تھے،

علامہ عظیم آبادی کے نانا مولانا گوہر علی کی ولادت ڈیانواں میں ۱۲۱۳ھ میں ہوئی، تحصیل علم کے لئے مینھو (ضلع گیا) اور دوسرے مقامات کا سفر کیا، جب فارسی میں اچھی دستگاہ ہوگئی تو عربی کی درسی کتابیں محنت و توجہ سے پڑھیں، مولانا گوہر علی کے والد شیخ مہر علی (م ۱۲۵۲ھ) زیادہ فارغ البال نہ تھے، اس لئے پڑھنے کے بعد انھوں نے ایک معمولی ملازمت کرلی مگر ترقی کرکے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے، اس کی وجہ سے ان کی آمدنی اور جائداد میں بہت اضافہ ہوگیا تھا، ۱۲۴۲ھ میں شیخ روشن علی نگرنہسوی (م ۱۲۵۰ھ) کی صاحبزادی سے نکاح ہوا جس سے ایک لڑکی اور آٹھ لڑکے پیدا ہوئے، مولانا گوہر علی علما کے بڑے قدردان اور نہایت فیاض طبع شخص تھے، وہ محتاج اور ضرورتمند لوگوں کی برابر مدد کرتے رہتے تھے، بعض علما نے مستقل طور پر ان کے یہاں بود و باش اختیار کر رکھی تھی اور وہ ان کی خوب خاطر مدارات کرتے تھے، ان کی سخاوت و فیاضی اور علمی قدردانی کے بعض واقعات مشہور ہیں، ان کو کتابیں جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا، ان کے کتبخانہ میں قلمی کتابوں کا زیادہ ذخیرہ تھا، آخر عمر میں بواسیر کی شکایت ہوگئی تھی، ۱۹ جمادی الاولی ۱۲۷۰ھ کو رحلت فرمائی اور ڈیانواں میں مدفون ہوئے۔[1]

مولانا عظیم آبادی کے خاندانی حالات اور ماحول کا تفصیل سے اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اس خاندانی نجابت و شرافت اور ماحول کی روایات و خصوصیات کا ان کی طبیعت اور مزاج اور سیرت و شخصیت پر اثر پڑنا ناگزیر تھا،

---

[1] خاندان سے متعلق اکثر معلومات اور سنین وفات وغیرہ یادگار گوہری سے ماخوذ ہیں۔

ولادت و طفولیت، ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو رمنہ میں پیدا ہوئے پانچ سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ننہال ڈیانواں چلے آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی کیونکہ ان کی والدہ بھی مستقل طور پر یہیں رہتی تھیں ابھی گیارہ سال ہی کی عمر تھی کہ ۱۲۸۳ھ میں والد انتقال کر گئے، ان کی ماں، نانی اور بڑے ماموں نے لاڈ پیار سے پالا پوسا۔ ان کے بڑے ماموں مولوی محمد احسن (م ۱۳۱۰ھ) ان سے بڑی محبت کرتے تھے، اور کبھی ان کی کوئی خواہش رد نہیں کرتے تھے، تعلیم و تربیت اور تمام ضرورتوں کی اس طرح کفالت کی کہ مولانا کو کبھی باپ کے سایۂ شفقت سے محرومی کا احساس نہ ہونے دیا۔[۱]

تعلیم و تربیت، مولانا محمد ابراہیم نگرنہسوی (م ۱۲۸۲ھ) نے بسم اللہ کرائی، اور سورۂ "اقرأ" پڑھایا۔ پھر ڈیانواں ہی میں حافظ اصغر علی رامپوری اور دوسرے معلمین سے ابتدائی تعلیم حاصل کرتے رہے، فارسی کی کتابیں پڑھنے کے بعد مولانا لطف العلی بہاری (م ۱۲۹۶ھ) سے عربی شروع کی اور شرح جامی، قطبی، میبذی، اصول الشاشی، نور الانوار، شرح وقایہ، کنز الدقائق اور جامع ترمذی وغیرہ بھی ان ہی سے پڑھیں، اس عرصہ میں اپنے ماموں مولوی نور احمد ڈیانوی سے بھی استفادہ کرتے رہے۔

تحصیل علم کے لیے سفر ۱۲۹۲ھ میں حصول علم کے لیے پہلی بار ڈیانواں سے باہر قدم نکالا اور لکھنؤ تشریف لے گئے، یہاں مولانا فضل اللہ لکھنوی (م ۱۳۱۱ھ) سے سال بھر تک معقولات کا درس لیتے رہے، ۲۶ محرم ۱۲۹۳ھ کو مراد آباد[۲] مولانا بشیر الدین قنوجی (م ۱۲۹۶ھ)

---

[۱] یادگار گوہری ص ۱۰۱۔ [۲] بعض لوگوں نے بھوپال جاکر مولانا بشیر الدین قنوجی اور شیخ حسین بن انصاری سے استفادہ کرنے کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت وہ بھوپال کے بجائے مراد آباد تشریف لے گئے تھے، (ملاحظہ ہو یادگار گوہری ص ۱۰۰ وغیرہ)

کی خدمت میں کتب درسیہ کی تکمیل کے لیے حاضر ہوئے۔ ایک سال سے کچھ زیادہ قیام کرنے کے بعد وطن واپس آئے، اور پھر دوبارہ ۱۰ جمادی الاولی ۱۲۹۴ھ کو مولانا موصوف کی خدمت میں مرادآباد پہنچے اور معقولات، بلاغت اور معانی کی کتابیں، اور قرآن مجید کا ترجمہ اور مشکوٰۃ المصابیح کا کچھ حصہ پڑھا اور قرآن وحدیث اور فقہ وعقائد سے متعلق مسائل کی تحقیق بھی، کرتے رہے۔

اوائل محرم ۱۲۹۵ھ میں دہلی مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) کی خدمت میں استفادہ کے لیے تشریف لے گیے، اخیر محرم ۱۲۹۶ھ میں میاں صاحب موصوف سے حدیث وتفسیر کی سند حاصل کرکے اپنے مکان واپس آگئے، اور درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہوگئے، پھر سال بعد ۱۳۰۲ھ میں میاں صاحب کی کشش اور محبت دوبارہ ان کو دہلی کھینچ لے گئی، چنانچہ ان سے دوسری سند لیکر ۱۳۰۳ھ میں ڈیانواں تشریف لائے، دونوں مرتبہ دہلی میں میاں صاحب کے پاس قیام کی مدت تقریباً تین سال رہی، اس عرصہ میں ان سے ترجمہ قرآن مجید، تفسیر جلالین، صحاح ستہ موطا امام مالک، سنن دارمی، سنن دارقطنی اور شرح نخبۃ الفکر (نزہتہ النظر) سبقاً سبقاً پڑھی، اور فتاوی بھی قلمبند کرتے رہے،

دہلی کے دوسرے سفر میں شیخ حسین بن محسن انصاری (م ۱۳۲۷ھ) کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے، اور صحاح ستہ کے اطراف پڑھکر ان سے عام اجازت حاصل کی، اسکے علاوہ بھی مختلف وقتوں میں دو دس بارہ دفعہ علامہٗ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوکر مستفید ہوئے[1]۔

مولانا عظیم آبادی کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کو اپنے زمانہ کے ان دو جلیل القدر

---

[1] یادگار گوہری ص ۱۰۹

دثین سے استفادہ کا موقع ملا۔ یہ اسی کا فیض ہے، کہ ان کی پوری زندگی علم و فن کی اشاعت، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور دینی علوم خصوصاً حدیث کی شرح و تحقیق میں گذری۔

اتباع سنت کا شوق ان پر شروع ہی سے اتباع سنت کا شوق غالب تھا، اور وہ عقائد و اعمال میں صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کے مسلک کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا خود بیان ہے کہ

> "مولانا علیم الدین حسین نگر نہسوی (م ۱۳۰۶ھ) کے پند و نصائح سے بڑا فائدہ حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ نے اتباع سنت کا شوق ان ہی کے واسطہ سے مجھ کو عطا فرمایا ہے، اور میرے رفیق حبیب مولوی تلطف حسین محی الدین پوری نے بھی ان امور میں میری بڑی مدد کی ہے، جزاہما اللہ خیرا"[۱]

نکاح جب پہلی دفعہ مراد آباد کے سفر سے ڈیانواں واپس ہوئے تو ربیع الاول ۱۲۹۲ھ میں چھپرہ (سارن) کے مولوی عبد اللطیف صدیقی کی دوسری صاحبزادی سے ان کا عقد ہوا۔

طب پڑھنے کا ارادہ اس زمانہ میں طلبہ دینی علوم سے فراغت کے بعد باعزت زندگی بسر کرنے کے لیے فن طب کی تحصیل کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ نصف صدی پہلے کے اکثر علما کو طب میں بھی، درخور رہتا تھا، مولانا عظیم آبادی کی طبیعت کا زیادہ میلان حدیث کی جانب تھا، اس لئے ابتداً ان کو طب کی جانب کوئی رغبت نہ ہوئی، مگر میاں صاحب کی تلقین و ترغیب سے ان کو اس کا شوق ہوا، چنانچہ وہ اپنے ایک گرامی نامہ میں مولانا عظیم آبادی کو تحریر فرماتے ہیں۔

نامہ نامی صحیفہ گرامی رسیدہ کاشف مدعا گردید۔ آپ کا گرامی نامہ ملا، مضمون سے آگاہی ہوئی

---

[۱] یادگار گوہری ص ۱۰۴

بکرمانا طبیعت شما در علم دین خصوصاً در فن
حدیث زیادہ تر مرتسخ شدہ است لہذا
در علم دیگر مائل دفعتہ نخواہد بود، انشاء اللہ
تعالیٰ در علم طب بعد جزء دو جزء بتدریج
مناسبت تام خواہد شد، خاطر شریف
جمع دارند دما برضا در غبت اجازت
علم طب دادم و دعا می کنم کہ او واہب
الخیر والبرکت زود تر مراد دلی شما را فائز
کنایندہ بخیریت تمام بدولت خانہ رسانند[1]

مخدوم! آپ کی طبیعت علم دین خصوصاً
فن حدیث کی طرف زیادہ مائل ہے، اس لیے
دوسرے علم کی طرف توجہ دفعتہً نہیں
ہو سکتی، انشاء اللہ تعالیٰ علم طب میں
ایک دو جزء پڑھنے کے بعد طبیعت پوری
طرح لگنے لگے گی، آپ مطمئن رہیں میں
خوشی سے علم طب پڑھنے کی اجازت
دیتا ہوں، اور دست بدعا ہوں کہ
خدائے تعالیٰ بہت جلد آپ کو دلی
مرادیں کامیاب بنا کر مع الخیر وطن پہنچا دے

غالباً طب پڑھنے کے لیے مولانا شمس الحق صاحب ٹونک تشریف لے گئے تھے، جیسا کہ میاں صاحب کے دوسرے مکتوب کے اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے:

در رفتن ٹونک تحصیل طب یا ادب افتاد
یا بطور سیر، ازین، مرا ہم اطلاع سازند[2]

اور ٹونک کیوں جانا ہوا، طب یا ادب
پڑھنے کے لیے یا مطلق سیر و سیاحت
کے لیے، اسکی بھی اطلاع دیں،

لیکن اپنے علمی کاموں اور درس و تصنیف کی مشغولیتوں کی وجہ سے طب پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ اپنے فرزند محمد ادریس صاحب کو طب کی اعلیٰ تعلیم دی اور وہ ایک کامیاب طبیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے،

---

[1] مکاتیب نذیریہ ص ۲۲ [2] ایضاً ص ۲۳ و ۲۴،

سفرِ حج: ۱۰ رجب ۱۳۱۱ھ کو مولانا ڈیانواں سے حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سفر میں بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہونے کے علاوہ حرمین کے متعدد اہل فضل و کمال سے ملاقات اور استفادہ کا موقع ملا[1] جن مشائخ نے سند و اجازت مرحمت کی تھی ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ علامہ خیر الدین ابو البرکات نعمان بن محمود آفندی آلوسی زادہ حنفی بغدادی (م ۱۳۱۷ھ)

۲۔ علامہ احمد بن عیسیٰ النجدی ثم المکی الحنبلی (م ۱۳۲۹ھ) ۳۔ علامہ احمد بن احمد المغربی ثم المکی۔ ۴۔ علامہ قاضی عبد العزیز بن صالح مرشد حنبلی (۵) علامہ عبد الرحمٰن بن عبد اللہ سراج حنفی، طائفی (۶) علامہ محمد بن سلیمان حسب اللہ شافعی (۷) علامہ ابراہیم بن احمد بن سلیمان مغربی، مکی۔[2]

ان علماء سے چھ ماہ تک استفادہ کرنے اور فریضہ حج ادا کرنے کے بعد ۱۰ محرم الحرام ۱۳۱۲ھ کو وطن واپس آئے۔[3]

درس و تدریس: میاں صاحب کے یہاں سے جب پہلی مرتبہ ۱۲۹۶ھ میں اپنے وطن واپس ہوئے تو اور علمی کاموں کے ساتھ ہی درس و تدریس کا مشغلہ بھی اختیار کیا۔ ۱۳۰۲ھ میں دوسری بار جب وہاں سے واپس آئے تو باقاعدہ مسندِ درس پر رونق افروز ہوئے، ان کے حلقہ درس میں ملک کے گوشے گوشے سے لوگ آکر مستفید ہوتے تھے، عرب اور ایران کے طلبہ بھی ہوتے تھے، وہ طلبہ کے ساتھ بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے، طلبہ کے قیام و طعام ان کے لیے کتابوں کی فراہمی اور ضروری اخراجات کا سامان بھی کرتے تھے۔ انکا حلقۂ درس

---

[1] ترجمۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۸۰ یادگار گوہری ص ۱۷۶۔ [2] تذکرہ علمائے حال ص ۳۱

[3] یادگار گوہری ص ۱۷۶

بہت وسیع تھا، میاں صاحب کے بعد کم ہی لوگوں کے حلقۂ درس کو اتنی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہوگی۔ مولانا کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان میں سے چند مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) مولانا احمد اللہ پرتاب گڈھی (۲) مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی (۳) مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی (م ۱۹۴۹ء) (۴) مولانا عبدالحمید سوہدری (م ۱۳۳۰ھ) (۵) مولانا شرف الحق محمد اشرف ڈیانوی[1] (م ۱۳۲۶ھ) (۶) حکیم محمد ادریس ڈیانوی[2] (۷) مولوی ابوعبداللہ محمد زبیر ڈیانوی (م ۱۳۲۹ھ) مولف یادگار گوہری۔

افتا: میاں صاحب کی خدمت میں رہکر افتا کا کام بھی انجام دیتے تھے، ان کا معمول تھا کہ وہ اپنے ہونہار شاگردوں کو فتوی نویسی کی مشق بھی کراتے تھے، عموماً ان کے پاس جب استفتے آتے تو وہ انھیں مختلف طالب علموں کے حوالے کر دیتے اور خود ان کے جواب ملاحظہ فرماکر تصویب و تصحیح فرما دیتے تھے، مولانا عظیم آبادی نے اپنے سہ سالہ قیام کے زمانہ میں بکثرت فتوے لکھے مگر انکا پتہ نہیں چلتا، "فتاوی نذیریہ" کی جو دو جلدیں چھپی ہیں ان میں صرف چند سالوں ہی کے فتوے شامل ہیں، ان میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے کچھ مستقل فتوے اور کچھ فتووں پر ان کے تائیدی دستخط ثبت ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طالب علمی ہی کے زمانہ سے ان کو فتوی نویسی میں مہارت ہوگئی تھی، "فتاوی نذیریہ" میں ان کے جو فتوے شامل ہیں وہ بڑے مفصل و مدلل ہیں، بعض بعض فتوے چار چار اور بعض پانچ صفحے کے ہیں۔

میاں صاحب کے یہاں سے واپسی کے بعد بھی برابر افتا کی خدمت انجام دیتے

---

[1] یہ مولانا کے چھوٹے بھائی تھے، [2] یہ مولانا کے صاحبزادے ہیں،

اور بکثرت فتاوی تحریر فرمائے، مولانا ابو القاسم سیف بنارسی کا بیان ہے کہ "زیادہ وقت اسی کار خیر میں بسر ہوتا تھا"[1] افسوس ہے کہ ان کے فتوے محفوظ نہیں رہے، ان کے بعض رسالے استفتا کے جواب میں لکھے گئے تھے، آگے ان کا ذکر تصنیفات میں کیا جائے گا۔

وعظ و تذکیر: ڈیانوان میں درس و تدریس کے علاوہ وعظ و ارشاد بھی ان کا خاص مشغلہ تھا، ان کی تقریروں سے بڑا فیض پہنچا، اکثر لوگوں نے غلط عقیدے، مبتدعانہ خیالات، جاہلانہ رسمیں اور فسق و فجور کی عادتیں چھوڑ دیں۔ خود ان کی والدہ ماجدہ نے بھی ان کے وعظ و ارشاد سے متاثر ہو کر اپنی بعض غیر شرعی عادتیں ترک کر دی تھیں۔ محلہ کی اکثر عورتیں بھی ان کے وعظ میں شریک ہوتی تھیں، ان کی نانی کہا کرتی تھیں کہ "تم جس وقت اللہ کی باتیں سناتے ہو، اس وقت نہایت بزرگ معلوم ہوتے ہو"[2]

کتب حدیث کی اشاعت: مولانا عظیم آبادی کا سب سے اہم کارنامہ حدیث اور کتب حدیث کی ترویج و اشاعت ہے۔ ان کی دولت اسی مبارک کام کے لئے وقف رہتی تھی، اپنی کی قلیل عمر میں انھوں نے حدیث کی جو مفید خدمات انجام دیں اس کی مثال اس دور میں ملنی مشکل ہے۔ علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، علامہ ذہبی اور منذری وغیرہ کی متعدد کتابیں اپنے خرچ سے طبع کرائیں، منذری کی مختصر السنن، ابن قیم کی تہذیب السنن اور سیوطی کی اسعاف المبطا وغیرہ کو تصحیح و تعلیق کے ساتھ شائع کیا، وہ شیخ محمد مچھلی شہری (م ۱۳۲۴ھ) کی تقریباً ۲۵ کتابوں کی اشاعت کے بڑے آرزو مند تھے، مگر ان کے فرزندوں نے مولانا کے شدید اصرار کے باوجود مسودے نہیں دیے، ورنہ مولانا کی توجہ سے وہ بھی شائع ہو گئی ہوتیں[3]

---

[1] اہلحدیث امرتسر ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۹ء ص ۹۔ [2] یادگار گوہری ص ۹۳۔

[3] تراجم علمائے اہلحدیث ہند ج ۱ ص ۳۸۰

بہت وسیع تھا، میاں صاحب کے بعد کم ہی لوگوں کے حلقۂ درس کو اتنی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہوگی۔ مولانا کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان میں سے چند مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) مولانا احمد اللہ پرتاب گڈھی (۲) مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی (۳) مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی (م ۱۹۴۹ء) (۴) مولانا عبدالحمید سوہدری (م ۱۳۳۰ھ) (۵) مولانا شرف الحق محمد اشرف ڈیانوی[1] (م ۱۳۲۶ھ) (۶) حکیم محمد ادریس ڈیانوی[2] (۷) مولوی ابوعبداللہ محمد زبیر ڈیانوی (م ۱۳۲۹ھ) مولف یادگار گوہری۔

افتا میاں صاحب کی خدمت میں رہکر افتا کا کام بھی انجام دیتے تھے، ان کا معمول تھا کہ وہ اپنے ہونہار شاگردوں کو فتوی نویسی کی مشق بھی کراتے تھے، عموماً ان کے پاس جب استفتے آتے تو وہ انھیں مختلف طالب علموں کے حوالے کر دیتے اور خود ان کے جواب ملاحظہ فرماکر تصویب و تصحیح فرمادیتے تھے، مولانا عظیم آبادی نے اپنے سہ سالہ قیام کے زمانہ میں بکثرت فتوے لکھے مگر انکا پتہ نہیں چلتا، "فتاوی نذیریہ" کی جو دو جلدیں چھپی ہیں ان میں صرف چند سالوں ہی کے فتوے شامل ہیں، ان میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے کچھ مستقل فتوے اور کچھ فتووں پر ان کے تائیدی دستخط ثبت ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طالب علمی ہی کے زمانہ سے ان کو فتوی نویسی میں مہارت ہوگئی تھی، "فتاوی نذیریہ" میں ان کے جو فتوے شامل ہیں وہ بڑے مفصل و مدلل ہیں، بعض بعض فتوے چار چار اور بعض پانچ صفحے کے ہیں۔

میاں صاحب کے یہاں سے واپسی کے بعد بھی برابر افتا کی خدمت انجام دیتے

---

[1] یہ مولانا کے چھوٹے بھائی تھے۔ [2] یہ مولانا کے صاحبزادے ہیں،

اور بکثرت فتاوی تحریر فرمائے، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی کا بیان ہے کہ "زیادہ وقت اسی کار خیر میں بسر ہوتا تھا"[1] افسوس ہے کہ ان کے فتوے محفوظ نہیں رہے، ان کے بعض رسالے استفتا کے جواب میں لکھے گئے تھے، آگے انکا ذکر تصنیفات میں کیا جائے گا۔

وعظ و تذکیر | ڈیانوان میں درس و تدریس کے علاوہ وعظ و ارشاد بھی ان کا خاص مشغلہ تھا، ان کی تقریروں سے بڑا فیض پہنچا، اکثر لوگوں نے غلط عقیدے، مبتدعانہ خیالات، جاہلانہ رسمیں اور فسق و فجور کی عادتیں چھوڑ دیں. خود ان کی والدہ ماجدہ نے بھی ان کے وعظ و ارشاد سے متاثر ہو کر اپنی بعض غیر شرعی عادتیں ترک کر دی تھیں۔ محلہ کی اکثر عورتیں بھی ان کے وعظ میں شریک ہوتی تھیں، ان کی نانی کہا کرتی تھیں کہ "تم جس وقت اللہ کی باتیں سناتے ہو، اس وقت نہایت بزرگ معلوم ہوتے ہو"[2]

کتب حدیث کی اشاعت | مولانا عظیم آبادی کا سب سے اہم کارنامہ حدیث اور کتب حدیث کی ترویج و اشاعت ہے۔ ان کی دولت اسی مبارک کام کے لئے وقف رہتی تھی، اپنی مختصر سی قلیل عمر میں انھوں نے حدیث کی جو مفید خدمات انجام دیں اس کی مثال اس دور میں ملنی مشکل ہے۔ علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم علامہ ذہبی اور منذری وغیرہ کی متعدد کتابیں اپنے خرچ سے طبع کرائیں، منذری کی مختصر السنن، ابن قیم کی تہذیب السنن اور سیوطی کی اسعاف المبطا وغیرہ کو تصحیح و تعلیق کے ساتھ شائع کیا، وہ شیخ محمد مچھلی شہری (م ۱۳۲۴ھ) کی تقریباً ۲۵ کتابوں کی اشاعت کے بڑے آرزومند تھے، مگر ان کے فرزندوں نے مولانا کے شدید اصرار کے باوجود مسودے نہیں دیئے ورنہ مولانا کی توجہ سے وہ بھی شائع ہو گئی ہوتیں[3]

---

[1] اہلحدیث امرتسر ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۹ء ص ۹۔ [2] یادگار گوہری ص ۹۳۔

[3] تراجم علمائے اہلحدیث ہند ج ۱ ص ۳۸۰

حدیث کی بعض امہات کتب کی خدمت کی سعادت ان کے حصہ میں آئی، چنانچہ سنن ابی داؤد اور سنن دارقطنی کے مختلف نسخوں کی مدد سے ان کے متون کی تصحیح ومقابلہ کیا، پھر مفید تعلیقات لکھکر ان کو شائع کیا۔ سنن ابی داؤد کی مبسوط شرح بھی لکھی اس کا ذکر آگے آئے گا۔

حدیث کی حمایت اور دینی حمیت حدیث وسنت کی تائید وحمایت کے لیے پوری طرح کمربستہ رہتے تھے، اور ان کی معمولی مخالفت بھی برداشت نہیں کرتے تھے، ڈاکٹر عمر کریم پٹنوی نے جب حدیث، ائمہ حدیث اور امام بخاری کے خلاف زبان طعن دراز کی تو انھوں نے اپنے تلمیذ رشید اور ممتاز عالم مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی سے اس کا جواب لکھوایا، اور اس سلسلہ میں ان کی ہر قسم کی علمی ومالی اعانت بھی کی۔

مولانا میں بڑی دینی حمیت بھی تھی، اس لیے شریعت کے منافی کوئی بات پسند نہیں کرتے تھے، بدعتوں سے سخت نفرت اور توحید واتباع سنت کے پرجوش داعی تھے۔ ان کے زمانہ میں ہندوؤں کے اثر سے مسلمان بھی نکاح بیوگان کو بہت معیوب سمجھتے تھے، مگر مولانا نے اس غیر شرعی رسم کو ختم کرکے سب سے پہلے اپنے خاندان میں بیوہ عورتوں کے نکاح کو رائج کیا[1]

ملی وجماعتی خدمات مولانا شمس الحق صاحب جماعت اہل حدیث کے رکن رکین اور اس کے خاص علم بردار تھے، انکا ذوق اگرچہ خالص علمی تھا، تاہم اکثر جماعتی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہتے تھے، دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی تاسیس عمل میں آئی تو اس کے ہر پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور زندگی بھر اس کی وسعت وترقی

---

[1] یادگار گوہری ص ۱۰۹

کے لئے کوشاں رہے، اس کے جلسوں میں پابندی سے شرکت فرماتے تھے، اس کے انتظام والصرام کی بعض ذمہ داریاں بھی ان کے سپرد تھیں اور وہ انھیں بڑے شوق اور دلچسپی سے انجام دیتے تھے، مرتے وقت تک کانفرنس کے وہی امین (خازن) تھے، اور انھوں نے اس کا حساب کتاب ہمیشہ بہت صاف رکھا۔[1]

جماعتی سرگرمیوں کے علاوہ مسلمانوں کی بعض علمی واصلاحی تحریکوں میں بھی شریک رہتے تھے، تحریک ندوۃ العلما کے حامیوں میں تھے اور اس کے دار العلوم کی ہر قسم کی مالی اور علمی مدد کرتے تھے، دوسرے جماعتی وغیر جماعتی مدرسوں اور اداروں کی بھی امداد کرتے رہتے تھے، مدرسہ اصلاح المسلمین (پٹنہ) کے عرصہ تک سکریٹری رہے، مدرسہ احمدیہ آرہ کے جس کو مولانا ابو محمد ابراہیم آروی نے قائم کیا تھا، اہم رکن تھے اور اس کی تعمیر و ترقی اور انتظامی امور میں بڑے دخیل تھے،[2] آپ کے گھر کی حیثیت بھی ایک مدرسہ سے کم نہیں تھی، یہاں سیکڑوں طلبہ ان سے مستفید ہوتے تھے، انکی وفات کے بعد اسی کی یادگار میں ان کے صاحبزادے حکیم محمد ادریس صاحب نے جامع ازہر کے نام سے ایک مستقل مدرسہ قائم کیا تھا۔[3]

مولانا دائرۃ المعارف حیدرآباد کے بھی رکن تھے، تہذیب التہذیب اور تذکرۃ الحفاظ وغیرہ ان کے مشورے سے شائع ہوئیں، مصر کے بعض مطابع بھی کتابوں کی اشاعت میں ان سے رائے مشورہ لیا کرتے تھے،[4]

فضل وکمال | مولانا کی دینی علوم، معقولات اور ادب وغیرہ پر وسیع نظر تھی طالب علمی

۱؎ اہلحدیث ۳۱ مارچ ۱۹۱۱ء ص ۴ ۲؎ ایضاً ۲۸ اپریل ۱۹۱۱ء ص ۴ ۳؎ ہندوستان میں اہلحدیث کی علمی خدمات ص ۱۶۵-۱۶۶ ۴؎ اہلحدیث ۲۸ اپریل ۱۹۱۱ء ص ۴۔

کے زمانے سے بحث و نظر اور مطالعہ و تحقیق کے عادی تھے اللہ نے ان کو غیر معمولی ذہانت اور قوت فہم سے نوازا تھا، فقہی مذاہب ائمہ کے اختلافات و دلائل پر مکمل عبور رکھتے تھے، ان کے علمی تبحر و وسعت نظر پر ان کی تصنیفات شاہد ہیں، مطالعہ کی کثرت، کتابوں کی مزاولت اور فن حدیث میں غیر معمولی اشتغال کی وجہ سے حدیث پر ان کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہو گئی تھی، اور وہ صحیح و ضعیف، راجح و مرجوح، مرفوع و موقوف، محفوظ و معلل، متصل و منقطع اور حدیث کی دوسری تمام انواع و اقسام کے درمیان نقد و تمیز کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے، ان کے معاصرین میں کم ہی لوگ کتب رجال، ائمہ جرح و تعدیل اور رواۃ کے طبقات وغیرہ سے واقفیت میں ان کے ہم پایہ رہے ہوں گے، وسعت علم و نظر کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کتاب میں کوئی غلطی یا معمولی فرق و اختلاف بھی ہوتا تو وہ ان سے مخفی نہ رہتا اور وہ فوراً اس کی تصحیح فرما دیتے تھے، قاضی شوکانی (م ۱۲۵۰ھ) نے نیل الاوطار میں رجال کے جو غلط حوالے دیئے ہیں ان کی اپنے ذاتی نسخہ کے حاشیہ میں تردید کر دی ہے۔[1] جامع ترمذی مطبوعہ ہند میں "باب ما یقول اذا خرج من الخلاء" کی سند کے اندر "حدثنا محمد بن اسمٰعیل (البخاری)" کے بجائے "حدثنا محمد بن حمید بن اسماعیل" طبع ہوتا چلا آرہا ہے اس واضح غلطی کی سب سے پہلے انہی نے نشاندہی فرمائی۔[2] اور متعدد شواہد و قرائن سے ثابت کیا کہ مطبوعہ نسخہ میں نام صحیح طور پر درج نہیں ہے،[3] اس طرح کی متعدد مثالوں سے ان کی دقت نظر، قوت مطالعہ اور وسعت علم کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا کی فضل و کمال کا انکے معاصرین اور تلامذہ نے بھی مکمل اعتراف کیا ہے، مولوی محمد زبیر ڈیانوی لکھتے ہیں:

وللعلماء فی حقہ قصائد فی العربیۃ والفارسیۃ کلھا — علما نے انکی شان میں عربی و فارسی کے متعدد

---

[1] الحدیث امرتسر ۲۱ نومبر ۱۹۰۹ء ص ۹ [2] ایضاً [3] مولانا کے بعد مولانا احمد شاکر نے جامع ترمذی پر اپنی تعلیقات کے اندر بھی اس پر تنبیہ کی ہے، مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کی تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۱۲ (طبع اول) میں بھی اسکی طرف اشارہ موجود ہے۔

مذکورۃ فی ہذا یۃ الطالبین — قصیدے لکھے ہیں جو ہدایۃ الطالبین
الی مکاتیب الکاملین۵۱ — الی مکاتیب الکاملین میں مذکور ہیں ۔

مولانا کی مختلف کتابوں کے آخر میں جو قطعات تاریخ، تاریخ طبع اور اردو، فارسی، عربی کے متعدد قصیدے شامل ہیں، اُن میں بھی ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا گیا ہے۵۲ اور علمائے اہل حدیث کے علاوہ دوسرے طبقہ و مسلک کے علماء نے بھی ان کی تحسین و تعریف کی ہے۔

اخلاق و عادات | مولانا طبعاً شریف، متواضع اور ملنسار شخص تھے، اس لئے ہر طبقہ و مسلک کے علما اور اربابِ کمال سے ان کے اچھے تعلقات تھے، ان کی طبیعت میں حق پسندی تھی اس لئے دوسرے مسلک کے لوگوں کے کمالات کے اعتراف میں اور اپنے طبقہ کے بعض علماء کی غلط رایوں کی تردید میں جماعتی عصبیت مانع نہ ہوتی تھی، رفع الالتباس میں امام اعظم ابو حنیفہؒ کے علم و فضل کا بڑی فراخدلی سے اعتراف کیا ہے اور بعض مسائل میں اپنے سب سے محترم استاذ میاں صاحبؒ سے بھی اختلاف کیا ہے۵۳۔

انکسار اور فروتنی کی بنا پر اپنی بعض کتابوں پر اپنا نام دینا بھی پسند نہیں کیا، ہر شخص سے خندہ روئی کے ساتھ ملتے۔ ناگوار اور تکلیف دہ باتوں پر بھی چین بر جبیں نہیں ہوتے تھے، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری فرماتے ہیں، "اخلاق کی یہ کیفیت تھی کہ کبھی ان کی پیشانی پر بل نہیں دیکھا بلکہ حدیث شریف "تبسمک فی وجہ اخیک صدقۃ" پر پورے عامل تھے، میں نے اس حدیث کے عامل علما کو کم دیکھا ہے۵۴"۔

---

۵۱ یادگار گوہری ص ۱۱۰ ۵۲ ملاحظہ ہو اعلام اہل العصر، المکتوب اللطیف الی المحدث الشریف، عون المعبود ج ۴، التعلیق المغنی علی سنن الدارقطنی ج ۲، والکلام المبین فی الجہر بالتامین ۵۳ الحیاۃ بعد المماۃ ص ۳۲۳ و ۳۲۴ طبع اول ۵۴ اہلحدیث ۱۳ مارچ ۱۹۱۱ء ص ۴،

بڑے مہمان نواز فیاض طبع اور اہل علم کے نہایت قدرداں تھے، اس لیے ان کے گھر پر علماء و طلبہ کا ازدحام رہتا تھا، ان کا کتب خانہ ان لوگوں کے لیے وقف رہتا تھا، اپنی ذاتی کتابیں اہل علم کو بے تکلف ہدیۃً یا عاریۃً دیدیتے تھے، ان کے پاس جن کتابوں کے نسخے مکرر ہوتے ان کو دوسروں کو دیدینے میں پس و پیش نہ کرتے۔ شرح بخاری کے کئی نسخے ان کے پاس تھے، ان میں سے ایک کتب خانہ اصلاح المسلمین اور دوسرا مولوی محمد صاحب پٹنوی مالک مطبع احمدی کے حوالہ کردیا[1]۔ ان کے اخلاق و اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد زبیر ڈیانوی لکھتے ہیں۔

وله حب شدید مع العلماء	وہ علماء و محدثین اور طلبہ سے بڑی
المحدثین ومع الطلبة العلم	محبت کرتے تھے۔ . . . . راستبازی،
. . . . ومع ذلك كله هو	حیاء، سخاوت، ثقاہت، دیانت
موصوف بالصدق والحياء	اور امانت و عدالت سے متصف
والسخاء والثقة والديانة	اور جمعہ و جماعت کے پابند تھے۔
والامانة والعدالة وهو	
ملازم للجمعة والجماعة[2]	

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رقمطراز ہیں

وكان حليما متواضعا كريما	وہ بڑے حلیم، متواضع، شریف،
عفيفا صاحب صلاح وطريقة	پاکدامن، نیک اور عمدہ طور و
ظاهرة، محبا لاهل العلم[3]	طریقہ کے مالک اور اہل علم سے

[1] اہلحدیث ۲۸ اپریل ۱۹۱۵ء ص ۳ و ۴ [2] یادگار گوہری ص ۱۰۹ [3] نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۷۹

محبت کرنے والے تھے۔

مولانا حکیم سید عبد الحیؒ سے ان کی برابر خط وکتابت رہتی تھی، اور حکیم صاحب کو اپنی کتابوں "نزہۃ الخواطر" اور "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" کی ترتیب وتالیف میں ان کے کتب خانہ سے بڑی مدد بھی ملی۔ وہ خود تحریر فرماتے ہیں۔

وکان یحبنی للّٰہ سبحانہ	وہ مجھ سے اللہ کیلئے محبت کرتے تھے
وکنت احبہ وکان بینی	اور میں بھی، میرے اور ان کے
وبینہ من المراسلۃ مالم	درمیان خط وکتابت کا سلسلہ
تنقطع الی یوم وفاتہ[1]	انکی وفات کے روز تک جاری رہا

بعض اور مصنفین نے بھی ان کے علمی تعاون کا اعتراف کیا ہے،

(باقی)

[1] نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۶۹،

تذکرۃ المحدثین حصہ اوّل

اس میں صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام دارمی، اسحاق بن راہویہ۔ امام حمیدی، امام طحاوی کے حالات وسوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل ہے۔ قیمت

اسکی دوسری جلد جو زیر طبع ہے، اس میں ابن حبان۔ دار قطنی، حاکم صاحب مستدرک بیہقی، قاضی عیاض اور امام نودی وغیرہ کے حالات اور انکی خدمات حدیث کا ذکر ہے۔

مولفہ۔ ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین۔

جرأتِ حق گوئی

از
حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی، ایم، اے (علیگ)

سلیمان احمد

آئینِ جواں مردان حق گوئی و بے باکی
اللہ کے بندوں کو آتی نہیں روباہی

ڈاکٹر اقبال کا یہ مشہور شعر نہ معلوم کتنی بار پڑھا اور سنا ہوگا۔ لیکن گذشتہ دنوں جب کلیات اقبال کے مطالعہ کے دوران یہ راقم سطور کی نظر سے گذرا تو بالکل ایک نئی زمین اور نئے آسمان کا احساس ہوا، حقیقت یہ ہے کہ شاعر نے نبض دوراں پر انگلی رکھکر انسانی نفسیات کے ایک اہم پہلو کی نشاندہی کی ہے، خیر و شر کے وجود سے تو کوئی عہد خالی نہیں رہا ہے خواہ خیر القرون ہو یا عصر حاضر تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ابتدائی صدیوں میں باطل کی ساری شوکت و جبروت کے باوجود پوری جرأت و بے باکی کے ساتھ حق بات کہہ گذرنے کا پہلے جیسا رواج تھا اس نفاق پسندی اور مصلحت اندیشی کے دور میں پورے طور پر اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے،

ایمان کامل اور یقین محکم سود و زیاں کے اندیشہ سے بالاتر ہوتا ہے، اور جلال حق کے سامنے بڑی سے بڑی قوت و عظمت پر کاہ سے زیادہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کسی نے شیخ عز الدین بن عبد السلام سے پوچھا کہ آپ کو سلطان وقت کے دربار میں

بیباکی سے گفتگو کرتے وقت کوئی خوف لاحق نہیں ہوتا فرمایا کہ اللہ کی ہیبت ایسی پیش نظر رہتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں سلطان بلی کی طرح معلوم ہوتا ہے بلکہ چوہا ہوتا ہے۔ قادر یہ معاملہ کو دیکھ کر بیٹے سن کر انکے ہمراہ سب سینکڑوں کی ایک تعداد گئی۔

اسلام نے اعلان حق کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ

فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین (حجر ۔ ۹)

جو کچھ آپ کو حکم ملا ہے اسکو آشکارا طور پر سنا دیجئے اور مشرکین کی مطلق پروا نہ کیجئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر

بہترین جہاد ظالم حکمران کے سامنے حق بات کہنا ہے۔

اور تاکید کی کہ

من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان۔

(مسلم [illegible])

تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دینا چاہئے اگر ہاتھ سے اسکی طاقت نہ ہو تو پھر زبان سے نکیر کرنی چاہئے اور اسکی طاقت نہ ہو تو کم از کم دل سے اسکو برا سمجھنا چاہئے اور یہ ایمان کا (کمزور ترین درجہ) ہے۔

صحابہ کرام نے جان کو ہتھیلی پر رکھ کر اس حکم کی تعمیل کی۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کی حق گوئی تاریخ میں یادگار رہے۔ وہ اعلان حق کی راہ میں کسی خطرہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے، بارہا اس کی پاداش میں اتنی مار کھاتے کہ بے دم ہو جاتے، ان کی حق گوئی کی تعریف دربار رسالت میں ان الفاظ سے کی گئی۔

"آسمان کے نیچے، اور زمین کے اوپر ابوذر سے زیادہ حق گو کوئی نہیں" (جامع ترمذی مناقب ابی ذر)

چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب وہ شام میں تھے۔ تو وہاں کے ...

مسلمانوں میں جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی، اس پر انھوں نے بے محابہ وار دگیر کی اور اس باب میں حضرت معاویہؓ جیسے صاحب اثر امیر کی بھی پرواہ نہیں کی۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بہت طویل خطبہ دیا، جس میں فرمایا:"ہوشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے، یہ سن کر حضرت ابوسعیدؓ رو دیئے، اور فرمایا۔ افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں، اور ہیبت میں آگئے، (الترغیب والترہیب منذری)

اسلامی تاریخ کا ایک عہد سعادت وہ تھا، جب خود خلیفۂ وقت لوگوں کو حق گوئی کی تاکید کرتا تھا، اور چاہتا تھا کہ اس کے کاموں میں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو . . . . . لوگ برملا اسے متنبہ کر دیں تاکہ وہ اپنی اصلاح کر کے آخرت کی باز پرس سے محفوظ ہو جائے۔

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کے بعد سب سے پہلا اعلان یہ کیا کہ "لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں، اور تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھے کام کروں تو تم میری مدد کرو، اور اگر برائی کروں تو مجھے درست کردو۔"

اسی طرح دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ نے بھرے مجمع میں لوگوں سے یہ سوال کیا کہ اگر میں سیدھی راہ سے ہٹ جاؤں اور کج روی اختیار کروں تو تم کیا کرو گے مجمع سے کئی آوازیں آئیں۔ اگر تم کج ہو جاؤ گے تو ہم تمھیں سیدھا کر دیں گے۔ یہ سن کر آپؓ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو مجھے سیدھا کر سکتے ہیں۔

اس عہد روح پرور میں تنقید کی آزادی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار حضرت عمرؓ نے

اپنے خطاب میں فرمایا "اسمعوا واطیعوا" یعنی اے لوگو سنو اور اطاعت کرو۔ مجمع میں سے ایک بدو اٹھا اور اس نے کہا "لا نسمع ولا نطیع" (ہم نہ تو آپ کی سنیں گے اور نہ اطاعت ہی کریں گے) جب تک آپؓ یہ نہ بتا دیں کہ آپ کے جسم کا اتنا لمبا کرتا کیسے بن گیا جب کہ مال غنیمت کی جو چادریں تقسیم ہوئی تھیں ان میں کوئی اتنی بڑی نہ تھی کہ آپ کا کرتا تیار ہو سکے۔

آپؓ نے یہ سن کر اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کو اشارہ فرمایا کہ تم اس کا جواب دو انھوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں نے اپنے حصے کی چادر بھی امیر المؤمنین کو دے دی تھی اور اس طرح یہ کرتا دو چادروں سے مل کر تیار ہوا ہے۔ یہ سن کر اس بدو نے کہا اب آپ فرمائیے۔ ہم آپ کا حکم سنیں گے۔ اور اسکی اطاعت کریں گے۔ (الفاروق)

حضرت حسن بصریؒ کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے، وہ اپنی ضرب المثل فصاحت و بلاغت تبحر علمی اور پرتاثیر تقریر کے ساتھ فضائل اخلاق میں بھی ممتاز تھے، وہ حق بات کہنے میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے، یہاں تک کہ ایک بار انھوں نے خلیفۂ وقت یزید بن عبدالملک پر برملا تنقید کی، اسی طرح یزید بن ابی المہلب اور ابن الاشعث کی شورش کے زمانہ میں کسی نے اس کے بارہ میں سوال کیا آپ نے فرمایا نہ اس کا ساتھ دو نہ اس کا "ایک شامی نے عرض کیا" اور نہ امیر المؤمنین کا"۔ یہ سن کر آپ کو غصہ آگیا، پھر ہاتھ اٹھا کر کہا ہاں نہ امیر المؤمنین کا"۔ حجاج کی سفاکی اور ... شامی مشہور ہے، مگر حسن بصری کی زبان اس کے زمانے میں بھی اظہار حق سے باز نہ آئی۔ (طبقات ابن سعد ج ۷، قسم اول ص ۱۱۹)

اس عہد کے بعد اس سے بھی مشکل زمانہ آیا لیکن کوئی دور بھی ایسے مردان حق آگاہ سے خالی نہیں رہا۔

امام عبداللہ بن عمر دوسری صدی کے ایک مشہور محدث اور فقیہ گذرے ہیں ایک بار انھوں نے ایام حج میں خلیفہ ہارون الرشید کو مسعیٰ (صفا و مروہ کے درمیان) روک کر اسکی بد عنوانیوں پر سرزنش کی۔

شیخ نے فرمایا ہارون!

کیا تم ان حاجیوں کی تعداد شمار کر سکتے ہو؟ خلیفہ نے کہا بھلا انھیں کون شمار کر سکتا ہے؟ یہ سن کر شیخ نے فرمایا "اچھا کان کھول کر سن لو"

ان میں سے ہر ہر شخص خود اپنی ذات کا ذمہ دار ہے، لیکن تم خدا کے نزدیک ان تمام بندگان خدا کے ذمہ دار ہو" جب ایک انسان خود اپنے مال میں اسراف کرتا ہے تو وہ لائق تعزیر قرار پاتا ہے، تو پھر اگر وہ عام مسلمانوں کے مال میں فضول خرچی کا مرتکب ہو تو اس کی سزا کس قدر بڑی ہوگی۔ (مراۃ الجنان جلد اول ص ۲۰۶)

حافظ قبیصہ بن عقبہ (المتوفی ۲۱۵ھ) اپنے علم و فضل کے ساتھ گوناگوں اخلاقی محاسن کا مجموعہ تھے، ارباب سطوت و شوکت کے سامنے حق بات کہہ گذرنے سے کبھی باز نہ رہتے تھے، ایک بار امیر ابو دلف کا لڑکا دلف اپنے خدم و حشم کے ساتھ ان سے ملاقات کرنے ان کے گھر گیا۔ لیکن وہ باہر نہیں نکلے۔ کسی نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا "حضرت جبل کا شاہزادہ باہر کھڑا ہے اور آپ باہر نہیں نکلتے" راوی کا بیان ہے کہ شیخ اس عالم میں باہر تشریف لائے کہ ان کی لنگی سے ایک خشک روٹی کا ٹکڑا لٹک رہا تھا، اور فرمایا

من رضی بھذا ما یصنع	جو روٹی کے اس ٹکڑے پر قانع اور
یا ابن ملك الجبل	مطمئن ہو اسے شاہزادہ جبل سے کیا غرض

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی ۱/۳۴۳)

یہ واقعہ جرأت و بے باکی کے ساتھ قناعت و استغنا کی بھی بہترین مثال ہے،

ابن ابی ذئب کی حق گوئی | حافظ ابن ابی ذئب (المتوفی ۱۵۹ھ) کے صحیفۂ کمال کا سب سے درخشاں باب ان کی جرأت و حق گوئی ہے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اعیان سلطنت کے روبرو حق بات کہہ گذرنے سے کبھی گریز نہیں کیا، اور اس بارے میں بسا اوقات وہ اتنا غلو کرتے تھے کہ ان کے عقیدت مندوں کو بڑی تشویش پیدا ہو جاتی تھی، مگر ان کے پایۂ ہمت میں کبھی لغزش نہیں پیدا ہوئی۔ ان کے متعلق کتابوں میں یہ تصریح ہے۔

كان من اقول اهل زمانه للحق ۔ (تہذیب التہذیب ۹/۳۰۶)
وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے حق گو تھے۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔

ابن ابی ذئب اقوم بالحق من مالك عند السلاطين
وہ سلاطین کے سامنے امام مالک سے بھی زیادہ حق گو ثابت ہوئے۔

(خلاصہ تہذیب ذکر ابن ابی ذئب)

ان کے اس وصف کے اظہار کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ ان میں سے دو ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے، ایک مرتبہ زمانہ حج میں خلیفہ مہدی مسجد نبوی میں داخل ہوا تمام حاضرین نے دو رویہ ایستادہ ہو کر اس کا استقبال کیا، اتفاق سے ابن ابی ذئب بھی وہاں موجود تھے، مگر وہ حسب سابق اپنی جگہ بیٹھے رہے، مسیب بن زہیر نے جب ان سے کہا کہ۔ کھڑے ہو جائیے نا! امیر المؤمنین تشریف لائے ہیں، تو شیخ نے بہت سکون اور طمانیت بھرے لہجہ میں فرمایا

انما يقوم الناس لرب العالمين (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۰۰)
صرف پروردگار عالم کے لیے لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔

ان ہی کا ایک دوسرا واقعہ یہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ وہ خلیفہ ابوجعفر منصور کے پاس پاس جاکر سختی کے ساتھ ظلم و جور سے باز رہنے کی تلقین کی منصور نے سب کچھ سن کر گردن جھکالی۔ اور محمد بن ابراہیم سے کہا

هذا الشيخ خير اهل الحجاز (مرآة الجنان ۱/۳۴۰)
یہ بزرگ حجاز کے بہترین لوگوں میں ہیں۔

ایک بار خلیفہ منصور نے ان سے دریافت کیا کہ میرے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے شیخ ابن ابی ذئب پہلے تو خاموش رہے۔ لیکن جب خلیفہ نے قسم دلا کر پوچھا تو فرمایا۔

اللهم لا أعلمك الا ظالماً جائراً — بخدا میں تجھے ظالم وجابر کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتا ہوں۔

خلق قرآن کے مسئلہ میں ابو نعیم کی حق گوئی، خلیفہ مامون الرشید کے آخری عہد حکومت میں خلق قرآن کا فتنہ گرم ہو چکا تھا، معتزلہ کے اثر سے مامون کو اس مسئلہ میں بے حد غلو تھا چنانچہ وقت کے تمام مشاہیر علماء اور فقہاء اس فتنہ کی زد میں آئے جیسا کہ معلوم ہے اس ابتلاء و آزمائش کا سب سے زیادہ نشانہ امام احمد بن حنبل کی ذات تھی لیکن مامون اور اس کے بعد معتصم انتہائی جبر و تشدد کے باوجود ان سے اس باطل عقیدہ کا اقرار نہ کرا سکے۔

معتصم باللہ کے عہد میں یہ فتنہ حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ اس نے اپنے تمام ممالک محروسہ میں فرامین جاری کر دیئے تھے، کہ علماء وقت سے زبردستی عقیدۂ خلق قرآن کا اقرار کرا لیا جائے چنانچہ جو ارباب علم و فضل میدان عزیمت وہمت کے مرد نہ تھے، انھوں نے رخصت پر عمل کرتے ہوئے سر تسلیم خم کر دیا لیکن بہت سے اصحاب دعوت وعزیمت ایسے بھی تھے، جنھوں نے خلق قرآن کے اقرار کے بدلہ میں طوق و سلاسل اور دار و رسن کو ترجیح دی ان ہی اصحاب عزیمت میں ایک اہم شخصیت حافظ ابو نعیم کی بھی تھی۔

مشہور مؤرخ خطیب بغدادی نے اس فتنہ میں ابو نعیم کے ابتلا کی پوری تفصیل درج کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابو نعیم کوفہ ہی میں تھے کہ فرمان خلافت کے تحت والی کوفہ نے علماء کو طلب کیا، ابو نعیم بھی تشریف لے گئے، ان سے پہلے ابن ابی حنیفہ، احمد بن یونس اور ابو غسان وہاں پہونچ چکے تھے، والی نے سب سے پہلے ابن ابی حنیفہ سے اقرار کرنے کے لیے کہا۔ انھوں نے فوراً حکم کی

تعمیل کی. پھر اس نے ابونعیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا، دیکھو انھوں نے (ابن ابی حنیفہ) نے بھی اقرار کر لیا ہے، ابونعیم نے یہ سن کر بڑی بے باکی کے ساتھ کہا کہ میں نے کوفہ میں کم وبیش سات سو شیوخ کو یہ کہتے سنا ہے کہ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق (قرآن خدا کا کلام غیر مخلوق ہے) اور یہی میرا بھی عقیدہ ہے خواہ میری گردن سر سے جدا کر دی جائے مگر میں اس عقیدہ سے باز نہیں آسکتا (تاریخ بغداد ج ۱۲/ ۳۴۹)

حافظ یحیٰ مصمودی کی جرأت | حافظ یحیٰ مصمودی جو امام مالک کے عزیز ترین شاگرد اور موطا کے مستند ترین راوی شمار ہوتے ہیں مسائل شریعت میں وہ اپنی رائے کا برملا اظہار کرتے تھے انھیں کبھی رعب شاہی مرعوب نہیں کر سکا ایک بار اندلس کے اموی حکمراں عبدالرحمٰن بن حکم ماہ رمضان المبارک میں کفارہ صوم کا مرتکب ہو گیا. فکر دامنگیر ہوئی اس نے شہر کے تمام فقہاء کو بلا کر پوچھا کہ اس غلطی کا کفارہ کیا ہے۔ یحیٰ مصمودی نے فرمایا کہ امیر کو پے در پے دو مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ دربار خلافت سے واپس آنے کے بعد لوگوں نے عرض کیا کہ امام مالک تو اس نوع کے مسائل میں "خیار" کے قائل ہیں، یعنی ان کے نزدیک کفارہ صوم میں روزہ دار کو اختیار ہے، چاہے، غلام آزاد کر دے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ پھر آخر آپ نے دو ماہ کے روزے ہی پر کیوں اصرار کیا۔ یہ سن کر شیخ یحیٰ نے اس کا یہ حکیمانہ جواب دیا کہ

> اگر ہم نے امیر کے لیے یہ دروازہ کھول دیا تو اس کے لیے بہت آسان ہو گا کہ روز روزہ شکنی کرے اور کفارہ میں غلام آزاد کر دے لیکن میں نے اس کے لیے مشکل صورت اختیار کی تاکہ آئندہ وہ اس کی جرأت نہ کر سکے۔ (ابن خلکان ج ۳ ص ۱۰۲)

اندلس کے مشہور اموی حکمراں عبدالرحمٰن الناصر نے جب اپنے یادگار زمانہ شہر مدینۃ الزہرا کی تعمیر میں بےشمار دولت صرف کر ڈالی، اور محل شاہی میں سونے کی اینٹیں لگانی چاہیں تو قاضی قرطبہ

منذر بن سعید سے مسلمانوں کے مال میں خلیفہ کا یہ اسراف بے جا دیکھا نہ جاسکا۔ اور انھوں نے جمعہ کے خطبہ میں اس پر سخت تنقید کی۔ اور خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا

"مجھے یہ گمان نہ تھا کہ شیطان اس حد تک آپ پر مسلط ہو سکتا ہے، کہ وہ آپ کو کفار اور خدا کے باغیوں تک پہونچا دے" یہ سن کر الناصر کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور اس نے قاضی موصوف کو درمیان ہی میں ٹوکتے ہوئے کہا " غور تو کیجیے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے مجھے کفار کے مقام تک پہونچا دیا"

قاضی موصوف نے اسی طرح پر زور لب و لہجہ میں جواب دیا۔ ہاں میں بالکل درست کہہ رہا ہوں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے۔

ولولا أن يكون الناس	اگر ایسا نہ ہوتا کہ لوگ ایک امت
أمة واحدة لجعلنا لمن يكفر	بن جائیں تو ہم خدا سے بغاوت اور
بالرحمن لبيوتهم سقفا	کفر کرنے والوں کے مکانات کی
من فضة ومعارج عليها	چھتیں اور سیڑھیاں چاندی کی بنا
يظهرون ولبيوتهم أبوابا	دیتے جن پر وہ چڑھتے۔ اور ان کے
وسررا عليها يتكئون۔	گھروں کے لیے دروازے اور تخت
(زخرف — ۳۳)	بنا دیتے جن پر وہ آرام کرتے۔

اس وقت خلیفہ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی، اور خدا کے خوف سے اس کا سر جھک گیا۔ اور اس نے فوراً منارے کو گرا کر چاندی کی اینٹوں کی جگہ مٹی سے اس کو دوبارہ بنانے کا حکم دیا۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام کا شمار ساتویں صدی ہجری کی بہت باکمال اور باعظمت

شخصیتوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے علم و تقویٰ اور دعوت و اصلاح کے ساتھ حق گوئی و بیباکی میں بھی نادرۂ روزگار تھے۔ ان کی جرأت کا ایک حیرت انگیز واقعہ علامہ سبکی نے یہ نقل کیا ہے کہ عید کے دن قلعہ میں دربارِ شاہی تھا، بادشاہ پورے تزک و احتشام کے ساتھ سریر آرا تھا، دو رویہ افواجِ شاہی دست بستہ کھڑی تھیں، امراء حاضر ہو کر آداب و تسلیم بجا لاتے اور زمین بوس ہوتے تھے۔ اسی بھرے دربار میں دفعۃً شیخ نے بادشاہ کو نام لے کر خطاب کیا:

"ایوب! خدا کو تم کیا جواب دوگے، جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم مصر کی سلطنت اس لئے دی تھی کہ شراب آزادی سے پی جائے" بادشاہ نے کہا "کیا یہ واقعہ ہے؟" شیخ نے بلند آواز سے فرمایا "ہاں فلاں میخانہ میں شراب آزادی سے بک رہی ہے، اور دوسرے ناگفتنی کام بھی ہو رہے ہیں، اور تم یہاں بیٹھے ہوا دادِ عیش دے رہے ہو،" بادشاہ نے کہا "جناب والا میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، یہ میرے والد کے زمانہ سے ہو رہا ہے" شیخ نے فرمایا کہ پھر تم بھی ان ہی لوگوں میں سے ہو جن کا جواب یہ ہوتا ہے "انا وجدنا آباءنا علیٰ اُمۃ" (یعنی یہ ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آرہا ہے) سلطان نے فوراً اس شراب خانہ کی بندش کا حکم جاری کیا۔ (طبقات الشافعیہ ج ۵ تذکرہ عز الدین بن عبد السلام)

امام نووی کی بے باکی: ان ہی حق پرست علماء میں صحیح مسلم کے شارح امام محی الدین نووی بھی ہیں جنھوں نے مصر کے نامور ترک فرمانروا الملک الظاہر بیبرس کے باشندگان شام پر مظالم کے سلسلہ میں اس کو نہ صرف بڑے جرأتمندانہ خطوط لکھے، بلکہ اس سے بالمشافہ گفتگو بھی کی، ان مکاتیب کا یہاں نقل کرنا موجب طوالت ہے لیکن بادشاہ کے مقابلہ میں اُن کی ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے،

شاہ ظاہر تاتاریوں سے جنگ کرنے کے لئے مصر سے نکلا اور شام پہنچا، اور وہاں کے

علما سے یہ فتوی حاصل کیا کہ اس جنگ کی تیاری کے لئے رعیت کے اموال پر قبضہ کر سکتا ہے،

جب علما کا فتوی اس کے پاس پہنچا تو اس نے دریافت کیا کہ علما میں سے کوئی باقی تو نہیں رہا لوگوں نے کہا صرف شیخ محی الدین نودی نے دستخط نہیں کئے ہیں، ظاہر نے شیخ کو حاضر کرنے کا حکم دیا، جب وہ آئے تو ان سے کہا "دوسرے علما کی طرح آپ بھی دستخط کر دیں" انھوں نے انکار کیا،

ظاہر نے پوچھا، آپ دستخط سے انکار کیوں کر رہے ہیں

امام نووی نے فرمایا۔ میں جانتا ہوں کہ تم امیر بندقدار کے غلام تھے اور تمھارے پاس کچھ نہ تھا۔ پھر اللہ نے تم پر احسان کیا۔ اور تمھیں بادشاہت عطا کی۔ میں نے سنا ہے کہ تمھارے پاس ایک ہزار غلام ہیں، اور ہر غلام کے پاس سونے کا کمر بند ہے۔ دو سو لونڈیاں ہیں اور ہر لونڈی کے پاس زیورات کا ایک بکس ہے، جب تم یہ تمام دولت صرف کر لوگے اور تمھارے غلاموں اور لونڈیوں کے پاس سوت کے کمر بند اور معمولی لباس کے سوا کچھ نہ بچے گا تب میں تمھیں فتوی دونگا کہ رعیت کے مال پر ہاتھ ڈالو۔

یہ سن کر ظاہر غصہ سے بے تاب ہو گیا اور حکم دیا کہ تم میرے شہر دمشق سے فوراً نکل جاؤ۔

امام نووی نے فرمایا بہتر ہے، یہ کہکر شیخ شام کے ایک دیہات "نوی" میں جا کر مقیم ہو گئے، شیخ کے جانے کے بعد دوسرے فقہاء نے بادشاہ سے عرض کیا کہ شیخ محی الدین ہمارے کبار علماء وصلحاء میں شمار ہوتے ہیں اور عوام ان ہی کی اقتدا کرتے ہیں، ان کا دمشق سے نکل جانا مناسب نہیں ہے، یہ سن کر ظاہر نے شیخ کی واپسی کا حکم صادر کیا لیکن جب بادشاہ کا فرمان شیخ کو ملا تو انھوں نے جانے سے انکار کیا، اور فرمایا کہ جب تک ظاہر دمشق میں موجود ہے

میں وہاں نہیں جاسکتا۔ اس واقعہ کے ٹھیک ایک ماہ بعد ظاہر کا انتقال ہوگیا۔

ہندوستانی تاریخ میں حق گوئی کی مثالیں جرأت، صاف گوئی، حق پرستی اور بیباکی کی بصیرت افروز مثالیں پیش کرنے والے "جوانمرد" تاریخ کے ہر دور میں بکثرت پائے جاتے رہے ہیں،

سطور بالا میں دوسرے ممالک کی ایک جھلک دکھانے کے بعد اب ذیل میں ہندوستان کے اسلامی عہد سے بھی اس کی کچھ مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

شمس الدین حق گو کرمانی، مالوہ اور ۸۶۱ھ کے سلطان محمود خلجی کا معمول تھا کہ وہ اپنے لباس اور غذا کے لیے خود کوئی کام کرتا تھا، وہ وہی چاول گیہوں اور کپڑے استعمال کرتا، جو اس کو جائز طریقے سے حاصل ہوتے تھے، سفر میں لکڑی کے تختوں پر بوئی ہوئی سبزیاں اس کے ساتھ رہتیں، ایک بار وہ احمد آباد بیدر پر حملہ آور ہوا جس کا فرمانروا بہمنی خاندان کا نظام شاہ تھا، اس حملہ کے بعد احمد آباد کے ایک بزرگ مولانا شمس الدین حق گو کرمانی کی خدمت میں حاضر ہوا سلطان نے ملاقات کے دوران میں کہا میرے پاس ترکاری ختم ہوگئی ہے، اس سے بہت پریشانی ہے۔ لکڑی کے تختوں پر ترکاری پیدا کرتا ہوں مگر وہ شاہی باورچی خانے کے لیے کافی نہیں ہوتی اگر کسی شخص کے پاس حلال روپیے سے خریدی ہوئی زمین موجود ہو تو مجھے بتایئے تاکہ میں اس کو اچھی قیمت دے کر سبزیاں خرید دوں" یہ سن کر مولانا شمس الدین حق گو نے فرمایا: "اے سلطان! ایسی بات نہ کرو جس کو سن کر تمھارا مذاق اڑایا جائے۔ مسلمانوں کے ملک میں آکر ان کے مال واسباب کو تباہ و غارت کرنا، ان کے گھروں اور آبادیوں کو ویران کرنا اور اس کے بعد ترکاریوں کی خرید و فروخت میں حلال و حرام کا یہ خیال قابل مضحکہ نہیں تو کیا ہے، ؟ یہ طرز عمل خدا ترسی سے بہت دور ہے، یہ سن کر سلطان کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اور اس نے کہا، آپ سچ کہتے ہیں۔ (تاریخ فرشتہ ۳۴۶/۱)

مولانا عبداللہ اجودھنی | سلطان سکندر لودھی کی شہزادگی کے زمانہ میں ہندو کرکشیتر کے کنڈ میں آکر اشنان کیا کرتے تھے۔ جو ایک مذہبی میلہ بن گیا تھا، سکندر لودھی نے اس کو روک دینے کی کوشش کی۔ اس کے لئے اس نے علماء کا ایک محضر طلب کیا۔ جس میں ملک العلماء عبداللہ اجودھنی بھی شریک ہوئے۔ تمام علماء نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان ہی کی رائے حرف آخر ہے، سکندر لودی مولانا عبداللہ کی طرف مخاطب ہوا تو انھوں نے پوچھا کہ کرکشیتر کیا چیز ہے؟ جواب ملا کہ ایک حوض ہے جہاں ہندو ہر شہر سے آکر غسل کرتے ہیں، مولانا نے پوچھا "کب سے یہ رسم جاری ہے؟" جواب ملا قدیم رسم ہے" مولانا عبداللہ نے فتویٰ دیا کہ کسی قدیم معبد کو تباہ کرنا جائز نہیں ہے، سکندر لودی نے اس فتویٰ کو اپنی منشا کے خلاف پایا ...... اور غصہ سے خنجر بکف ہو کر کہنے لگا یہ جانبدارانہ فتویٰ ہے۔ میں پہلے تجھے مار دوں گا۔ پھر کرکشیتر کو تباہ کر دوں گا۔ مولانا نے بڑی دلیری سے جواب دیا:-

"اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی نہیں مرتا، جب کوئی ظالم کے پاس آتا ہے تو وہ اپنی موت کے لئے پہلے سے تیار ہو کر آتا ہے، ہر چہ بادا باد آپ نے مجھ سے دریافت کیا میں نے شرعی مسئلہ بیان کر دیا، اگر آپ کو شریعت کی پرواہ نہیں ہے تو پھر پوچھنے کی حاجت ہی کیا تھی"

یہ سن کر سلطان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، جب مجلس برخاست ہو گئی تو سکندر نے مولانا سے کہا:-

"میاں عبداللہ! آپ گاہے گاہے مجھ سے ملاقات کرتے رہیں"

(بزم رفتہ کی سچی کہانیاں بحوالہ
واقعات مشتاقی ص ۱۹۶)

دیوانِ حافظ

(ایک ہندوستانی شاعر حافظ کے دیوان کا ایک نادر مخطوطہ)

از

جناب کبیر احمد صاحب جائسی لکچرر شعبۂ فارسی - جامعہ ملیہ دہلی،

چند ماہ قبل راقم پروفیسر اظہر انصاری صدر شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ساتھ ذاکر حسین لائبریری کے نئے مخطوطات کی فہرست بنا رہا تھا، تو ایک مخطوطہ نظر سے گذرا جس پر دیوان حافظ لکھا ہوا تھا، یہ حافظ ایک ہندوستانی شاعر ہے، مخطوطہ ناقص الآخر ہے، ترقیمہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ کب لکھا گیا ہے، مگر کاغذ اور روشنائی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہ زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ سال قبل نقل ہوا ہوگا، اور اگر بہت قدیم ہوگا تو اسکی کتابت تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوئی ہوگی، مخطوطہ میں فارسی اور اردو کلام دونوں ہیں، ناقص الآخر ہونے کی وجہ سے ردیف ق سے ی تک کی اردو غزلیں اس میں نہیں ہیں۔

اس مخطوطہ کو دیکھ کر خیال ہوا کہ مختلف تذکروں کی مدد سے اس شاعر کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے، اس سلسلہ میں عقد ثریا، تذکرہ ہندی، ریاض الفصحا، گلشن بے خار، نکات الشعراء، اور گلشنِ ہند کا جائزہ لیا گیا، مگر ان میں اس شاعر کا حال کچھ نہ معلوم ہو سکا،

[illegible] بارہویں صدی ہجری کے تذکرے مثلاً تذکرہ حسینی، سرو آزاد اور خزانۂ عامرہ کا بھی مطالعہ کیا گیا مگر اس نام کا کوئی شاعر نہ ملا

لغت نامہ دہخدا اور تذکرہ صبح گلشن تالیف ۱۲۹۵ھ میں حافظ کے نام سے ایک شاعر کا ذکر نظر سے گذرا۔ لغت نامۂ دہخدا میں ہے :-

"حافظ: سید اکبر علی یکے از شعرائے سادات ہندوستان، او خواہرزادہ وشاگرد مولوی اکرام الدین حیران است" ونسبت وے بجعفر برادر امام حسن عسکری میرسد، و سید جلال الدین بخاری یکے از اجداد وے بودہ و آباو اجداد او در دہلی، از مشائخ طریقت بودند او راست

لرزہ می افتد زماہی تا بماہ آسمان
نالہ ام چوں از دل پر اضطراب آید برون[1]

صبح گلشن میں ہے :-

"حافظ، سید اکبر علی، حافظ قرآن است ہمشیرزادہ وشاگرد مولوی اکرام الدین حیران، نسبش بحضرت جعفر برادر امام حسن عسکری منتہی میشود وبچند واسطہ تا سید جلال الدین بخاری میرود، آبار کرام واجداد عظام حافظ مشائخ طریقت گذشتہ اند وطینت اکثری از ایشان بخاک دہلی سرشتہ والد حافظ سید محمد علی ابن سید رفیع الدین در قصبہ جالندھر مضافات صوبہ لاہور توطن گزیدہ حافظ ہمانجا متولد گردید"

دوپارہ حافظ بیدل دل قمر گردد　　　اگر ز پردۂ ابر مہ جبیں شود پیدا

---

[1] لغت نامہ دہخدا جلد ح ص ۱۰۹

نمی دانم چہ لذت داشت یارب آب شمشیرش
کہ چشم زخم دیگر داشت بسمل گشتہ تخجیرش

لرزہ می رفتند ز ماہی تا بماہ و آسمان
نالہ ام چوں از دلم با اضطراب آید بروں

رُباعی

جاناں دم نزع دیدنی ہست بیا | احوال دلم شنیدنی ہست بیا
اے دادہ رُخ تو آب زنگی گل را | رنگِ رُخ ما پریدنی ہست بیا

مذکورہ بالا دونوں تذکروں میں حافظ کو زیر نظر مخطوطہ کا شاعر نہیں قرار دیا جاسکتا، اسکی وجہ تو یہ ہے کہ لغت نامہ دھخدا میں جو شعر درج ہے اس کی زمین ردیف و قوافی میں زیر بحث حافظ کی بھی ایک غزل موجود ہے، لیکن یہ شعر اس میں نہیں ملتا، اس طرح صبح گلشن میں جو رُباعی اور مزید دو شعر درج ہیں، وہ بھی پیش نظر مخطوطہ میں نہیں ہیں، اس کے علاوہ زیر بحث حافظ اپنی غزلوں میں جگہ جگہ اپنے پیر کا نام لکھتا ہے، مگر لغت نامہ دھخدا اور صبح گلشن کا حافظ کسی کا مرید نہیں معلوم ہوتا، اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ وہ کسِ کا مرید رہا ہوگا تب بھی یہ جانے بغیر چارہ نہیں ہے، کہ اس کو اپنے پیر سے غیر معمولی ارادت نہیں تھی اسی وجہ سے تذکرہ نگاروں نے اس کے پیر کے ذکر سے احتراز کیا ہے،

ذاکر حسین لائبریری میں موجود تذکروں میں گلستان سخن ہی ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں شاعر کا ذکر ملتا ہے اسکی تکمیل ۱۲۷۴ھ میں ہوئی تھی، لوح کتاب کے مطابق اسکی

لہ تذکرہ صبح گلشن تالیف ۱۲۹۵ھ ص ۱۱۶

میں حسب ذیل معلومات فراہم ہوتے ہیں

"حافظ تخلص خدا طلب صوفی مشرب سراپا ...

حافظ مشرب، اس عجز و زمان میں خاکساری اور نفس کشی اس صاف دل و پاک اعتقاد پر ختم تھی، کمال تسلیم سے الف قد کو دال بنا دیا تھا، اور رکوع و سجود کے شوق میں منار قامت کو محراب کر دیا تھا، موافق اس قول کے کہ المومن مرآۃ المومن یعنی مومن سب کو اپنا سا سمجھتا ہے، وہ ہر کسی کو نیک سمجھتا اور اپنے سے بہتر جان کر کمال تواضع اور فروتنی سے پیش آتا تھا، علم موسیقی میں مہارت چست اور اس فن کی سمجھ بہت درست، جنتر اور بین بجانے میں دستگاہ تمام، خیال اور دھرپت گانے میں قدرت بالا کلام مگر وہ سب مضامین عرفان سے مالامال ہوتے ..... اور وہ راگ ان معانی بلند کی رو سے عارف کو مدارج علیا تک لے پہونچے، گویا یہ شعر مولانا اشرف العارفین جلال الدین رومی قدس سرہ کا اس کے نغمے کی شان میں ہے،

این زمزمہ مرکب یست مرد روح ترا   بردارد و خوش بعالم یار برد

شعر گوئی کی طرف بھی توجہ بہت فرماتا، اور اس کے پردے میں بھی وہی راگ گاتا، سوز سینہ شبستان ابیات میں شمع افروز اور داغ محبت بجز اوراق میں ور سوزاں ہر چند کہ وہ لوگ مادہ ذوق سے لذت یاب اور لطف شعر سے آشنا ہیں اس کے دست بخت طبیعت سے مزہ نہ اٹھاتے لیکن اہل مذاق کہاں مانتے

[illegible] اپنے سے بیگانہ کر دیتی تھی، ازبسکہ یہ اہل اس کے دل کے اسرار تھے، اور اسرار باطن کے سوا اس سے کم کسی کو اختلاط تھا، سچ ہے کہ اہل کمال کا حال ہی خوب جانتا، شاہ نظام الدین معروف شاہ جی کہ ز نگر صورت وہ درویش سیرت اور دنیا ظاہر و فقیر باطن تھے ہمیشہ اس صحبت فیض منقبت کو مغتنم جانا کئے، اور بعد اس کی وفات کے اپنے نفس واپسین تک صرف افادات پیشین کو نشتے زبان کرتے رہے، ایک مدت ظاہرا در ہوشیار باطن میرا دوست تھا کہ فی الجملہ مجھ کو اس سے اعتقاد اور سوز دل وگداز باطن مثل شمع اس کے ظاہر سے ٹپکتا تھا، میں نے اس پاک باطن نیک کردار کی زبان سے یوں سنا کہ ایک روز صوفیان حقیقت شناس کا ہنگامہ گرم تھا، اس جلسے میں اس روشن ضمیر نے ایک رباعی عارفانہ پڑھی، اور سب حلقے کو ایک حال طاری ہوا، اس جگہ ایک لڑکا سات آٹھ برس کا بھی حاضر تھا، اس کا بھی وہی احوال ہو گیا، اور جب مجلس تمام ہوئی دوپہر کے بعد اسکو ہوش آیا امر نا بدل وقت فرماتے ہیں"

ع :- "حق ایں طائفہ عریانی اجازت[1]"

صابر گورگانی کی اس طویل عبارت آرائی کے باوجود اس بات کا مطلق پتہ نہیں چلتا کہ اس شاعر کا کیا نام تھا، کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا، کہاں کا رہنے والا تھا، کب، کس طرح زندگی بسر کی، تعلیم کیسی، اور کہاں تک ہوئی، انکے پیر شاہ جی کس سلسلے سے منسلک تھے، ان کا انتقال کب ہوا، اگر تذکرہ کی ترتیب سے یہ نتائج ضرور اخذ کئے جا سکتے ہیں،

ا۔ تذکرہ گلستان سخن کی ترتیب کے زمانے میں شاعر زندہ نہیں تھا، ورنہ اس کا تذکرہ ماضی بعید کے صیغہ میں نہ ہوتا،

---

[1] گلستان سخن ص ۱۹۵، ۱۹۶

لیکن ان تذکروں کے بہت سے لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے حقیقت حال کچھ بھی ہو اس تذکرہ سے حافظ کے بارے میں حسب ذیل معلومات فراہم ہوتی ہیں:

"حافظ تخلص خدا طلب صوفی مشرب سراپا آگاہ معارف انتباہ یادگار سلف حافظ آشنا مشرب، اس عجز و زمان میں خاکساری اور نفس شکنی اس صاف دل و پاک اعتقاد پر ختم تھی، کمان تسلیم سے الف قد کو دال بنا دیا تھا، اور رکوع و سجود کے شوق میں منار قامت کو محراب کر دیا تھا، موافق اس قول کے کہ المومن مرآۃ المومن" یعنی مومن سب کو اپنا سا سمجھتا ہے، وہ ہر کسی کو نیک سمجھتا اور اپنے سے بہتر جان کر کمال تواضع اور فروتنی سے پیش آتا تھا، علم موسیقی میں مہارت حیثیت اور اس فن کی سمجھ بہت درست، جنتر اور بین بجانے میں دستگاہ تمام، خیال اور دھرپت گانے میں قدرت مالا کلام مگر وہ سب مضامین عرفان سے مالا مال ہوتے ..... اور وہ راگ ان معانی بلند کی مدد سے عارف کو مدارج علیا تک لے پہونچے، گویا یہ شعر مولانا اشرف العارفین جلال الدین رومی قدس سرہٗ کا اس کے نغمے کی شان میں ہے،

این زمزمہ مرکبیست مر روح ترا بردارد و خوش بعالم یار برد

شعر گوئی کی طرف بھی توجہ بہت فرماتا، اور اس کے پردے میں بھی وہی راگ گاتا، سوز سینہ شبستان ابیات میں شمع افروز اور صوت مجرد اوراق میں موزوں، ہرچند کہ وہ لوگ اس کو زمزمے لذت یاب اور معنی حقیقت آشنا ہیں اس کے دست بخت طبیعت سے مزہ نہ اٹھائے لیکن اس نغمہ کی ان معانی

کی لذت اصحاب مضامین کی کیفیت اپنے سے بیگانہ کر دیتی تھی، ازبسکہ یہ ذوق اس کے دل کے اسرار تھے، ارباب باطن کے سوا اس سے کم کسی کو اختلاط تھا، سچ ہے کہ حال کو اہل حال ہی خوب سمجھتا، شاہ نظام الدین معروف شاہ جی کہ تونگر صورت درویش سیرت اور دنیا ظاہر و فقیر باطن تھے ہمیشہ اس صحبت فیض منقبت کو مغتنم جانا کئے، اور بعد اس کی وفات کے اپنے نفس واپسیں تک صرف افادات پیشیں کو آشنائے زبان کرتے رہے، ایک بدمست ظاہر اور ہوشیار باطن میرا دوست تھا کہ فی الجملہ مجھ کو اس سے اعتقاد اور سوز دل و گداز باطن مثل شمع اس کے ظاہر سے ٹپکتا تھا، میں نے اس پاک باطن نیک کردار کی زبان سے یوں سنا کہ ایک روز صوفیان حقیقت شناس کا ہنگامہ گرم تھا، اس جلسے میں اس روشن ضمیر نے ایک رباعی عارفانہ پڑھی، اور سب حلقے کو ایک حال طاری ہوگیا، اس جگہ ایک لڑکا سات آٹھ برس کا بھی حاضر تھا، اس کا بھی وہی احوال ہوگیا، اور جب مجلس تمام ہوئی دوپہر کے بعد اسکو ہوش آیا مرنا بیدل صحت فرماتے ہیں"

ع : حرف این طائفہ عریان اعجاز است[1]"

صابر گورکھانی کی اس طویل عبارت آرائی کے باوجود اس بات کا مطلق پتہ نہیں چلتا کہ اس شاعر کا کیا نام تھا، کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا، کہاں کا رہنے والا تھا، کب اور کس طرح زندگی بسر کی، تعلیم کیسی اور کہاں تک ہوئی، انکے پیر شاہ جی کس سلسلے سے منسلک تھے، اُن کا انتقال کب ہوا، تذکرہ نگار سے یہ نتائج مزید اخذ کئے جا سکتے ہیں،

ا۔ تذکرہ گلستان سخن کی ترتیب کے زمانے میں شاعر زندہ نہیں تھا، ورنہ اس کا تذکرہ ماضی بعید کے صیغے میں نہ ہوتا،

---

[1] گلستان سخن ص ۱۹۹، ۲۰۰

۲۔ محبت نامہ میں جس شاعر کے حالات درج کئے گئے ہیں اس کو موسیقی میں ماہرانہ دسترس حاصل تھی، جس سے وہ اسرارِ حقیقت کی پردہ کشائی کرتا رہا۔

۳۔ اس کے کلام میں جن اسرارِ حقیقت کا ذکر ہوتا عام افراد اپنی کم فہمی کی وجہ سے اس سے حظ نہ اٹھا پاتے، ممکن ہے اسی وجہ سے تذکروں میں اُن کا ذکر نہیں ملتا، اور صرف اہلِ حال افراد ہی اس کے اشعار کے معانی و مطالب سے لطف اٹھاتے ہیں۔

۴۔ اُن کے پیر کا نام شاہ نظام الدین تھا، جو شاہ جی کے نام سے مشہور اور قوی ہیکل فرد تھے۔

۵۔ اُن کے پیر کو نظام الدین پانی پتی نہیں قرار دیا جا سکتا، نظام الدین پانی پتی کے بارے میں "پانی پت اور بزرگانِ پانی پت" میں مرقوم ہے کہ اُن کے والد شیخ عثمان زندہ پیر کے نام سے اور دادا شیخ عبدالکبیر بالا پیر کے نام سے مشہور تھے، اُن کی ولادت ۱۱۰۸ھ میں اور وفات ۱۱۸۲ھ میں ہوئی، انتقال کے وقت اُن کی عمر ۷۴ سال تھی، اگر زیرِ نظر حافظ کے پیر نے اتنی لمبی زندگی پائی ہوتی تو صابر گورگانی اسکی طرف ضرور اشارہ کرتے، اس سے قطع نظر صابر گورگانی اپنے ایک دوست کا حوالہ دیتے ہیں، جو پیر صاحب کی اس مجلس میں شریک تھا جس میں اُن کے ایک رباعی پڑھنے پر ایک خورد سال لڑکا مست ہو گیا تھا، جیسا کہ معلوم ہے، شیخ نظام الدین پانی پتی کا انتقال ۱۱۸۲ھ میں ہوا تھا، اور صابر گورگانی کا تذکرہ ۱۲۷۰ھ میں مکمل ہوا، عقلاً یہ محال نظر آتا ہے، کہ گیارہویں صدی ہجری کی ابتدا کے کسی بزرگ کو تیرہویں صدی ہجری کے نصفِ آخر کا کوئی شخص دیکھ سکے اور اسکی محفل میں بیٹھ سکے، اس لئے ہمارا خیال ہے کہ یہ شاہ نظام الدین، شیخ نظام الدین پانی پتی سے الگ کوئی صوفی ہوں گے، جن کے بارے میں ہم کو کوئی علم نہیں ہے۔

اس مخطوطہ کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے، کہ حافظ سلسلۂ صابریہ چشتیہ سے منسلک تھے، انھوں نے

حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ و حسینؓ، معین الدین چشتیؒ اور سید محمد یعقوب بدخشانی کی مدح میں ایک ایک قصیدہ لکھا ہے۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ، علاء الدین صابر اور شاہ محمد نظام پانی پتی کی مدح میں کئی کئی قصائد ملتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ نظام پانی پتی کی مدح میں قصیدہ اس عنوان سے شروع ہوتا ہے،

در مدح شیخ المشائخ زبدۂ اولیاء واصلین حضرت شاہ محمد نظام پانی پتی،

اس عنوان اور متعدد قصائد کی وجہ سے اول اول یہ گمان ہوا کہ شاید یہی نظام الدین حافظ کے پیر ہوں مگر اُن کے نام سے دو وجہوں سے صرف نظر کرنا پڑا، اول تو یہ کہ اُن کا انتقال گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں ہوا ہے، اور گور گانی کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ تیرہویں صدی ہجری کے شاعر تھے، دوم یہ کہ پانی پت کے بزرگ شیخ نظام الدین کے نام سے یاد کئے جاتے تھے، نہ کہ شاہ نظام الدین کے نام سے۔ اس وقت گمان غالب ہے کہ اس مخطوطہ کے مرتب نے پانی پتی کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیا ہے اور یہ تمام کے تمام قصائد حافظ نے اپنے پیر شاہ نظام الدین کی مدح میں لکھے ہیں، خود حافظ کے کلام میں جن نظام الدین کا حوالہ بار بار آتا ہے، وہ شاہ نظام الدین ہیں، شیخ نظام الدین نہیں، مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں،

حافظ شہدیدہ را یک نظر شاہ نظام — منزل و ماوای دگر کار روانی دگر است

سرور پیر مغاں شاہ نظام مقتدا — مسکین حافظ بے نوا ادنیٰ غلام کوے اوست

سرور بادہ چہ خواہی بجز شاہ نظام — مزید عشق ز حافظ شراب خوار طلب

بہ یمن شہ نظام الدین بناز و حافظ مسکیں — کہ در بار مصائب پا ول چوں کوہکن دارد

با نظام شاہ دین ایں خستہ را فریاد رس — چوں حافظ بلی خانماں بی تشنہ جامم ہنوز

حافظ نے جہاں جہاں بھی اپنے پیر کا ذکر کیا ہے ان کو شاہ نظام یا شہ نظام کے نام سے یاد کیا ہے، وہ کہیں بھی انکو شیخ نظام ... نہیں کہتے، اسی وجہ سے ہمارا خیال ہے کہ مرتب مسودہ کی غلطی سے نظام الدین کے نام میں پانی پتی کا اضافہ ہو گیا ہو گا، حافظ کا صابری ہونا بھی انہی کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے،

صرف دو اشعار مثال کے طور پر درج کئے جاتے ہیں،

ارشاد جدید احمد صابر حافظا — یک نظر لطف بہ بیند تن عریانی ما

قطرۂ از جام دو رصابری آمد نصیب — گشت حافظ ہر زمان ...

زیر بحث مخطوطہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ کی بعض غزلیں بڑی صاف، شستہ، رواں اور جذبات سے پُر ہیں، مگر اسی کے ساتھ بہت سی ایسی غزلیں بھی ہیں جن کو صرف الٹ اور پلٹ کر فارسی بنا لیا گیا ہے، ان غزلوں میں نہ کوئی کیف ہے، اور نہ نمک، بری قافیہ پیمائی اور تک بندی معلوم ہوتی ہیں، اس مخطوطہ کا ہم نے جو سرسری مطالعہ کیا ہے وہ اسرارِ حقیقت معلوم کرنے کے لئے نہ تھا، بلکہ اس کی شاعرانہ قدر وقیمت کا اندازہ لگانا مقصود تھا، اس نقطۂ نظر سے حافظ کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد مناسب یہی معلوم ہوا کہ اُن کی کچھ چیدہ چیدہ غزلیں شائع کر دی جائیں، نیز اُن کے بارہ میں جو شکوک و شبہات کی نشاندہی بھی کر دی جائے تاکہ اہلِ نظر کی امداد و اعانت سے اس شاعر کی اصلیت کا پتہ چلایا جا سکے، اور اُس کے عہد کی تعیین کے بعد اُس کے بارے میں جو کچھ معلومات فراہم ہو سکیں اُن کو سامنے رکھ کر پیشِ نظر مخطوطہ کا ایک ناقدانہ متن مرتب کر دیا جائے، ان سطور کی اشاعت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اگر اس شاعر کا کوئی دوسرا مخطوطہ کسی کتب خانہ میں محفوظ ہوگا تو سطورِ ہذا کی اشاعت کے بعد اس کا بھی پتہ چل جائے گا، اور اس نسخے کی مدد سے متن کو مرتب کرنے میں آسانی ہو گی، نمونے کے طور پر حافظ کی چند غزلیں درج کی جاتی ہیں،

(۱)

برخیز یک دم ساقیا بخشا در میخانہ را — یک جرعہ بر ما بخش کن آن بادۂ مستانہ را

بنگر گروہ عاشقاں بر در گشت زاری کناں — دریاب از بہر خدا چندیں دل دیوانہ را

بزم طرب را ساز کن، جامی بنشا آں بُتِ — برگیر ساز عقل و دیں در دست کن پیمانہ

اے ناصحِ پژمردہ دل پندے بتاں می دہی — نادان چہ دانی ماجرا جام و سبو خمخانہ را
زنہار ہرگز نگہ خلد خارِ ملامت در دلم — از سوختن بنود خبر مسکیں دلِ پروانہ را
بگذار ایں عقل و خرد در بزمِ رنداں شو درا — شاید کہ از فیضِ خدا رہ یابی آں میخانہ را

اے حافظ مسکیں گدا رو بر درِ شاہِ نظام
از صدقِ جاں کن التجا بگذار ایں افسانہ را

(۲)

اے جانِ من جانانِ من ہستم دعاگوے شما — عمرے شد اندر آرزو افتادہ در کوے شما
چوں می نہ پرسی حالِ من اے شاہِ فرخ فالِ من — ذکرِ تو قیل و قالِ من بس زندہ بر بوے شما
من کشتۂ نازِ توام سرگشتہ از سازِ توام — دیوانہ جانبازِ توام قربان ہر سوے شما
من کیستم تا دم زنم یا دین و دل برہم زنم — صد عالمے حیران شدند از چشمِ جادوے شما
صد ہا فلاطون بوعلی صد ہا سعید ہم شستی — چنداں پریشان و خجل از زلف و گیسوے شما
در دو جہاں غوغاے تو در انس و جاں ہوہاے تو — افتاں و خیزاں ہر کسے در جستجوے شما

بیچارہ مسکیں ہر زماں حافظ فقیرِ ناتواں
در زیرِ چوگانِ عشقِ تو سرگشتہ چوں گوے شما

(۳)

مستِ شوقِ وصلِ یارم روز و شب — زاں شراب اندر خمارم روز و شب
گر میسر نیستم آں بادہ صاف — درد نوش و بادہ خوارم روز و شب
من بہر سو حسنِ او بینم دلا — زاں بہر شے در نظارم روز و شب
چوں گدایم بر درِ پیرِ مغاں — شاہ و جملہ شہریارم روز و شب

اچو یاران در هوای عشق او | از دل و جان خون ببارم روز و شب
تا مگر باشم سگ کوی مغان | دل شکسته بنده دارم روز و شب
خاک راه آن خرابات مغان | چشم اندر سرمه دارم روز و شب

حافظا از آتش عشق صنم
تا ابد مانند نارم روز و شب

(۴)

عاشقان را در ره عشق از ملامت عار نیست | هیچ گل باشد که همراهش سنان خار نیست
کعبه و بتخانه نزد عاشقان باشد یکی | در طریق عاشقی این تفرقه در کار نیست
مذهب و آئین عشق این جمله یکرنگی بود | راه و رسم عاشقان این سبحه و زنار نیست
ناصحا بر عاشقان صد زخم رسوائی مزن | کافر عشقیم با اسلام و دینم کار نیست
عاشقان را گر کسی محرم نباشد گو مباش | بیدلان را همدمی جز سایهٔ دیوار نیست

زاده در داست حافظ هم غذا ایش خون دل
از هزاران کوه غم او را جوی آزار نیست

(۵)

مژده ای دل که شب فرقت یار آخر شد | غم تنهائی و رنج شب تار آخر شد
صولت باد خزان بود بگلزار دلم | شکر صد شکر که از باد بهار آخر شد
خار هجران که بصد نوک جراحت میکرد | هم ز اقبال گل روی نگار آخر شد
شمه از لطف نظر ساقی ما هست که کرد | بیم صد غصه و تشویش خمار آخر شد
حالیا آن می و میخانه و با دف و چنگ | که ز خورشید جهان تاب غبار آخر شد

گرچه واعظ همه عیب کند حافظ را
لیک صد شکر که آن غصه بآخر شد

(۶)

دارد دلِ دیوانه سیرِ گلستانی دگر
باشد درونِ سینه ام صد موج طوفانی دگر

ای زاهدِ گم کرده ره تا کی پریشان می شوی
در سیرِ کعبهٔ دل ببین قطع بیابانی دگر

در مذهبِ عشاقِ حق از کافری بس چاره نیست
هر دم گرو سازند جا با نامسلمانی دگر

شوریدگانِ عشق را چون هیچ صبح و شام نیست
هر لحظه دارند اندرون خورشیدِ تابانی دگر

حافظ بعشقِ آن صنم باشد پریشان دمبدم
هر لحظه می سازد جدا قطع بیابانی دگر

(۷)

من دولتِ دردِ تو بدرمان نفروشم
کفرِ سرِ زلفِ تو بایمان نفروشم

صد خارِ فراقت بدلم گر خلد هرگز
در باغ چو بلبل بصد افغان نفروشم

عیشِ دو جهان بغمِ عشق ندانم
این جنسِ گران را بکس ارزان نفروشم

من رندِ نظربازِ غلامم ده صاحب
هرگز بکسی پاکیِ دامان نفروشم

گر ناصحِ بیهوده مرا عیب کند چیست
از بهرِ یکی لقمه صد ایمان نفروشم

خاکِ درِ صاحب همه اکسیرِ خدائی است
یک ذره بصد تختِ سلیمان نفروشم

این رندی و بدمستی حافظ عجبی نیست
دشوار بدست آمده آسان نفروشم

(۸)

من که اندر عشق رسوای جهان خواهم شدن
آستین افشان برون زین خاکدان خواهم شدن

این خیالم بود چون بینم ورا پرسم ازو
می ندانستم که آندم بی زبان خواهم شدن

مستم اکنون ناصحا از غمزهٔ ساقی مپرس
چون شوم هشیار در شرح و بیان خواهم شدن

واعظا بیهوده این زهد و صلاح از من مجو
من نه هرگز در پی خُلد و جنان خواهم شدن

از شراب ناب ساقی چون طهارت کرده ام
از همه خبث و خباثت در امان خواهم شدن

حافظا در عشق از جان صرف کردن چاره نیست
در تلاش بی نشان، خود بی نشان خواهم شدن

(۹)

در نمازم چون نظر افتد بماه روی تو
پشت بر قبله کنم بینم خم ابروی تو

روی ظاهر سوی قبله باطنم لیکن سوی تست
زین دورویی خوانده ام شرمست پیش روی تو

گه ره میخانه پویم گه برخت سوی خانقه
میگردم هرجا در بدر دایم بجستجوی تو

اکنون که دل نیم مرده شد از قیل و قال مدرسه
آیم بکنج میکده افتم بگفت وگوی تو

چون نا مرا افسرده دلی تا کی بمحراب دعا
این دم مرا کافی بود طاق خم ابروی تو

صد روزن از سوز درون در سینه خود کرده ام
تا بو که افتد پرتوی از آفتاب روی تو

حافظ نه از خاک درت محروم می مانم چنین
بسیار دارد التجا پیش سگان کوی تو

(۱۰)

بکجا روم ز کویت چه دوا کنم چه چاره
که دلم ز درد خون شد جگرم هزار پاره

این زاری دل من کہ اگر بہ بیند | چوں موم نرم گردد دلہائے سنگ خارہ
بیچارہ دیدۂ من رویت چگونہ بیند | بیزار دیدہ خواہم کہ کنم ترا نظارہ
یکے ترا چہ نسبت کہ بدلبراں بگویم | تو چو آفتاب تابان دگراں چو ستارہ

دل خستہ حافظم را تو بسوختی حذر کن
زچہ خنجر مژہ را تو کشی ز ہر کنارہ

(۱۱)

آمد آن دلبر عیار بہ آنی عجبی | عزت و جاہ و حشم شوکت و شانی عجبی
غمزہ و ناز و کرشمہ ہمہ آں غنچہ و دلال | چشم مستے بہ آفت جانی عجبی
این چہ حسن است خدایا کہ چشم پیداست | یافتم جملہ ازاں روح و روانی عجبی
یک نظر کرد بما ہم لب میٹھے بکشاد | زندہ ساخت مرا تنگ دہانی عجبی

گشت مقبول خرابات چو حافظ بادب
مثل او نیست مگر سوختہ جانی عجبی

نمونے کے طور پر زیر نظر مخطوطہ کی ساٹھ غزلیں نقل کر دی گئی ہیں۔ ان غزلوں کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ صابر گورگانی کو حافظ سے والہانہ حد تک عقیدت تھی۔ اسی وجہ سے اُن کو حافظ کے کلام میں اسرار باطن کی کارفرمائیاں نظر آئیں، ورنہ انصاف تو یہ ہے کہ کیا بلحاظ غزل گوئی، اور کیا بلحاظ مضامین تصوف ان بزرگ کا کلام کسی غیر معمولی اہمیت کا حامل نہیں نظر آتا۔ تیرہویں صدی ہجری میں غالب کے علاوہ اور بہت سے شعراء جن میں شیفتہ اور صہبائی بھی شامل ہیں، فارسی میں داد سخن دے رہے تھے۔ زیر نظر مخطوطے کے مطالعے سے اس بات کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں فارسی غزل گوئی کے کون کون

سے زنگ رائج تھے، اور اگر اس مخطوطے کے شاعر کا دوسرے شعراء کے کلام سے موازنہ کرکے اُس زمانہ کی غزل گوئی کے رجحان کا تجزیہ کیا جائے، تو ممکن ہے کہ کچھ نئے گوشے بھی ابھر کر سامنے آئیں، اس لحاظ سے اس مخطوطہ کی اہمیت ہو سکتی ہے، اگر اس مخطوطہ کی ترتیب و اشاعت کا کام کیا جائے. تو تیرہویں صدی ہجری کے ایک فارسی گو شاعر کے کلام کو دستبرد زمانہ سے محفوظ کر دیا جائے گا، اس مخطوطہ میں اردو کا بھی کلام ہے، اگر کوئی صاحبِ ذوق اس حصہ کا تعارف کرائیں تو ایک بڑی ادبی خدمت ہوگی،

(دار المصنفین کی نئی کتابیں)

خریطۂ جواہر

مولانا شاہ معین الدین احمد مرحوم ناظم دار المصنفین کی یہ آخری تصنیف ہے، اس میں مرزا مظہر جانِ جاناں کی بیاض خریطۂ جواہر کے منتخب اشعار کی تشریح و ترجمہ کے ساتھ خود مصنف مرحوم کے اپنے خیالات بھی درج ہیں، ضخامت ۱۲۴ صفحے، قیمت :- ۵۰-۴

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

اس میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی تفصیلات درج ہیں

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن، ضخامت :- ۱۶۰ قیمت :- ۰-۵

ہندوستان کی بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں (حصہ دوم)

اس میں ظہیر الدین بابر سے لے کر نور الدین جہانگیر تک کے متعلق دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں ہیں، مرتبہ :- سید صباح الدین عبد الرحمن، ضخامت : ۱۷۲ صفحے

قیمت :- ۶-۲۵

"منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

کتاب النبات

از

حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی، ایم، اے (علیگ)

تالیف:- ابو حنیفہ دینوری۔ مرتبہ:- ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ تقطیع بڑی نفیس کاغذ نفیس طباعت، ضخامت، ۴۴ x ۵ صفحے۔ غیر مجلد۔ پتہ۔ المعہد الفرنسی قاہرہ۔

علم نباتات پر عربی میں بکثرت کتابیں تالیف کی گئی ہیں، ابن ندیم کی الفہرست میں متفرق طور پر ایسی دس کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن جہاں تک علم ہو سکا ہے، ان میں صرف الاصمعی، (المتوفی ۲۱۶ھ) کی کتاب النبات والشجر ہی ابھی تک طبع ہو سکی ہے[1]۔ ان کثیر التعداد تصانیف میں ابو حنیفہ دینوری (المتوفی ۲۸۲ھ) کی کتاب النبات کو بھی ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے، بلکہ بعد کے لغت نویسوں نے پودوں اور جڑی بوٹیوں کے ذکر میں جتنی خوشہ چینی دینوری کی یادگار تالیف سے کی ہے، اتنی کسی اور کتاب سے نہیں۔ چنانچہ لسان العرب ابن منظور، تاج العروس مرتضیٰ زبیدی، معجم البلدان یاقوت، کتاب المخصص ابن سیدہ، العباب صاغانی اور القاموس فیروزآبادی وغیرہ میں دینوری کی تحقیقات کے

---

[1] یہ کتاب مطبعہ یسوعیین بیروت سے ۱۹۰۸ء میں طبع ہوئی۔ تعداد صفحات ۴۴۔

اقتباسات کثرت سے ملتے ہیں۔

ابو حنیفہ دینوری کا شمار تیسری صدی ہجری کے کبار، اور ماہرین فن علماء میں ہوتا ہے ان کو امام بخاری، جاحظ، ابن قتیبہ، اور امام احمد کی معاصرت کا شرف حاصل تھا، ان کے فضل وکمال کے حدود تاریخ وجغرافیہ، ریاضی وہیئت لسانیات وبلاغت اور طب نباتات تمام علوم تک وسیع تھے، علامہ سیوطی، یاقوت رومی، عبدالقادر بغدادی اور ابن ندیم سب نے بالاتفاق لکھا ہے کہ۔

انہ من نوادر الرجال جمع	بلاشبہ وہ نادرۂ روزگار لوگوں
بین حکمۃ الفلاسفۃ و	میں تھے، حکمت وفلسفہ اور عربیت
بیان العرب ولہ فی کل	کے جامع تھے، اور ان کو ہر فن میں
فن ساق وقدم [1]	تقدم وفوقیت حاصل تھی۔

صاحب معجم الادباء نے ان کو انشاء پرداز کی حیثیت سے جاحظ کا حریف قرار دیا ہے۔ دینوری کی مشہور تصنیف الاخبار الطوال تاریخ کا ایک اہم ماخذ شمار ہوتی ہے، اس جلالت علم وفن کے ساتھ ورع وتقوی اور اخلاق وسیرت میں بھی نہایت عالی رتبہ تھے، جمادی الاولی ۲۸۲ھ میں وفات پائی۔ (بعض روایات کے مطابق سنہ وفات ۲۹۰ھ ہے۔)

ابو حنیفہ دینوری کے شہب قلم نے ہر میدان میں جولانی دکھائی ہے، ذیل میں انکی تصنیفات کی فہرست درج کی جاتی ہے۔ جس پر ایک نظر ڈالنے سے دینوری کی ہمہ جہتی اور جامعیت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

---

[1] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۲، معجم الادباء ج ۳ ص ۲۵، خزانۃ الادب ج ۱ ص ۲۰، الفہرست

کتاب الباءۃ[1] - ما تلحن فیہ العامۃ[2]، الشعر والشعراء[3]، الفصاحۃ[4]، الانواء[5]، فی حساب الدور[6]، البحث فی حساب الہند[7]، کتاب الجبر والمقابلہ[8]، البلدان[9]، کتاب النبات[10]، المعارف[11]، الجمع والتفریق[12]، الاخبار الطوال[13]، تفسیر القرآن[14] (۱۳ جلد) کتاب الوصایا[15]، نوادر الجبر[16]، اصلاح المنطق[17]، القبلۃ والزوال[18]، کتاب الکسوف[19]،[1]

ان میں ابھی تک صرف المعارف اور اخبار الطوال ہی زیور طباعت سے آراستہ ہو سکی تھیں - اب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی تلاش و محنت سے کتاب البنات بھی شائع ہو گئی ہے، فاضل موصوف کی شخصیت اور علمی خدمات کسی تعارف سے مستغنی ہیں۔ ان کو اردو کے علاوہ عربی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن تمام زبانوں پر یکساں عبور حاصل ہے اور ان سب میں ان کی عالمانہ تصنیفات ذوق شناسان علم سے داد حاصل کر چکی ہیں ڈاکٹر صاحب موصوف نے آج سے پچیس سال قبل دسمبر ۴۹ء اور پھر جون ۵۰ء کے معارف" میں ابو حنیفہ دینوری کی کتاب البنات کا مفصل تعارف کرایا تھا، (جس کا ذکر پیش نظر کتاب کے فرانسیسی مقدمہ میں بھی ہے۔) اور اسی وقت اہل ذوق کو یہ خوش خبری بھی سنائی تھی کہ ان کو مدینہ منورہ میں تین ابواب پر مشتمل اس کتاب کا ایک مخطوطہ دستیاب ہو گیا ہے اور وہ دینوری کے دوسرے خوشہ چینوں کے اقتباسات یکجا کر کے اس کو مرتب کر رہے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ فاضل گرامی کی چوتھائی صدی کی عرق ریزی کا حاصل خوان یغما کی صورت میں اہل علم کی ضیافت طبع کے لیے منصۂ شہود پر آگیا ہے اس کے لیے۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا جس قدر بھی سپاس گزار ہوا جائے کم ہے۔

زیر تقریظ کتاب کے آخر میں فاضل مرتب دجامع کے قلم سے فرانسیسی زبان میں

---

[1] یہ فہرست معجم الادباء، الفہرست الاعلام اور بغیۃ الوعاۃ سے تیار کی گئی ہے۔

ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں انھوں نے یہ یاد دلایا ہے کہ تیسری ہجری کے نامور مؤلف دینوری نے نباتات پر ۶ ضخیم جلدوں میں ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) نے تالیف کی تھی۔ جس کی نظیر نہ یونانی میں ہے، نہ سنسکرت میں اور نہ دنیا کی کسی اور قدیم زبان میں[1] اس کی جلد سوم اور پنجم ابھی حال میں دریافت ہوئی ہیں۔ باقی ہنوز پردۂ خفا میں ہیں جرمن مستشرق زلبربرگ کو حیرت ہے کہ تیسری صدی ہجری میں کوئی مسلمان یہ کارنامہ کیسے انجام دے سکا۔ جب کہ یونانیوں کے لیے یہ ہزار سال میں بھی ممکن نہیں ہوا۔

ابوحنیفہ احمد بن داؤد الدینوری نے کیا یہ کہ پہلی ۳ جلدوں میں باب وار نباتات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً پہاڑی پودے۔ میدانی پودے، سمندر کے کھاری پانی میں اگنے والے خوشبودار، بدبودار، مسواک کے طور پر استعمال ہونے والے وغیرہ، پھر آخری ۳ جلدیں حروف ہجا پر نباتات کی ایک مکمل اور مخصوص عربی لغت تھی۔

جلد پنجم کا وہ حصہ جس میں الف سے زے تک نباتات کا تذکرہ ہے، استانبول کے مخطوطہ کی اساس پر ۱۹۵۳ء میں سویڈن کے مستشرق برن ہارڈ لیوین نے ایڈٹ کیا۔ (ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے کتاب النبات کے اپنے مرتبہ زیر نظر نسخہ کے آغاز میں اس جلد کی فہرست باعتبار حروف معجم درج کر دی ہے،) ڈاکٹر برنہارڈ لیوین نے اپنی مذکورہ کتاب کے مقدمہ میں حمید اللہ صاحب کے کام کو سراہا، اور ان کے تعاون کا شکریہ ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی دیدہ ریزی اور کاوش و محنت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ انھوں نے متاخرین کی کتابوں مثلاً لسان العرب، تاج العروس، المخصص، المحکم العباب اور المفردات لابن بیطار وغیرہ کی مطبوعہ و مخطوطہ تیس چالیس ضخیم مجلدات کے ہزاروں

---

[1] یاقوت وغیرہ نے لکھا ہے۔ لم یصنف فی معناہ مثلہ

صفحات کو سطر بہ سطر پڑھا۔ اور ان میں جہاں کہیں "قال الدینوری"...... نظر آیا، اس اقتباس کو نقل کر لیا۔ جس کے نتیجہ میں خود فاضل مرتب کے الفاظ میں بحذف مکررات کوئی دو ہزار فل سکیپ صفحات ہوئے"۔ ان میں آخری حصہ یعنی "س" سے "ی" تک کی ابجدی لغت پانچ سو صفحے میں آئی۔ اسی آخری حصہ کو فرانسیسی حکومت نے اپنے مصارف پر چھاپا ہے، جو اہل علم کے شکریہ کی بجا طور پر مستحق ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد میں جو ڈاکٹر برنارڈ لیوین نے مرتب کی تھی الف تا رے کے ۴۸۲ پودوں کا ذکر تھا۔ اور زیر نظر کتاب حرف س سے شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ ۴۸۳ نمبر کا پہلا پودا "ساج" ملتا ہے، جس کے بارے میں مصنف رقمطراز ہے۔

والساج خشب يجلب من	ساگوان ایک لکڑی ہے جو ہندوستان
الهند واحدته ساجة	سے لائی جاتی ہے اس کا واحد ساجہ
والساج شجر يعظم جداً	ہے، اس کا درخت بہت بڑا ہوتا
ويذهب طولاً وعرضاً	ہے۔ طول میں بھی اور عرض میں بھی
وله ورق امثال التراس	اس کے پتے دیلم والوں کی ڈھالوں
الديلمية يتغطى الرجل	کے سے ہوتے ہیں۔ اس کا ایک
بورقة منه فتكنه من المطر	ہی پتہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اگر کوئی
وله رائحة طيبة تشاركه	شخص اسکو چھتری بنائے تو بارش
رائحة ورق الجوز مع	سے بچ سکتا ہے، اس کے پتوں
رقة ونعمة۔ حكاه ب ج	کی بو جوز کے پتے کی بو سے مشابہ
والفيل معجبة بورقه	ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ رقیق اور

ورق الموز ومنبتہ بالھند والنرع (لسان وتاج و سوج مخصص ۱۱/۱۹۷ صیدنۃ البیرونی۔ ساج ورق ۲، الف	زیادہ ملائم، جیساکہ ابوحنیفہ دینوری نے بیان کیا ہے، ہاتھی اسکے اور کیلے کے پتے پسند کرتے ہیں ساگوان ہندوستان اور بلادِ زنگ (حبش) میں اُگتا ہے۔ لسان العرب تاج العروس مادۂ سوج۔ مخصص لابن سیدہ جلد ۱۱ ص ۱۹۷۔ صدنۃ البیرونی لفظ ساج۔ مخطوطہ بروصہ ورق ۲، الف۔

مختلف مصادر میں جو خفیف اختلاف الفاظ ہے، وہ بھی حاشیہ میں بتایا گیا ہے کتاب النبات کے زیرِنظر حصہ میں آخری پودا ۱۱۲۰ نمبر کا بتیر ہے، آخر کتاب میں کئی انڈکس بھی شامل ہیں۔ جو مرتب کی محنت وزحمت اور ساتھ ہی جدید طریقہ ترتیب وتدوین سے ان کی مہارت دواقفیت پر شاہد عادل ہیں۔

اس کتاب کے مقدمہ ہی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی کہ ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کے پاس ابھی چار جلدیں اور ہیں، جو دینوری کے اقتباسات پر باب وار مشتمل ہیں، ان میں سے دو سو صفحے تو کتاب الانواء (یعنی بارش کے ستاروں) کے متعلق ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس ایک ہزار سے زائد پودوں کی تصویریں بھی ہیں جو پرانے عربی مخطوطات سے حاصل کی گئی ہیں، اگر یہ تصویریں البم کے طور پر شائع ہوجائیں تو مختلف پودوں کو پہچاننے میں بڑی مدد مل سکے گی، زیرِنظر کتاب کے تمام محاسن کے

باوجود ایک کمی یہ محسوس ہوتی ہے کہ جس طرح کتاب کے آخر میں، ۵ صفحات کا ایک طویل مقدمہ فرانسیسی زبان میں شامل ہے، اس طرح اگر شروع میں عربی زبان میں بھی اس کا خلاصہ دیدیا جاتا تو فرانسیسی زبان سے ناواقف لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے ستر سال کی عمر میں جس تلاش و تحقیق اور محنت و کاوش کا ثبوت دیا ہے، وہ جوانوں کے لیے بھی باعث عبرت و بصیرت ہے، خدا دنیائے علم و فن کو تادیر اس چراغ سے روشن رکھے۔

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی تاریخی، فقہی، دینی مضامین، اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے، اس کی اسی دلآویزی، اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چہار دیواری سے گذر کر یورپ، امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا ہے، مشرقیات کے جن غیر مسلم فضلاء نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور ان کی نگرانی میں دارالمصنفین کے رفقاء محققین نے ان کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو بالکل مکمل موجود ہیں۔ ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۱ء، ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء، ۱۹۵۵ء، ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۳ء، ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں۔

"منیجر"

مطبوعاتِ جدیدہ

مذہب اور جدید ذہن مرتبہ۔ جناب ڈاکٹر مشیر الحق صاحب تقطیع خورد کاغذ، کتابت وطباعت اچھی صفحات ۱۲۰ مجلد۔ قیمت۔ مبلغہ پیسے۔ پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ ۔

یہ کتاب مندرجۂ ذیل چھ مضامین کا مجموعہ ہے، (۱) مذہب اور جدید ذہن (۲) فتاویٰ اور عصری مسائل۔ (۳) شاہ عبدالعزیزؒ کے فتاوائے دار الحرب کا سماجی پس منظر (۴) مسلم پرسنل لا اور ہندستانی عدالتیں۔ (۵) پاکستان اور قانون شریعت (۶) ملایا میں قانون شریعت، آخری دو مضامین میں دو مسلم ملکوں پاکستان اور ملایا میں قانون شریعت کی موجودہ صورت بیان کی گئی ہے۔ ملایا میں مقامی حالات اور ضروریات کے لحاظ سے کہیں کہیں کچھ اضافے کئے گئے ہیں، یا پابندیاں لگائی گئی ہیں جیسے اسلامی قانون سازوں کی شریعت کے نفاذ میں احوال وظروف کی رعایت، ممکن ہے یہ دوسرے ممالک میں بھی فقہا اور مقننین کے لیے غور وفکر کی راہیں دکھائے۔ پاکستان میں شرعی قوانین کے نفاذ میں حکمرانوں کی پہلو تہی کا ذکر ہے، اور حکومت اور اس کے ہمنوا طبقہ کا نقطہ نظر بھی پیش کیا گیا ہے، اچھا ہوتا کہ اس کے ساتھ اس نقطۂ نظر کے مخالف علماء اور قانون دانوں کے دلائل پیش کر دئے جاتے لیکن شاید سرکاری حلقہ کا استدلال

اتنا کمزور محسوس ہوا کہ ان کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ چوتھے مضمون میں ہندوستانی عدالتوں کے ذریعہ مسلم عورتوں کے فسخ نکاح کا ذکر ہے، اس میں اس اصلاحی مسودہ قانون کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ جو محمد احمد کاظمی مرحوم نے علماء کے مشورہ سے مرتب کیا تھا لیکن سنٹرل اسمبلی نے منظوری کے وقت مسلم جج کی قید نکال دی تھی، اس کی بنا پر وہ قانون فقہ اسلامی کے مطابق قابل عمل نہیں رہ گیا، اس کے بعد خلع سے متعلق کیرالہ ہائی کورٹ کے ایک اہم فیصلہ کا تذکرہ ہے، چیف جسٹس، وی۔ آر۔ کرشنا آئر نے اس فیصلہ کے سلسلہ میں اسلام کے قانونِ ازدواج کا مطالعہ کرکے اس کی جن خوبیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا اور تیسرا مضمون فتاوی کے متعلق ہے۔ ان میں پہلے فتوی کا مفہوم، اس کی تاریخ، اس کے مجموعوں کی ترتیب و تالیف اور ۱۹ویں و ۲۰ویں صدی کے فتووں میں درج شدہ مسائل کی نوعیت و خصوصیات بیان کرکے موجودہ مسائل اور فتاوی میں استحسان اور مفاد عامہ کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ثابت کی گئی ہے، دوسرے میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ان فتووں پر گفتگو ہے، جن میں برطانوی دور کے ہندوستان کو دارالحرب کہا گیا ہے، مصنف کے خیال میں یہ فتوے اس زمانہ کے سماجی و معاشی حالات کے تحت دیے گئے تھے، ان کا منشا انگریزوں سے جہاد اور ہندوستان سے ہجرت نہ تھا بلکہ بدلے ہوئے سیاسی و معاشی حالات میں مسلمانوں کو کچھ مشورے دینا تھا، شاہ صاحب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو مسلم حکومت کا بدل نہیں سمجھتے تھے، لیکن چونکہ اس کو بدل کر پھر اسلامی حکومت قائم کرنا ممکن نہیں نظر آتا تھا، اس لیے ضرورت کی بنا پر اس کے اندر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارہ میں کچھ مشورے دئے تھے، کتاب کا پہلا مضمون یعنی مذہب اور جدید ذہن سب سے اہم ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کو نہ موجودہ سائنس سے کوئی خطرہ ہے نہ جدید مشاہدات و ایجادات نے مذہب کی ضرورت و اہمیت کو کم کیا ہے، ان دونوں میں کوئی تضاد اور تصادم بھی نہیں ہے، انسان فطرۃً مذہبی ہے۔ آج بھی وہ مذہب سے برگشتہ نہیں ہے، البتہ اسلام کو

مسلمانوں کی غیر سائنسی ذہنیت سے خطرہ ہے لیکن اس مضمون میں مصنف کے بعض خیالات میں الجھا
اور تضاد ہے، جب انکے نزدیک اسلام ہی جامع، مکمل اور خدا کا پسندیدہ دین ہے تو اس کے اصول واحکا
سے انحراف کرنے والا کوئی شخص مسلم کس طرح ہو سکتا ہے؟ نیز قرآن کے ابدی حقائق ومسلمات اور
اسکی بنیادی تعلیمات ہر ہر صدی میں کس طرح بدل سکتی ہیں، ماضی میں اسلام کی جو تشریح وتعبیر کیگئی
ہے اسکو یکسر نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے، عہد رسالت کی تعبیر وتشریح کو بھی زمانی ومکانی اثرات سے
متاثر مان لیا جائے تو پھر دین کی کوئی محکم بنیاد باقی نہیں رہ جاتی، اور مدعیان تغیر واصلاح وہی صدائیں
بلند کرنے لگیں گے جن کا ذکرہ وہ پاکستان کے تجدد پسندوں کی زبان سے کر چکے ہیں، اگر "جدید ذہن" صرف رسوم
وروایات کا منکر ہے تو اہل مذہب اسمیں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے لیکن اختلاف وہاں ہوتا ہے جب رسوم وروایات کیے دائرہ کو وسعت دیکر اسقدر
دیجاتی ہے کہ مذہب کے اوامر ونواہی اسکی زد میں آجاتے ہیں، اشتراکیت صرف ایک معاشی نظام نہیں ہے بلکہ اسکے پیچھے فلسفیانہ
مادی عقیدہ ہے لیکن ایسے مادہ پرستوں کو بھی اگر مصنف مذہب کا منکر نہ سمجھیں تو یہ ان کے حسن ظن اور رواداری کی ایسی
کیفیت ہے جس کی تائید نہیں کیجا سکتی ہے، اسلام کے اصولی واعتقادی امور کو اجتہاد وتقلید کے مسائل سے بھی خلط ملط کر دیا
گیا ہے "اناوجدنا علیہ آباءنا" کی پھبتی نسلی وجماعتی عصبیت میں گرفتار لوگوں پر تو کسی حد تک بجا ہو سکتی ہے لیکن "تفقہ
فی الدین" پر اسکا اطلاق بے محل ہے، مختلف مسالک فقہ سے تعلق رکھنے والے اپنے ائمہ کو شریعت ساز نہیں سمجھتے بلکہ
کمال علم وتقوی کی بنا پر ان کے اجتہاد پر اعتماد کرتے ہیں، اور ان سے اللہ ورسول کے احکام معلوم کرتے ہیں مجتہدین
کے ذکر میں بھی کسقدر مغالطہ آمیزی ہے، جب انکا کام بقول مصنف مروجہ اسلام کے خلاف آواز اٹھانا ہے تو پھر اسکا مطلب اسکے سوا
اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ آج چودہ سو سال پہلے کے اصل اسلام کو جس پر رسوم ورواج اور توہمات وخرافات کا غبار جم گیا تھا از سر نو صاف
کر کے پیش کرتے ہیں اسیطرح بعض اور مسائل میں بھی ترتیب مقدمات کی غلطی کی بنا پر مصنف نے جو نتائج نکالے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں
مصنف کا انداز تحریر سنجیدہ ہے اور انھوں نے ان مضامین کے ذریعہ جمود پسند ذہنوں میں ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ممکن ہے ارباب بصیرت
حالات کا جائزہ لیکر زیادہ بہتر اور صحیح تر نتائج اخذ کر سکیں اور اس دور کے مشکل مسائل کو کتاب وسنت کی روشنی میں مجتہدین سلف کی
[illegible]

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

دین رحمت

بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اسی طرح وہ جو دین لائے تھے۔ وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۱۰ر ۲۵ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکت خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا یہ انہی کی مولانا عبدالسلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت :- ۶ روپیہ ۲۵

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومیؒ کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے قیمت :- ۱۶ روپے پچیس پے،

مؤلفہ:۔ قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

ہماری نئی کتاب

حیاتِ سلیمان

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین بے صبری سے انتظار کر رہے تھے، بحمد اللہ چھپ کر شائع ہو گئی
یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ
ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی خدمات اور کارناموں کا مرقع اور پوری نصف صدی کی تاریخ
جس میں سید صاحب کے دور کی پوری نصف صدی کی ملی، قومی، سیاسی، علمی،
ادبی، لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات،
جنگ آزادی، مسئلہ حرکت حجاز، انہدام مقابر و آثار حجاز وغیرہ کا بھی ضمناً تفصیلی ذکر ہے، اسی
کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور
سال بسال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترک قیام دارالمصنفین، سفر بھوپال، ہجرت پاکستان اور
پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، ان پر مفصل
ذکر کے ساتھ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں، سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان وغیرہ کی بھی مفصل
روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز
انشاء کے لحاظ سے اصل حیات شبلی کا تکملہ ہے۔ [illegible]

قیمت ۱۰ روپے [illegible]

مؤلفہ: شاہ معین الدین احمد ندوی

جلد ۱۱۶ نمبر ۴   اکتوبر ۱۹۷۵ء

مَعَارِف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن   عبدالسلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپے سالانہ

دار المصنّفین اعظم گڑھ

مجلس ادارت

۱- مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی

۲- مولانا سید ابو الحسن علی ندوی — لکھنؤ

۳- مولانا محمد اویس نگرامی ندوی — لکھنؤ

۴- مولانا ضیاء الدین اصلاحی

مرتبین

سید صباح الدین عبد الرحمن — عبد السلام قدوائی ندوی

بزم تیموریہ جلد اول

بزم تیموریہ جلد اول کے پہلے ایڈیشن میں تمام مغل سلاطین اور ان کے شاہزادوں اور [illegible] کے دور کے امراء، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا، [illegible] اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ تمام مغل سلاطین اور ان [illegible] کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر [illegible] کے عہد کے [illegible] ان کے دور کے متوسل علماء و فضلاء و شعراء کا تذکرہ، اور ان [illegible] تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں کہ [illegible] معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، اور پہلے ایڈیشن سے کہیں زیادہ [illegible] جلد میں جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیر ترتیب ہے،

قیمت :- ۵۲ روپے

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

جلد ۱۱۶ ماہ اکتوبر ۱۹۷۵ء مطابق ماہ شوال المکرم ۱۳۹۵ھ عدد ۴

مضامین

شذرات	عبد السلام قدوائی ندوی	۲۴۲-۲۴۴

مقالات

دیار پورب کا تیسرا دور	مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی	۲۴۵-۲۵۸
مولانا شمس الحق عظیم آبادی	مولوی محمد عزیر صاحب بہادری، مرکزی دار العلوم بنارس	۲۵۹-۲۷۲
ہندوستان کے ایک قدیم صاحب دیوان عربی شاعر	جناب لطافت حسین خاں صاحب شروانی اسلامیہ کالج (اٹاوہ)	۲۷۳-۲۸۶
استغنا اور بے نیازی	حافظ محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی ایم اے، (علیگ)	۲۸۷-۲۹۹
مولانا محمد قاسم نانوتوی	جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف ـ دہلی	۳۰۰-۳۱۱

بَابُ التَّقرِیظِ وَالاِنتِقَاد

دیوان زخم	ضیاء الدین اصلاحی	۳۱۲-۳۱۶
مطبوعاتِ جدیدہ	"ض"	۳۱۷-۳۲۰

شذرات

اگست کے معارف میں ندوہ کے جشن تعلیمی کی خبر دی جا چکی ہے، ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۴ء میں چند بدریشیوں نے ملت کی زبون حالی پر غور کیا، انھوں نے ماضی کے تجربوں اور اس وقت کے حالات کی روشنی میں زوال وانحطاط کے اسباب کا سراغ لگایا، اور ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا جس پر عمل کر کے ملت کی افسردگی دور ہو، اس کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑنے لگے، اس کے اندر نشاط پیدا ہو، اس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوں، اور وہ نئے جوش و ولولہ کے ساتھ کارگاہِ حیات میں قدم رکھے، اور ایک بار پھر اپنی لیاقت وصلاحیت کا نقش جریدۂ عالم پر ثبت کر دے،

اس لائحہ عمل کو مرتب کرنے والوں کے نزدیک ملت کی تباہی و بربادی کا سب سے بڑا سبب باہمی اختلافات تھے، ان کو معلوم تھا کہ تمام مسائل و معاملات میں ساری قوم کا متفق ہونا ممکن نہیں ہے، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مذہبی سیاسی، معاشی اور تہذیبی امور میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے اور ہوتا رہے گا، لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس اختلاف رائے کو عداوت اور جنگ و جدل کی شکل میں تبدیل نہ کیا جائے، بلکہ صبر و تحمل سے دوسرے کی بات سنی جائے، اس کے جذبات کا احترام کیا جائے، اور باہم رواداری سے کام لیا جائے، اس طرح افراد اور جماعتوں کا اختلاف دشمنی کا رنگ نہ اختیار کر سکے گا، اور مختلف فرقوں اور گروہوں کی رنگا رنگی میں ملت کی یک رنگی باقی رہے گی، اور اختلاف کے باوجود قوم کی وحدت و یگانگت کا سررشتہ

گم نہ ہونے پائے گا،

ملت کی پستی اور زبوں حالی کا دوسرا سبب ان بزرگوں کی نظر میں نصاب تعلیم تھا، جس وقت مسلمانوں کی تعلیم جدید و قدیم دو خانوں میں بٹی ہوئی تھی، جدید تعلیم گاہیں مذہبی تعلیم و تربیت سے خالی تھیں، اور مذہبی درسگاہیں عصری علوم و فنون سے تہی دامن تھیں، ندوہ کے بانیوں کی آرزو تھی، کہ اس دوعملی کا خاتمہ ہو، قدیم و جدید کے درمیان ربط کی تدبیر کی جائے، اور دین و دنیا کی ہم آمیزی سے وہ اکسیر تیار کی جائے جس سے ملت کے اندر زندگی کی روح پیدا ہو، اور اسلام کے نام لیواؤں میں ایسی صلاحیت پیدا ہو کہ وہ اس ظلمت کدۂ عالم کو پھر مطلع انوار بنا دیں،

اس منصوبہ کو پیش کئے ہوئے پچاسی سال گذر گئے ہیں، ضرورت ہے کہ اس اجلاس میں اس طویل جد و جہد کا جائزہ لیا جائے، اور معلوم کیا جائے کہ ان مقاصد میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، ماضی کے تجربوں کی روشنی میں حال پر نظر ڈالی جائے، لغزشوں، اور کوتاہیوں کی نشان دہی کی جائے، اور اُن کے اسباب و علل پر غور کر کے نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ مستقبل کا نقشہ بنایا جائے، زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے، اور حالات نے بالکل نیا رنگ اختیار کیا ہے، اس وقت جن مسائل سے ہم دوچار ہیں، ان کو حل کرنے کے لئے علم و بصیرت اور حکمت و معرفت کے ساتھ ہمت و جرأت بھی درکار ہے،

اس اجلاس میں شرکت کے لئے علماء و مشائخ، زعماء و ارباب سیاست اور ماہرین

تعلیم و تربیت کبھی طبقوں کے سربرآوردہ اصحاب کو دعوت دی گئی ہے، اس میں ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک کے نمایندے بھی شریک ہو رہے ہیں، شیخ الازہر نے اس جلسہ کی صدارت منظور کر لی ہے، اور مصر، شام، سعودی عرب، کویت، تونس، الجزائر، اور خلیج فارس کی ریاستوں کے نمایندے شرکت کے لئے آرہے ہیں، دوسرے ملکوں سے بھی خط و کتابت ہو رہی ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ یہ اجلاس اپنی نوعیت میں منفرد ہوگا، اور اس کے انعقاد سے ملک و ملت کو بہت فائدہ پہونچے گا،

افسوس ہے کہ گذشتہ ماہ مولانا محمد شاہد فاخری نے وفات پائی، وہ الہ آباد کے مشہور مذہبی خانوادہ دائرہ شاہ اجمل سے تعلق رکھتے تھے، مذہبی کاموں کے ساتھ ان کو ملک کے سماجی اور سیاسی مسائل سے بھی دلچسپی تھی، وہ جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر تھے، انھوں نے آزادی کی جد و جہد میں نمایاں حصہ لیا تھا، اور قید و بند میں بھی مبتلا ہوئے تھے، آزادی کے بعد بھی وہ ملک و ملت کی خدمت میں لگے رہے، اور اس راہ میں مشکلات و مصائب برداشت کرتے رہے، وہ دارالمصنفین کے کاموں کے بڑے قدردان اور مدّاح تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور انھیں اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے،

اس سال دارالمصنفین کی دو نئی کتابیں غالب (مدح و قدح کی روشنی میں) اور تذکرۃ المحدثین جلد دوم چھپ رہی ہیں، جو امید ہے کہ جلد شائع ہو کر دارالمصنفین کے دوامی ارا کین، اور عام شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی،

مقالات

دیار پورب کا تیسرا دور

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ایڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

سلطان محمد عالمگیر ۱۰۶۸ھ تا ۱۱۱۸ھ شاہجہاں کے بعد اس کے بیٹے عالمگیر نے تخت و تاج پایا، وہ عالم باعمل اور فقیری اور شہنشاہی کے جامع تھے، علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کے ساتھ شرعی احکام میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے، اور علماء و فضلاء، اور مشائخ کے قدردان تھے، ان کے دور میں ہندوستان میں اسلامی علوم و معارف کو بڑا فروغ ہوا اور علماء کی خوب قدر و منزلت ہوئی، انھوں نے مستند و متدین ارباب علم کو جمع کر کے فتاویٰ ہندیہ یا فتاویٰ عالمگیری مدوّن کرائی جو اسلامی فقہ پر پورے عالم اسلام میں اپنی نوعیت کا پہلا کام تھا، اس کتاب کو بعد کے ادوار میں اسلامی فقہ کی تدوین و ترتیب کے سلسلہ میں سنگ میل کہا جاسکتا ہے، عالمگیر کے پچاس سالہ دور سلطنت میں بلادِ پورب بغداد و قرطبہ کی ہمسری کرتے تھے، مولوی خیر الدین محمد نے تذکرۃ العلماء[۱] میں شیخ محمد ماہ جونپوری دیوگامی کے تذکرہ میں لکھا ہے،

در واقعات عالمگیری مسطور است کہ اورنگ زیب | واقعات عالمگیری میں ہے کہ اورنگ زیب

---

[۱] تذکرۃ العلماء ص ۵۰

عالمگیر پادشاه عالم باعمل و عامل باعلم بود، قدر دانیٔ علما بیش از بیش می نمود و از عهد شاهزادگی منظور داشت تا جونپور مثل زمانِ سلاطین شرقیه از کثرت فضلا و مشائخان و انبوه و هجوم طلبهٔ علوم و کاسبانِ فیوض رونق پذیر باشد، چون بر سریر سلطنت نشست بر لیغ واجب التبلیغ بناظم جونپور جهت ترقیم احوال مدرسان و مشائخان این شهر صادر گردانید، و سوانح نگاران و وقائع نویسان را احکام تهدید برائے تحقیقات کوائف بود و باش این گروه فرستاد،

القصه در عهد آنحضرت نمونهٔ گلزار ارم شده در تمام شهر و قصبات و نواحی آں مدرسهائے قدیم تاسیس یافتند و بسے خانقاه و مدرسه تعمیر جدید شدند چنانچه در مفتی محله میر ابو البقاء و میر مبارک و ملا محمد حفیظ، و در محله شاه مدار مولانا

عالمگیر عالم باعمل اور عامل باعلم بادشاہ تھے وہ زیادہ سے زیادہ علماء کی قدر دانی کرتے تھے، شاہزادگی کے زمانہ ہی سے اس کا خیال رکھتے تھے کہ جونپور علماء و فضلاء اور مشائخ کی کثرت اور طلبۂ علوم کے انبوہ اور کاسبان فیوض کی زیادتی میں سلاطین شرقیہ کے زمانہ کی طرح رونق پذیر ہو، چنانچہ جب وہ بادشاہ ہوئے تو شہر جونپور کے مدرسین و مشائخ کے حالات لکھنے کا حکم ناظم جونپور کو دیا، اور سوانح نگاروں اور وقائع نویسوں کو تاکید کی کہ وہ اس جماعت کے بود و باش کے بارے میں معلومات بہم پہونچائیں،

القصہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سلطنت میں جونپور گلزار ارم ہوگیا، شہر اور اطراف کے قصبات میں قدیم مدارس کی جدید تعمیر و تاسیس ہوئی اور بہت سے نئے مدارس اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں چنانچہ مفتی محلہ میں مدرسۂ میر ابو البقاء مدرسۂ میر مبارک اور مدرسہ ملا محمد حفیظ، محلہ شاہ مدار میں

میر نور اللہ، و در محلہ دریبہ میر عبد الباری
و در محلہ سپاہ فرزندان شیخ محمود، ہم
چنان در ہر محلہ جونپور مدرسہ بود کہ دران
مدرسے تعلیم فیوض طالبان می پرداخت
و در ہر کوچہ خانقاہے، کہ درویشے دران
کاسبانِ فیوض حق را رہبری می ساخت

مدرسہ مولانا نور الدین محلہ دریبہ میں مدرسہ
میر عبد الباری محلہ سپاہ میں، مدرسہ فرزندانِ
شیخ محمود قائم ہوئے، اسی طرح جونپور کے
ہر محلہ میں مدرسہ جاری تھا، ان مدرسوں
میں مدرسین طلبۂ علوم کو درس دیا کرتے
تھے، اور ہر گلی میں خانقاہ تھی جس میں مرشدین
بھی فیوض جاری رکھتے تھے۔

معلوم ہو چکا ہے کہ شاہجہاں اور امیر الامراء شائستہ خان، مولانا ابو الخیر بھیروی کے قدر دانوں میں تھے، اور ان دونوں نے مولانا کی عزت اور احترام میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، ان کے لڑکے شیخ اسمٰعیل بن شیخ ابو الخیر بھیروی، متوفی ۱۱۰۶ھ اپنے زمانے کے مشہور صوفیہ و مشائخ میں سے تھے، انھوں نے برہان پور میں میر سید شیر محمد سے تعلیم و تربیت پائی تھی، قیام برہان پور ہی کے زمانہ میں انکی بزرگی کا شہرہ ہو گیا تھا اس زمانہ میں شاہزادہ عالمگیر اس علاقہ کے ناظم تھے، انھوں نے میر سید شیر محمد سے دہلی کی سلطنت کے لئے دعا کی درخواست کی، میر صاحب نے شیخ اسمٰعیل سے بھی رجوع کرنے کا اشارہ کیا، چنانچہ شاہزادہ عالمگیر نے ان سے بھی دعا کی درخواست کی، جب سلطنت مل گئی، تو سلطان عالمگیر نے میر سید شیر محمد کو لکھا کہ شیخ اسمٰعیل کو دہلی آنے پر راضی کریں، اس درمیان میں شیخ صاحب بھیرا واپس آگئے تھے، میر صاحب نے سلطان کو صورت حال سے مطلع کیا، اس نے ناظم الہ آباد خانجہاں کو لکھا کہ جیسے ہو سکے

---

[1] تذکرۃ الصلحاء ص ۱۵

شیخ اسمٰعیل کو ادب و احترام کے ساتھ اردوئے معلٰی میں پہونچایا جائے، ناظم الہ آباد نے بھی کوشش کی مگر شیخ صاحب اپنا آستانہ چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئے، امیر الامراء نواب شایستہ خان شیخ ابوالخیر کی طرح ان کے صاحبزادے شیخ اسمٰعیل سے بھی عقیدت رکھتا تھا، اور وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا،

شیخ محمود اصل شمس پوری کا بیان ہے کہ میں جس زمانہ میں ناظم جونپور کے یہاں سپہ گری میں تھا، اتفاق سے دائرہ لشکر محمود آباد گہنہ پہونچا، یہاں سے شیخ اسمٰعیل کا آستانہ بہت قریب تھا، ہم چند سپاہی شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی زیارت و دعا سے فیضیاب ہوئے،

شیخ اسمٰعیل کے دوستوں میں دو بھائی قاضی نور اللہ گوپال پوری، اور قاضی خوب اللہ گوپال پوری تھے، قاضی خوب اللہ کو راجہ عظمت خان نے بڑی قدر و منزلت کے ساتھ اپنے یہاں عظمت گڈھ (اعظم گڈھ) بلایا مگر کچھ دنوں کے بعد ناسازگار حالات کی بنا پر ان کا وظیفہ نہ دے سکا، جب شیخ اسمٰعیل کو قاضی خوب اللہ کی پریشانی کا حال ان کے بھائی کے ذریعہ معلوم ہوا تو ان کے حق میں کلمۂ خیر کہا، اور دعا کی، قاضی خوب اللہ عظمت گڈھ سے برداشتہ خاطر ہو کر تلاش معاش میں دہلی چلے گئے، جب بادشاہ عالمگیر کو ان کے علمی و دینی مرتبہ کا پتہ چلا تو خصوصی توجہ کی[1]

مفتی نور اللہ بن شیخ حسین بنارسی متوفی ۱۱۳۳ھ عہد عالمگیری میں بنارس کے قاضی و مفتی تھے، سلطان ان کا بڑا معتقد تھا، ان کے لیے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی، محلہ دارانگر میں شاہزادگی کے دور میں ایک شاندار سنگین مسجد بنوائی جو مسجد عالمگیری اور مسجد فوارہ کے نام سے مشہور ہے، اس کے بعد عالمگیر کے حکم سے مفتی صاحب کے لئے ایک عالی شان خانقاہ

---

[1] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی،

تعمیر ہوئی۔

مفتی نور اللہ کے صاحبزادے مولانا حافظ امان اللہ بنارسی متوفی ۱۱۳۳ھ بھی عالمگیر کی عنایات و توجہات کا مرکز تھے، عالمگیر نے ان کو لکھنؤ کی صدارت عطا کی، جب کہ ان کے ہم سبق اور استاد بھائی قاضی محب اللہ بہاری کو وہاں کا قاضی مقرر کیا، اور دونوں معاصر فضلاء میں علمی بحث و مباحثہ کی سرگرمیاں رہیں۔[1]

شیخ عبداللطیف بن عبدالبادی منجھن پوری دیوان محمد رشید کے خلفاء میں سے تھے اور ان کے صاحبزادے محمد ارشد کے خسر تھے، ان کا وطن نظام آباد کے نواح میں منجھن پور تھا، ان سے عالمگیر کے گہرے تعلقات تھے، اس نے رقعات میں ان کے متعلق "شیخ عبداللطیف قدس سرہ شریف می فرمود، لکھا ہے،

اسی دور میں میر سید قیام الدین سکراوی گورکھپوری متوفی ۱۱۲۰ھ دیوان محمد رشید جونپوری کے مرید و خلیفہ بڑے زاہد و عابد اور مرتاض درویش تھے، وطن نواح سگڑی (اعظم گڈھ) میں تھا، مگر بعد میں گورکھپور میں قیام کیا، سبز پوش خاندان کا تعلق ان ہی سے ہے، ۲۸، صفر ۱۱۲۰ھ کو انتقال کیا۔[2]

قاضی خلیل الرحمٰن گورکھپوری زبردست عالم اور بہت نیک آدمی تھے، فدائی خان دائی گورکھپور نے ان کے بارے میں عالمگیر سے سفارش کی سلطان نے ان کی طرف خصوصی توجہ کی اور شاہی عہدہ دیا، اور آخر میں گورکھپور کا حاکم بنایا۔

مولانا ابوالواعظ بن صدرالدین ہرگامی مشاہیر اہل علم میں سے تھے، عالمگیر نے ان سے تعلیم پائی تھی، اور فتاوی عالمگیری کے جامعین و مولفین میں ان کو بھی رکھا تھا،

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۸۰، و مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲ [2] سمات الاخیار ص ۶۴،

شیخ احمد بن عبد اللطیف بلگرامی متوفی سنہ ۱۰۹۶ھ نہایت خوش خلق عالم ہونے کے ساتھ حساب و ریاضی میں مہارت تامہ رکھتے تھے، عالمگیر کے حاکم مکرم خان نے ان کو مقام بھاسو کا حاکم بنایا تھا،

شیخ پیر محمد سلونی متوفی سنہ ۱۰۹۹ھ نے اس دیار میں تبلیغ اسلام کر کے بہت سے سنیاسیوں کو دولت دین و ایمان سے مالا مال کیا، بڑے بڑے علماء و فضلاء ان کے تلامذہ و مریدین میں تھے عالمگیر نے ان کو کئی گاؤں جاگیر میں عطا کئے جو مدتوں ان کے خاندان میں باقی رہے،

قاضی علی اکبر حسینی الہ آبادی متوفی سنہ ۱۰۹۰ھ کو وزیر سعد اللہ خان نے اپنے لڑکے لطف اللہ کا معلم بنایا، اور لطف اللہ نے ان سے بھرپور استفادہ کیا، پھر وزیر سعد اللہ خان نے ان کو عالمگیر سے ملایا، اور سلطان نے شاہزادہ محمد اعظم کا معلم بنایا، بعد میں ان کو لاہور کا قاضی بنادیا، جہاں وہ باقی عمر رہے قاضی علی اکبر بھی فتاوے عالمگیری کے جامعین و مولفین میں سے تھے

مولانا محمد صادق بن مفتی ابو البقاء جونپوری کو عالمگیر نے شاہزادہ محمد معظم کا معلم بنایا، اس نے ایک زمانہ تک مولانا سے استفادہ کیا، عالمگیر کے بعد جب محمد معظم بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے استاد کو جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں جاگیر عنایت کی، وہیں چلے گئے، اور وہیں فوت ہوگئے۔

مفتی وجیہ الدین گوپاموی متوفی سنہ ۱۱۰۳ھ کو عالمگیر نے فتاوے عالمگیری کی تدوین و تالیف کے سلسلہ میں اعلیٰ عہدہ پر رکھا تھا، ان کی نگرانی میں علماء فقہاء فتاوے مرتب کرتے تھے، اور خود انھوں نے اس کتاب کا کافی حصہ مدون کیا ہے،

مولانا قطب الدین سہالوی شہید سنہ ۱۱۰۳ھ کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ محمد سعید عالمگیر کی خدمت میں پہونچے اور اپنے والد کی مظلومانہ شہادت کی ظالمون

یارتی کا ذکر کیا، سلطان نے ان کو لکھنؤ میں ایک فرنگی تاجر کی کوٹھی عطا کی جو بعد میں علماء فرنگی محل کا مرکز بنی۔

مولانا احمد بن ابوسعید (ملا جیون) امیٹھوی متوفی ۱۱۳۰ھ مصنف نور الانوار و تفسیر احمدی دکن میں چھ سال تک عالمگیر کی فوج میں دینی خدمت انجام دیتے رہے، جب شاہ عالم بن عالمگیر دکن سے واپس ہوا تو مولانا نے اجمیر میں اس کا استقبال کیا، اور اسی کے ساتھ لاہور جاکر قیام کیا، اس کے انتقال کے بعد دہلی آکر فرخ سیر سے متعلق ہو گئے، عالمگیر سے ان کے تعلقات کے عجیب عجیب واقعات مشہور ہیں، شیخ احمد بن ابومنصور گوپا موی ملا جیون کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، فقہ و اصول فقہ اور عربیت میں مہارت تامہ رکھتے تھے، عالمگیر نے فتاوی عالمگیری کی تدوین و تالیف میں ان کو شریک کرکے روزانہ ایک روپیہ اور کچھ غلہ بطور وظیفہ کے مقرر کیا تھا،

مولانا جلال الدین مچھلی شہری بھی فقہ و اصول فقہ کے مشہور عالم تھے، عالمگیر نے ان کو بھی فتاوی عالمگیری کی تدوین میں شریک کیا تھا، ایک روایت کے مطابق اس کی پہلی جلد ان ہی کی مرتب کردہ ہے،

قاضی حبیب اللہ جونپوری متوفی ۱۱۰۵ھ عالمگیر کی طرف سے جونپور کے قاضی تھے، اس کے بعد ڈھاکہ کے قاضی بنائے گئے جہاں پوری زندگی بسر کی، نہایت متقی اور بڑے دیندار عالم تھے، ڈھاکہ میں ایک شخص نے سب شیخین کیا تو اس کے قتل کا حکم دیا، حالانکہ وہاں کا حاکم بھی اس وقت اس کا ہم مذہب تھا، مگر اس کی پروا نہیں کی،

شیخ سعد اللہ سلونی (۱۱۳۰ھ) شیخ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے، حج و زیارت سے واپسی پر سورت میں قیام پذیر ہو گئے، عالمگیر نے ان کو جاگیر میں گاؤں عطا کئے جن کی سالانہ

اٹھ ہزار روپیہ کی آمدنی تھی، عالمگیر ان کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا، ان کے اشارے پر چلتا تھا اور ان کی سفارش قبول کرتا تھا، ان کے خطوط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا، ایک مرتبہ شیخ سعد اللہ نے ایک حاکم کے بارے میں سفارش کی تو اس کا جواب عالمگیر نے خود نہیں لکھا بلکہ دوسرے سے لکھوایا کہ آپ جیسے عالم دین کے لیے زیبا نہیں ہے کہ ظالموں کے بارے میں مجھے خطاب کریں، شیخ سعد اللہ بارہ اماموں کی محبت وعقیدت کے لیے عالمگیر کو اکثر خطوط لکھا کرتے تھے، جب اس کا سلسلہ بہت زیادہ ہوگیا تو عالمگیر نے درباری علماء سے بطور اظہار واقعہ کہا کہ شیخ سعد اللہ اہل بیت کی محبت کے بارے میں مجھے برابر تاکیدی خطوط لکھتے رہتے ہیں، اور یہ صحیح بھی ہے، مگر اہل سنت والجماعت کے نزدیک امامت صرف بارہ ائمہ میں منحصر نہیں ہے، اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ عالمگیر دین کو تعلقات پر کس اہتمام کے ساتھ مقدم رکھتے تھے۔

مفتی شرف الدین لکھنوی متوفی ۱۱۳۳ھ کو عالمگیر کی طرف سے چہار صدی ذات کے منصب کے ساتھ بعض شرعی خدمات سپرد کی گئی تھیں وہ محمد شاہ کے دور سلطنت تک اسی عہدہ پر رہے اس کے بعد سہ ہزاری ذات کا اضافہ ہوا، اور فدائی خان کے نائب حیثیت سے کئی سال تک رہے۔

مولانا شکر اللہ جنیدی جونپوری متوفی ۱۱۳۵ھ اپنے والد کے حکم و مشورہ سے عالمگیر کی خدمت میں بیجاپور گئے، عالمگیر نے ان کی آمد کو غنیمت جان کر شاہی عنایات سے نوازا

میر عبد الجلیل بلگرامی متوفی ۱۱۳۰ھ نے دکن جاکر عالمگیر سے ملاقات کی، اس نے ان کو لاعہد کے علاقہ گجرات کی بخشی گری اور وقائع نگاری پر مامور کیا، پھر سندھ کے علاقہ بھکر اور سیوستان میں اسی عہدہ پر رکھا جہاں ۱۱۱۶ھ تک رہے اور فرخ سیر کے

دور میں یہ عہدہ ان کے صاحبزادے سید محمد بن عبد الجلیل کے سپرد ہوا۔

قاضی عبد الصمد جونپوری فقہ کے ماہر تھے، دہلی جاکر فتاوے عالمگیری کی تدوین میں شریک ہوئے، پھر دکن میں ایک مقام کے قاضی مقرر کیے گئے، آخر میں لکھنؤ میں مقیم ہوئے، عالمگیر نے کئی دیہات کی جاگیر عطا کی،

مولانا عبد الہادی بلگرامی متوفی ۱۱۳۳ھ فراغت کے بعد عالمگیر کے شاہی لشکر میں گئے، اور اس نے ان کے علم و فضل کو دیکھکر صوبہ الہ آباد میں ایک منصب دیکر ایک گاؤں جاگیر میں عنایت کیا۔

قاضی عصمت اللہ لکھنوی متوفی ۱۱۱۳ھ عالمگیری دربار سے منسلک رہے، پہلے مراد آباد کے حاکم مقرر کیے گئے، پھر دوسرے شہروں کی حکومت ملی،

شیخ غلام محمد لکھنوی متوفی ۱۱۳۶ھ علمائے ربانی میں سے تھے، عالمگیر نے ان کو لشکر کا محتسب بنایا تھا، جہاں وہ بڑی مستعدی اور ذمہ داری سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت انجام دیتے تھے، عالمگیر نے ان کی ذمہ دارانہ زندگی دیکھکر عہدۂ قضا دپیش کیا مگر انھوں نے اسے قبول نہیں فرمایا،

مولانا محمد اسعد پھلواری بڑے پایہ کے عالم تھے، عالمگیر نے ان کو برہان پور کا صدر بنایا تھا،

شیخ محمد انور گوپامئوی متوفی سنہ ۱۱۱۱ھ شاہجہان کے دور میں تسبیح خانہ کے نگران تھے، جب شاہجہان کے شاہزادوں میں سلطنت کے لیے کشمکش ہوئی تو یہ ملازمت چھوڑکر وطن چلے آئے، اور عالمگیر کا دور سلطنت آیا تو اس کی خدمت میں امام غزالیؒ کا ایک رسالہ جو ان ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، پیش کیا، عالمگیر اس نادر علمی ہدیہ پر

بہت خوش ہوا، اور دریافت کیا کہ کیا آپ کے خاندان میں کوئی شخص حکومت میں ملازمت کرتا تھا، شیخ محمد انور نے جواب دیا کہ ہمارے خاندان کے لوگ اللہ تعالٰے کے ملازم تھے، بدقسمتی سے ایک میں حکومت کا ملازم تھا، یہ جواب عالمگیر کو بہت پسند آیا، اور اس نے ان کو بخشی کا دبیر مقرر کیا، شیخ محمد انور حج کو جانے لگے تو عالمگیر نے تین لاکھ کی رقم دی تاکہ فقرائے حرمین شریفین میں تقسیم کر دی جائے، شیخ صاحب نے سورت میں اس رقم سے چاول، اور کپڑے خرید کر جدہ میں ان کو فروخت کیا جس سے نو لاکھ کی رقم حاصل ہوئی، اور حرمین شریفین کے حاجت مندوں میں تقسیم کی گئی۔

شیخ محمد حنیف کنتوری کو عالمگیر نے دکن میں مقام سنگمیر کی بخشیگری اور وقائع نگاری کا منصب دیا جہاں وہ ایک زمانہ تک رہے، بعد میں خلد آباد (روضہ) کے قاضی ہوئے۔

شیخ محمد غوث کاکوری متوفی ۱۱۱۸ھ کو بھی عالمگیر نے فتاوی کی تالیف میں شریک کیا تھا، اس کی تکمیل کے بعد اودھ میں خراج کی وصولی پر مقرر کیا۔[1]

عالمگیری دور میں قاضی محمد صالح بن شیخ کمال الدین ساکن گھرا (مبارکپور) اس دیار کے قاضی تھے، انھوں نے ۱۰۹۹ھ میں یہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی، جو عالمگیری مسجد کے نام سے مشہور ہے، اور اب خستہ ہو رہی ہے، اس میں تین در، تین گنبد اور دائیں بائیں دو مینارے ہیں، بیرونی فرش کے سامنے اوپر سنگ موسیٰ کا ایک کتبہ ہے جس میں یہ اشعار بخط جلی کندہ ہیں،

در زمان شاہ عالم گیر دین پرور کزد — رونق دین محمد ہست افزوں از قیاس
شد بنا از فیض خورشید کرم للمتقین — مسجدے کز نور آن انجم نماید اقتباس

---

[1] ان واقعات کے لیے نزہتہ الخواطر، تجلی نور، آثر الکرام، تذکرہ علمائے ہند وغیرہ ملاحظہ ہوں۔

حاملانِ عرش گفتند از کمال کیست این — گفتم از ابن الکمال است کمالِ حق شناس

رفعتِ شانش بہ بیت اللہ می نازد بہ فضل — ذرۂ از جشن باوجِ آسماں کردہ اساس

سال تاریخش بپرسیدم ز پیرِ عقل گفت

از محمد صالح است این مسجدِ احسن اساس [1]

۱۰۹۰ھ

عالمگیر کے بعد کے تیموری سلاطین

عالمگیر کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کئی بادشاہ گزرے ہیں، مگر مورخین نے محمد شاہ کو خاتم السلاطین لکھا ہے، کیونکہ ان بادشاہوں کی حکومت برائے نام تھی، اور ان کا دور اندرونی اور بیرونی انتشار وخلفشار سے ملو ومشحون تھا، علم وعلماء کی محفلیں اجڑ رہی تھیں، اور مدرسوں اور خانقاہوں کا سکون واطمینان ختم ہو رہا تھا، بہت سے علماء ملک کی مختلف نوابوں اور رئیسوں کے یہاں چلے گئے، اور کچھ اب بھی دہلی سے منسلک رہے۔

پہلے گذر چکا ہے کہ مولانا محمد صادق جونپوری کو عالمگیر نے شاہزادہ محمد معظم کا معلم بنایا تھا۔ جب محمد معظم کا دورِ سلطنت آیا، تو اس نے جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں ان کو منصب اور جاگیر سے نوازا،

مولانا غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی متوفی ۱۱۲۶ھ سے شاہ عالم نے نیازمندانہ ملاقات کی اور ان کے ادب واحترام کا پورا پورا لحاظ رکھا،

قاضی عبدالصمد چریاکوٹی متوفی ۱۱۷۰ھ اپنے والد کے حکم سے پرگنہ چریاکوٹ کے موروثی عہدۂ قضا کے لئے دہلی گئے، جہاں ارکان دولت اور علماء وفضلائے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا اور محمد شاہ نے ان کو پرگنہ چریاکوٹ کا قاضی بنایا۔

شیخ ابوالنجیب امیٹھوی کو والیٔ لکھنؤ خدائی خان نے اپنے مقربین شامل کرکے

---

[1] تذکرۂ علمائے مبارکپور، ص ۸۴

ان کا وظیفہ مقرر کیا جس سے وہ ایک مدت تک متمتع ہوتے رہے،

قاضی تاج الدین دیوی متوفی ۱۱۵۵ھ محمد شاہ کے دور سلطنت میں دہلی کے قاضی القضاۃ تھے،

مولانا حمداللہ سندیلوی مصنف شرح سلم نواب اودھ ابوالمنصور صفدر جنگ کی سفارش سے احمد شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے، اور بادشاہ نے ان کو فضل اللہ خان کا خطاب دے کر کئی دیہات جاگیر میں عنایت کئے، اس کے بعد مولانا نے سندیلہ میں ایک بڑا مدرسہ تعمیر کیا۔

مولانا روح اللہ بلگرامی متوفی ۱۱۵۱ھ نے دہلی جاکر وزیر منعم خان سے ملاقات کی اور وہ آپ کے علم و فضل کا گرویدہ ہوگیا، مگر جلد ہی اس کا انتقال ہوگیا، تو مولانا سردار خان کی طرف سے الہ آباد کے نائب حاکم مقرر کئے گئے، پھر نواب سربلند خان نے ان کو سیال کوٹ اور جالندھر وغیرہ کے بارہ علاقوں کا حاکم بنایا، کچھ مدت کے بعد نواب متور خان والی شاہ جہان پور کے پاس رہے، اس کے بعد نواب مظفر الدولہ کی طرف سے اودھ سے نائب حاکم ہوئے پھر محمد خاں بنگش سے وابستہ ہوگئے، اور آخر میں برہان الملک کے ساتھ نادر شاہ سے جنگ میں شریک ہوئے

شیخ صدر جہاں صفی پوری فرخ آباد میں نواب فخر الدولہ سے وابستہ رہے، اور جب وہ ۱۱۸۵ھ میں قتل کر دیا گیا تو اپنے وطن صفی پور چلے آئے۔

مولانا عبداللہ بلگرامی متوفی ۱۱۳۲ھ نواب سربلند خان کی خدمت میں پہونچے اس نے فوج میں عدل کا عہدہ دار بنایا، اور ۱۱۲۴ھ میں احمد آباد کی صدارت دی،

مولانا عسکری سندیلوی دہلی جاکر ابوالمنصور خاں صفدر جنگ سے وابستہ ہوئے، اس نے ان کو احمد شاہ کی خدمت میں پیش کیا، احمد شاہ نے ان کو خیراللہ خان کا لقب

دیکر اودھ میں کئی دیہات کی جاگیر دی تاکہ مدرسہ بنائیں، چنانچہ مولانا موصوف نے دہلی سے واپس آکر سندیلہ میں ۱۱۰۶ھ میں مدرسہ منصوریہ تعمیر کیا،

گذر چکا ہے کہ شیخ محمد بن عبدالجلیل بلگرامی متوفی ۱۱۸۵ھ فرخ سیر کے دور سلطنت میں اپنے والد کی جگہ بھکر اور سیوستان میں بخشی اور وقائع نویس بنائے گئے تھے، اور جب نادرشاہ کا فتنہ برپا ہوا تو وطن چلے آئے، شیخ محمد اشرف بلگرامی متوفی ۱۱۶۵ھ تلاش معاش میں دہلی گئے، اور بہت دنوں تک محمد اعظم شاہ کے مصاحبین میں رہے، اس کے بعد مبارز الملک اور صفدر جنگ سے وابستہ ہوگئے۔

قاضی محمد پناہ جونپوری اس وقت دہلی پہونچے جب کہ نادرشاہ حدود دہلی میں موجود تھا، محمد شاہ نے دہلی کے علماء کو بلایا تاکہ وہ نادرخان کے جلو میں آنے والے علماء سے مسئلہ قتال میں مناظرہ کریں، اس نازک موقع پر علمائے دہلی نے قاضی محمد پناہ کو اپنا نمائندہ بناکر آگے بڑھایا، اور انھوں نے نادرشاہی علماء و فضلاء کو مناظرہ میں خاموش کر دیا نادرخان ان کی قابلیت دیکھکر مستعدخان کا خطاب دیا، اس کے بعد محمد شاہ نے ان کو جونپور کا قاضی مقرر کیا،

مولانا محمد شاکر لکھنوی متوفی ۱۲۳۳ھ نے شاہ عالم کے حکم سے قصیدہ بردہ کی شرح لکھی تھی، اور اس کا صلہ پایا تھا،

ان چند واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دیار پورب کی جو علمی و دینی محفل سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ۷۶۰ھ سے ابتک جمی ہوئی تھی، اور فیروزیوں، شرقیوں، لودیوں، اور تیموریوں کے انقلابات کا کوئی اثر اس پر نہیں پڑا تھا، اب اس میں ضعف و اضمحلال آنے لگا، اور علماء و فضلاء بے حال و پریشان ہو کر مدرسوں اور خانقاہوں سے

نکلنے پر مجبور نظر آنے لگے، سنہ ۱۱۳۰ھ کے بعد دہلی کی مرکزیت طوائف الملوکی سے بدل گئی اس بدامنی میں علمی مراکز بھی تباہی سے دوچار ہوئے، مدتوں کے جمے ہوئے مدرسے اکھڑ گئے، خانقاہیں ویران ہوگئیں اور علماء و طلبہ ادھر اُدھر منتشر ہوگئے مورخین بغداد کی تباہی کو روتے ہیں، لیکن ہندوستان کی بربادی کی داستان اس سے کچھ کم دردناک نہیں ہے، موقع ملا تو کبھی یہ قصۂ غم بھی سنایا جائے گا،

حیاتِ شبلی

(طبع دوم)

مولانا شبلی کی بہت مفصل سوانح عمری جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کے رقم قلم سے، جس کے عالمانہ، فاضلانہ، اور محققانہ مقدمہ میں جو اس کتاب کا شاہکار ہے، موجودہ اتر پردیش کے مشرقی و شمالی اضلاع بنارس، جونپور، غازیپور، اعظم گڈھ کے بہت سے علماء و فضلاء و اصحاب درس و تدریس مثلاً حافظ امان اللہ بنارسی، ملا باب اللہ، مولانا الہداد، ملا افضل، دیوان عبدالرشید، ملا محمود، مولانا کرامت علی، مولانا سخاوت علی جونپوری، اور پھر مولانا شبلی کے ہم عصر علماء، مولانا فاروق چریاکوٹی، مولانا سلامت اللہ جیراجپوری، اور حافظ عبداللہ غازیپوری وغیرہ کا ذکر اجمال کے ساتھ آگیا ہے، اس کے بعد اصل کتاب ہے جس میں مولانا شبلی کی زندگی کے ہر پہلو پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت:- عـہ

منیجر

مولانا شمس الحق عظیم آبادی

از مولوی محمد عزیر صاحب بہاری مرکزی دارالعلوم بنارس

(۲)

مرض و وفات | سنہ ۱۹۱۰ء میں طاعون کی بیماری پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی، بہار میں مولانا کا ضلع پٹنہ خاص طور پر اس کی زد میں تھا۔ مولانا کے موضع ڈیانواں کی کیفیت خود ان ہی کی زبانی ملاحظہ ہو، وہ وفات سے سات روز قبل ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۴ مارچ سنہ ۱۹۱۱ء کو مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نام اپنے ایک گرامی نامہ لکھتے ہیں۔

"...... ہم عرصہ سے علیل ہیں، اور ضعف غالب ہوتا جاتا ہے، اور غذا بہت کم، اسی لیے بنظر تبدیل آب و ہوا، ڈیانواں سے مع سامان سفر روانہ ہوتے پہلے جبل راجگیر پر اقامت چاہتے تھے، پھر بعد میں یکماہ کے سفر دہلی وغیرہ کرتے، اسی خیال سے اپنے سب طالب علموں کو بھی رخصت کر دیا۔ اور سب کام بند کر کے روانہ ہوئے ...... بعد روانگی میرے معلوم ہوا کہ ڈیانواں میں بھی طاعون آگیا اور بہت زور ہے، مجبوراً نہایت حیرانی و پریشانی کی حالت میں واپس آئے اور افسوس علامت یوم یفر المرء من اخیہ کی پایا۔ ایسا چھوٹا قریہ اور یہ حالت، اللہ تعالیٰ رحم فرمادے اور امن عطا کرے، میرے سارے خدام بیمار اور بعض بعض بخوف دوسری دوسری جگہوں میں چلے گئے، عجیب نازک حالت ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے

میرے مختار و منشی اور جو لوگ کام دفتر کا کرنے والے ہیں، سب کے سب چپکے روانہ ہوگئے، یہ قریہ گویا اس وقت خالی ہے، ہم اس وقت یہ خط لکھتے ہیں اور طبیعت بالکل حاضر نہیں ہے . . . . . اللہ اللہ ہر دن دو تین موتیں ہوتی ہیں۔ سارے لوگ جھونپڑی میں بدحواس ہیں، اشخاص چند اندر مکان کے بستے ہیں، یہ قریہ صغیرہ حکم میں قریہ کبیرہ کے ہے، چونکہ ساری اشیاء ما یحتاج الیہا ہر وقت ملتی ہیں، مگر آج کل چونکہ سارے لوگ بھاگے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ کی چینی بھی نہیں ملتی ہے۔ اللہ تعالے رحم فرما دے [1]

ڈیانواں آنے کے چند ہی روز بعد ۱۳ ربیع الاول مطابق ۱۵ مارچ کو وہ خود طاعون کے مرض میں مبتلا ہوئے، اور چھ دن بعد ۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ ۲۱ مارچ ۱۹۱۱ء کو بروز سہ شنبہ ۹ بجے صبح ۵۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بقول مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی "جس وقت کہ دنیا کا آفتاب طلوع ہوا تھا اسی وقت دین کا آفتاب (شمس الحق) غروب ہوا [2]"

ان کی وفات پر بہت سے اہل علم نے قطعات تاریخ، اور شعراء نے اردو فارسی اور عربی میں مرثیے کہے، علماء نے تاثرات قلمبند کئے۔ مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی کے تینوں زبانوں میں پردرد اشعار اور مختلف مادہ ہائے تاریخ اور مولانا ابوالوفا ثناء اللہ، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، شاہ عین الحق پھلواروی اور مولانا عبدالسلام مبارکپوری کے تاثرات قابل ذکر ہیں۔ [3] لیکن طوالت کے خوف سے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

---

[1] الجدیث ۳۱ مارچ ۱۹۱۱ء ص ۴ [2] الامر المبرم ص ۲۱۲ [3] الامر المبرم ص ۲۱۲ و ۲۱۴ و ہفتہ وار اہلحدیث ۳۱ مارچ و ۲۱ و ۲۸ اپریل ۱۹۱۱ء

اولاد | مولانا کے چار لڑکیاں اور ۳ لڑکے تھے، لڑکوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ محمد شعیب۔ یہ بچپن میں پانچ ہی ماہ کی عمر میں انتقال کر گئے تھے۔

۲۔ حکیم ابو عبداللہ محمد ادریس، ۱۰ رجب ۱۲۹۰ھ کو پیدا ہوئے۔ تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا، ان کی چھ اولادوں میں ایک لڑکی اور دو لڑکے ابو محمد عبداللہ اور عبدالباسط بقید حیات ہیں۔

۳۔ حافظ عبدالفتاح المعروف بہ محمد ایوب۔ بروز یکشنبہ، محرم ۱۳۰۵ھ کو پیدا ہوئے، تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی[1]

کتب خانہ۔ | اوپر گزر چکا ہے کہ مولانا کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا چنانچہ ان کا کتب خانہ ہندوستان کے عظیم الشان کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا، یہ مختلف فنون کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں پر مشتمل تھا، فن حدیث کے اتنے عمدہ ذخیرہ سے اس وقت کے اکثر کتب خانے خالی تھے۔ اس کتب خانہ میں مخطوطات اور نادر و نایاب کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا تھا، جو یورپ کے بعض بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی نہیں پایا جاتا تھا۔[2] بنارس کے ٹاؤن ہال میں ۴/ اپریل ۱۹۰۶ء کو ندوۃ العلماء کے زیر اہتمام جن نادر و کمیاب کتابوں کی نمائش کی گئی تھی، ان میں فن حدیث کی بعض نہایت قدیم اور نایاب کتابیں مولانا شمس الحق عظیم آبادی ہی کے کتب خانے سے آئی تھیں، علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے مندرجۂ ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

"مسند عبد بن حمید الکسی۔ مسند ابو عوانہ۔ کشف الاستار عن زوائد مسند البزار للہیثمی، مصنف ابن ابی شیبہ، معرفۃ السنن والآثار للبیہقی، معالم السنن للخطابی،

---

[1] یادگار گوہری ص ۱۱۲ تا ۱۲۵ [2] الحدیث ۲۰/ اپریل ۱۹۱۱ء ص ۳ و ۴

شرح [illegible] ابوداؤد ابن القیم

ان کے علاوہ [illegible] ابن حبان، مسند بزار، مسند حمیدی، مختار مختصر تاریخ بغداد، التمہید لابن عبد البر، شرح [illegible] الترمذی، المحمد عاشق بن عمر الحنفی۔ تقیید المہمل وتمییز المشکل لابی علی حسین ابن محمد الغسانی، [illegible] الیمانی۔ الاطراف للمزی، اور النکت الظراف علی الاطراف لابن حجر جیسی سیکڑوں اہم قلمی کتابیں کتب خانے میں موجود تھیں۔ یہ کتب خانہ حضرت مولانا کی عمر بھر کی محنت وجانفشانی کا نتیجہ اور ان کے خداداد شوق علم کا ثمرہ تھا، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی اس کتب خانہ کی متعدد کتابوں کے نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں۔

افسوس اور کتابوں کے نام اس وقت یاد نہیں آتے۔۔۔۔۔ غرض صوبہ بہار میں خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانہ کے بعد جو بانکی پور میں ہے انکا کتب خانہ قابل ذکر تھا، لیکن ذخیرہ حدیث وتفسیر واسماء الرجال کے لحاظ سے ان کے کتب خانے کا نمبر اول ہے،[۲]

لیکن یہ بیش قیمت کتب خانہ مولانا کی وفات کے بعد باقی نہیں رہا، غالباً اس کی کتابیں ادھر ادھر منتشر ہوگئیں اور دوسرے کتب خانوں میں چلی گئیں بقول مولانا عبید اللہ رحمانی۔

افسوس اب اس کتب خانہ سے علامہ مرحوم کے اخلاف میں سے کوئی فائدہ اٹھانے والا ہے نہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے والا، انا للہ۔۔۔"[۳]

حالانکہ علامہ کی وفات کے بعد مولانا عبد السلام مبارکپوری مرحوم نے ان کے صاحبزادہ سے کیسی دردمندانہ گذارش کی تھی کہ۔

---

[۱] الندوہ ۳ نمبر ۲ مقالات شبلی ج ۶، ص ۱۰۱ و الحدیث ۳۱ مارچ ۱۹۱۱ء [۲] الحدیث ۳۱ مارچ ۱۹۱۱ء [۳] سیرۃ البخاری ص ۳۰ (حاشیہ) طبع دوم [۴] الحدیث ۲۰ اپریل ۱۹۱۱ء ص ۴

[۵] الندوہ جلد ۸ نمبر ۲ مقالات شبلی جلد ۶ ص ۱۰۱ و الحدیث ۳۱ مارچ ۱۹۱۱ء

"میں فاضل نوجوان حکیم محمد ادریس صاحبزادہ سے ملتمس ہوں کہ کتب خانے کے جواہر نادرۃ الوجود اور درر العلماء گراں مایہ کی آپ قدر کریں گے، اور کتب خانہ کی فہرست مرتب کرا کر طبع کرا دیں گے کیونکہ علامہ ابوالطیب مرحوم نے بار ہا مجھ سے فرمایا تھا، کہ کتب خانہ کی مکمل فہرست تیار نہیں یا میرا ارادہ مصمم ہے کہ جلد فہرست مرتب کرا دوں۔ لیکن کثرت اشغال سے فرصت نہیں ملتی ———— ایک دوسری التماس یہ ہے کہ علامہ ابوالطیب مرحوم نایاب سے نایاب اور قیمتی سے قیمتی قلمی کتابوں کے عاریۃً دینے میں مطلقاً عذر نہ فرماتے اور اس میں بڑی فیاضی سے کام لیتے جن سے اکثر دھوکا بھی اٹھانا پڑتا۔ لیکن اس میں انھوں نے کبھی بخل سے کام نہ لیا۔ بلکہ وہ شائقین علم کے شائق تھے، پس یہ فیض بھی آپ کا جاری رکھنا بہتر ہے، لیکن اس کے لیے کوئی باضابطہ انتظام کرنا ضروری ہے"[1]

ایسے عظیم الشان اور عمدہ کتب خانہ کا یہ انجام کتنا دردناک ہے۔

تصنیفات مولانا کو تصنیف و تالیف کا بڑا عمدہ ذوق تھا، کتب حدیث کی شرح و تحقیق اور تصحیح و تعلیق کے علاوہ فقہ و افتا، رجال و تاریخ اور تذکرہ و سیر میں بھی انھوں نے مفید اور بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ان سے ان کے علمی تبحر، جامعیت، وسعت نظر، حدیث و فقہ میں بصیرت، رجال و اسناد اور تاریخ و سیر میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے ذیل میں ان کی تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے۔

۱۔ غایۃ المقصود فی حل سنن ابی داؤد ۔ یہ سنن ابی داؤد کی مبسوط اور جامع شرح ہے، لیکن اس کی صرف ایک ہی جلد مطبع انصاری دہلی سے مولانا تلطف حسین عظیم آبادی (متوفی ۱۳۳۴ھ) کے اہتمام میں شائع ہوئی ہے، عام خیال ہے کہ یہ بتیس جلدوں میں

---

[1] اہلحدیث امرتسر ۱۹ اپریل ۱۹۱۲ء

میں ہو سکی لیکن بعض اہل علم نے اسکو مکمل بنایا ہے[۱] مولانا عبد السلام مبارکپوری المتوفی ۱۳۴۲ھ تحریر فرماتے ہیں غایۃ المقصود غالباً دس پاروں تک پہنچی جو بعد ختم تقریباً عینی شرح بخاری کے برابر پہنچتی، مگر یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ عون المعبود کے آخر میں "فوائد متفرقہ" کے زیر عنوان تحریر کیا گیا ہے۔

و منها قول ابی داؤد فی باب	ابو داؤد کے قول کو کتاب الجنائز
الامراض المکفرۃ للذنوب	کے باب الامراض المکفرۃ للذنوب
من کتاب الجنائز (.....)	...... میں صاحب غایۃ المقصود نے
ذکرہا صاحب الغایۃ	پہلے اسی طرح ذکر کیا ہے جس طرح
مثل ما ذکر فی هذا الشرح	اس شرح میں ذکر کیا گیا ہے، پھر
... ثم قال فی الغایۃ ...[۲]	وہ غایۃ المقصود میں فرماتے ہیں۔

اس تحریر میں جس باب کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ سنن ابی داؤد کے بیسویں پارے اور عون المعبود کی تیسری جلد میں ہے،[۳] اس کے بعد عون المعبود میں کسی اور جگہ غایۃ المقصود کا کوئی حوالہ نہیں ملتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غایۃ المقصود کی شرح بیس پارے تک مکمل ہو چکی تھی، مگر افسوس کہ شرح کے جو اجزا لکھے جا چکے تھے، وہ بھی ناپید ہیں، اور ان کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا ہوئے۔

مطبوعہ جلد بڑی تقطیع کے ۲۹۱ صفحے پر مشتمل ہے، اس میں ابتدا یعنی کتاب الطہارۃ

---

[۱] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات صفحات ۲۲۲، ۲۲۳ ۔ تذکرۃ المحدثین (دار المصنفین) ج ۲ ص ۱۳۱ عون المعبود ج ۴ ص ۵۵۵ و ۵۵۶ [۲] یادگار گوہری ص ۱۰۰ ۔ تذکرہ علمائے حال ص ۔ نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۸۰ ۔ اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں ص ۲۱۰ ، الحیاۃ بعد المماۃ ، مقدمہ اتحاف النبیہ ، تجلیات ، حلیہ المحدث ، الفقیہ ص ۲۰ [۳] ہفت روزہ اہل حدیث امرتسر ۲۰ ، ۲۹ اپریل ۱۹۱۱ء [۴] عون المعبود ج ۴ ص ۵۵۲ و ۵۵۳ [۵] عون المعبود ج ۳ ص ۱۶۹

کے ۵۰ ابواب کے تحت ۱۸۰۴ حدیثوں کی شرح و توضیح کی گئی ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے، جو امام ابو داؤد کے حالات و کمالات اور سنن کے متعلق مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ اس کو سنن ابی داؤد کی مفید اور اہم شرحوں میں خیال کیا جاتا ہے، اور بعض حیثیتوں سے یہ سنن کی اکثر شرحوں سے بہتر ہے، مشہور حنفی عالم اور سنن ابو داؤد کے شارح مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے بھی اس کی اہمیت اور خوبیوں کا اعتراف کیا ہے[۱]۔ راقم اس شرح کے متعلق ایک مستقل مضمون ترتیب دے رہا ہے، انشاء اللہ اس میں اس کی اہمیت اور خصوصیات پر مفصل گفتگو کی جائے گی۔

۲۔ عون المعبود علی سنن ابی داؤد	یہ بھی سنن ابی داؤد کی شرح اور در اصل غایۃ المقصود کا خلاصہ ہے، جو چار ضخیم جلدوں میں مطبع انصاری دہلی سے تقطیع کے تقریباً ۱۹۰۰

صفحات پر (۱۳۱۸ھ تا ۱۳۲۲ھ) میں شائع ہوئی ہے، عام طور پر ان چاروں جلدوں کو مولانا شمس الحق عظیم آبادی کی تصنیف خیال کیا جاتا ہے۔ جلد ثالث کے خاتمہ اور جلد رابع کے آغاز و اختتام میں اس کی تصریح بھی موجود ہے۔ لیکن پہلی جلد کے خطبہ و خاتمہ اور دوسری جلد کے خاتمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مولانا شرف الحق محمد اشرف ڈیانوی (م ۱۳۲۶ھ) کی تصنیف ہے، جو مولانا کے چھوٹے بھائی تھے، غالباً اسی بنا پر صاحب بذل المجہود[۲]، صاحب معجم المطبوعات العربیہ[۳] اور بعض دوسرے حضرات کو التباس ہو گیا ہے اور انھوں نے عون المعبود کو مولانا اشرف کی تصنیف قرار دیا ہے، اس لئے اس مسئلہ کی مختصر تنقیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عون المعبود اصلاً مولانا عظیم آبادی ہی کی شرح ہے، لیکن وہ

---

[۱] بذل المجہود ج ۱ ص ۱ [۲] ایضاً [۳] معجم المطبوعات العربیہ ص ۳۱۰

جلدیں جلد کے مرتب و مولف نہیں تھے، بلکہ ابتدائی دونوں جلدوں کو ان کے چھوٹے بھائی، مولانا اشرف صاحب نے مرتب کیا تھا، اس کی دو وجہیں ہیں ۔

۱۔ پہلے گزر چکا ہے کہ مولانا اشرف نے ان جلدوں کے اندر خود اس کی تصریح کی ہے، اس تصریح کے بعد ان کے بیان کے معتبر نہ ہونے کے کوئی معنی نہیں ۔

۲۔ مولانا شمس الحق صاحب کو سنن ابی داؤد کی مفصل شرح لکھتے وقت اس کی ایک مختصر شرح لکھنے کا بھی خیال ہوا، چونکہ وہ دو جلدوں کے بقدر مفصل شرح لکھ چکے تھے، اسلئے تلخیص کا کام جو آسان تھا، اپنے چھوٹے بھائی کے ذمہ کر دیا، اور انھوں نے تن تنہا مولانا کے مشورے اور امداد سے یہ کام انجام دیا، اس لئے ان جلدوں کے مرتب و مولف وہی تھے۔ البتہ اس کے بعد کی مختصر شرح کی ترتیب و تالیف کا کام خود مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے بعض حضرات کے اشتراک سے انجام دیا، کیونکہ اس حصہ کی مفصل شرح نہیں لکھی جا سکی تھی اس لئے یہ کام مولانا اشرف صاحب انجام نہیں دے سکتے تھے، پس آخر کی دونوں جلدیں مولانا عظیم آبادی ہی کی ترتیب و تالیف کا نتیجہ ہیں ۔

ان وجہوں سے راقم کا خیال ہے کہ شروع کی دونوں جلدوں کے جو سولہ[16] پارے پر مشتمل اور غایۃ المقصود کا خلاصہ ہیں، مرتب مولانا اشرف صاحب تھے، اور آخر کی دونوں جلدیں جو غایۃ المقصود کا خلاصہ نہیں بلکہ مستقل مختصر شرح ہیں، مولانا شمس الحق صاحب کی تالیف کی ہوئی ہیں، رہی یہ بات کہ عون المعبود کے ناشر مولانا لطف حسین عظیم آبادی اور دوسرے تقریظ نگاروں نے چاروں جلدوں کو مولانا عظیم آبادی ہی کی جانب منسوب کیا ہے، تو غالباً یہ اس بنا پر کہ اصل شارح تو مولانا عظیم آبادی ہی تھے، اور عون المعبود کی ابتدائی دو جلدیں بھی درحقیقت ان ہی کی شرح کی تلخیص ہیں،

اس لیے گویا وہ بھی ان ہی کی کاوش کا نتیجہ ہوئیں۔

اس شرح میں بھی غایۃ المقصود کی اہم خصوصیات آگئی ہیں، دونوں میں محض اجمال و تفصیل کا فرق ہے، اہل فن کا خیال ہے کہ "اس میں سنن ابی داؤد کے اسناد و متون کی مشکلات کو حل کیا گیا ہے اور یہ بیشمار لطیف و دقیق مسائل و مباحث کا مجموعہ نادر تحقیقات اور علمی نکات پر مشتمل ہے، اور مختصر ہونے کے باوجود مفید مطلب ہے"[۵۲] علامہ محمد منیر دمشقی تحریر فرماتے ہیں۔

کل من جاء بعدہ من	مصنف کے بعد کے ہند و بیرون
شیوخ الهند وغیرہ	ہند کے علماء نے اس شرح سے استفادہ
استمد من شرحہ[۵۳]	کیا۔

اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ساتھ سنن ابی داؤد کا صحیح ترین متن بھی شامل کیا گیا ہے،

یہ شرح ہندوستان کے علاوہ لبنان اور سعودی عربیہ سے بھی شائع ہوئی ہے، سعودی عربیہ کا ایڈیشن نہایت عمدہ ہے، یہ متوسط سائز کی چودہ[۱۴] جلدوں میں علامہ عبدالرحمن محمد عثمان کی تعلیقات کے ساتھ مصری ٹائپ پر ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں چھپا ہے، اس میں متن پر اعراب بھی ہے، اور ہر ہر باب کی حدیثوں پر ہندسہ کا نمبر بھی دیا گیا ہے۔

۳۔ التعلیق المغنی علی سنن الدارقطنی،	مولانا عظیم آبادی کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلی دفعہ حدیث کی عظیم الشان کتاب سنن دارقطنی کا متن اپنی مفید

[۵۲] ملاحظہ ہوں تقریظات عون المعبود ج ۴ [۵۳] النموذج من الاعمال الخیریۃ ص ۶۲۰

تعلیقات کے ساتھ شائع کیا، متن کی ترتیب تین قلمی نسخوں کی مدد سے کی گئی ہے، ان کے حواشی و تعلیقات کی نوعیت کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہوتا ہے

اکتفی فیھا علی تنقید بعض احادیثہ و بیان علل و کشف بعض مطالبہ علی سبیل الایجاز والاختصار۔[1]	میں اس میں بعض حدیثوں پر تنقید کرکے ان کی علتیں بیان کروں گا اور مختصراً بعض کے مطالب بھی واضح کروں گا۔

اس کے مقدمہ میں امام دارقطنی اور ان کی سنن کے متعلق مفید معلومات تحریر کئے گئے ہیں یہ کتاب بڑی تقطیع کی دو جلدوں میں مطبع فاروقی دہلی سے پہلی بار ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوئی اس کا ایک اور اڈیشن ہادو عبیہ سے بھی شائع ہوا ہے۔ مگر وہ راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔

۴۔ رفع الالتباس عن بعض الناس ۴۳ صفحے کا یہ رسالہ ۱۳۱۱ھ میں بڑی تقطیع پر مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوا تھا بعض لوگوں نے غلطی سے اس کو مولانا محمد اسماعیل علی گڑھی[2] (م ۱۳۱۱ھ) اور بعض نے مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی[3] (م ۱۳۲۰ھ) کی تصنیف قرار دیا ہے۔

یہ رسالہ بعض الناس فی دفع الوسواس کے جو حنفیہ پر امام بخاری[4] کے اعتراضات کو غلط ثابت کرنے کے لیے لکھا گیا تھا، جواب میں ہے۔ لیکن اس میں جماعتی عصبیت سے کام نہیں لیا گیا ہے، اور امام اعظم کے فضل و کمال کا نہایت فراخ دلی سے اعتراف کیا گیا ہے، اس کے ۲ اڈیشن پہلے چھپ چکے ہیں اور عنقریب تیسرا اڈیشن مرکزی دارالعلوم

[1] التعلیق المغنی ج ۱ ص ۲ [2] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات ص ۳۴ و تراجم علمائے حدیث ہند ج ۱ ص ۲۰۰ [3] مقدمہ انوار الباری ج ۲ ص ۲۲۹ (طبع دوم)

بنارس سے شائع ہونے والا ہے،

۵۔ **اعلام اہل العصر باحکام رکعتی الفجر** | مطبع انصاری دہلی نے سنہ ۱۳۱۰ھ میں بڑی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات پر اس کو شائع کیا تھا، موضوع نام سے ظاہر ہے، اکثر اہل علم نے اعتراف کیا ہے کہ ابھی تک اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی رسالہ نہیں لکھا گیا ہے، معلوم ہوا ہے کہ ادارۂ علوم اثریہ لائلپور (پاکستان) نے تخریج وحواشی کے ساتھ بہترین ٹائپ میں اسکو دوبارہ شائع کیا ہے،

۶۔ **المکتوب اللطیف الی المحدث الشریف** | مولانا نے میاں صاحب محدث دہلوی کو مکہ معظمہ سے سنہ ۱۳۱۲ھ میں ایک طویل خط لکھکر بعض سوالات دریافت کئے تھے، اس رسالہ میں مولانا کے مکتوب گرامی کے ساتھ میاں صاحب کا جوابی خط بھی آگیا ہے جو ۶ رسالوں کے ایک مجموعہ کے ساتھ مطبع انصاری دہلی سے سنہ ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوا ہے۔

۷۔ **القول المحقق** | یہ چھ صفحے کا فارسی زبان میں ایک مختصر رسالہ ہے، اور اعلام اہل العصر کے ساتھ چھپ چکا ہے مولف نے اس میں مندرجہ ذیل سوال کا مفصل جواب تحریر کیا ہے کہ

جانوران ماکول اللحم را خصی کردن جہت تطییب لحم جائز است یا نہ؟	جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے کیا ان کے گوشت کو فربہ اور عمدہ بنانے کے خیال سے ان کو خصی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

یہ رسالہ اس موضوع کی احادیث و آثار، متقدمین ومتاخرین کے اقوال اور

مفید حدیثی معلومات کا مجموعہ ہے،

۸۔ عقود اللآلی فی جواز تعلیم الکتابۃ للنسوان: یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں لکھا گیا تھا لیکن راقم کے پیش نظر اس کا عربی ترجمہ ہے جو علامہ محمد بن عبدالعزیز بن مانع کی تعلیقات کے ساتھ ٹائپ پر ۱۹۶۱ء میں دمشق سے شائع ہوا ہے، مصنف نے اس میں حدیثوں کی روشنی میں عورتوں کے تحریر و کتابت سیکھنے کو جائز قرار دیا ہے،

۹۔ الاقوال الصحیحۃ فی احکام النسیکۃ: اس کی تاریخ تصنیف "عجیب غریب" ۱۲۹۴ھ سے نکلتی ہے، اس میں عقیقہ کی سنیت اور ولادت کے وقت اذان دینے کے علاوہ اس امر پر بھی بحث کی گئی ہے کہ بچہ کا نام کس دن رکھنا افضل ہے، ۱۲۹۷ھ میں مطبع فاروقی دہلی نے اس کو شائع کیا تھا۔

۱۰۔ غنیۃ الالمعی: یہ مختصر عربی رسالہ "المعجم الصغیر للطبرانی" کے ساتھ مطبع انصاری دہلی سے شائع ہو چکا ہے، اس میں بعض حدیثی اور فقہی امور و مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔

۱۱۔ تعلیقات علی اسعاف المبطا برجال الموطا: رجال موطا پر علامہ سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی مشہور کتاب اسعاف المبطا پر یہ مولانا کی مختصر مفید تعلیق ہے، اس میں سیوطی کے بیان پر اضافے بھی کئے گئے ہیں اور کہیں کہیں ان کی غلطیوں پر تنبیہ بھی کی گئی ہے۔ مولانا عظیم آبادی نے سیوطی کے کمیاب رسالہ کو متعدد نسخوں کے مقابلہ و تصحیح کے بعد اپنی تعلیقات کے ساتھ ۱۳۲۰ھ میں مطبع انصاری دہلی سے شائع کیا تھا۔

۱۲۔ الکلام المبین فی الجہر بالتامین: یہ رسالہ محمد علی صاحب وکیل مرزاپوری کے رسالہ "القول المتین فی اخفاء التامین" کے جواب میں اردو میں لکھا گیا تھا، اور ۱۳۰۳ھ میں مطبع انصاری دہلی سے متوسط سائز کے ۴۴ صفحات پر شائع ہوا تھا۔

۱۳۔ التحقیقات العلی باثبات فرضیۃ الجمعۃ فی القری | یہ رسالہ بھی اردو میں ہے اور ۱۳۰۹ھ میں مطبع احمدی پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔

۱۴۔ ہدایۃ النجدین الی حکم المعانقۃ والمصافحۃ بعد العیدین | یہ رسالہ ایک استفتا کا جواب ہے جو مولانا کی وفات کے بعد شائع ہوا تھا مگر راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔

۱۵۔ رسالہ در رد تعزیہ | یہ اردو میں لکھا گیا تھا۔ اور چھپ بھی چکا ہے لیکن راقم کو دستیاب نہیں ہو سکا۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ مولانا کی متعدد کتابیں اور رسالے غیر مطبوعہ بھی ہیں اوپر غایۃ المقصود کی غیر مطبوعہ جلدوں کا ذکر کیا جا چکا ہے، مزید غیر مطبوعہ کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

۱۶ فضل الباری شرح ثلاثیات البخاری | شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی مبارکپوری لکھتے ہیں۔

افسوس ہے کہ علامہ اس شرح کو اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکے (سیرۃ البخاری ص ۲۴۲ حاشیہ)

۱۷۔ النجم الوہاج فی شرح مقدمہ مسلم بن الحجاج | جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ مقدمہ امام مسلم کی مبسوط شرح ہے۔

۱۸۔ ہدیۃ اللوذعی بنکات الترمذی | یہ ترمذی کے اسناد و متون کے متعلق معلومات پر مشتمل ہے، لیکن مصنف اسکو مکمل نہیں کر سکے تھے۔[۱]

۱۹۔ تعلیقات علی سنن النسائی | اس میں سنن نسائی کے بعض مشکلات کو حل کیا گیا ہے۔

۲۰۔ نخبۃ التواریخ | اس میں مولانا نے قدیم و جدید علما کے سوانح اور کارنامے فارسی

---

[۱] سیرۃ البخاری ص ۲۴۸

زبان میں لکھے تھے، نزہۃ الخواطر اور تذکرہ علمائے حال کے مصنفین نے اس سے استفادہ کیا ہے، الحیاۃ بعد المماۃ میں میاں صاحب کے جو حالات درج کئے گئے ہیں وہ اسی سے منقول ہیں۔

۲۱۔ تذکرۃ النبلاء فی تراجم العلماء | یہ بھی فارسی میں ہے[1]، اور متعدد کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں، غالباً مصنف نے یہ دونوں کتابیں مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی کو نزہۃ الخواطر کی جمع و تالیف کے سلسلہ میں دیدیا تھا[2] اسیں جا بجا ان کے حوالے ملتے ہیں خصوصاً آخری جلدوں میں۔

۲۲۔ نہایۃ الرسوخ فی معجم الشیوخ | یہ کتاب عربی میں تھی، اس میں اپنے اساتذہ اور سلسلۂ اسناد کے شیوخ کے حالات تحریر کئے ہیں۔

۲۳۔ تفریح المتذکرین بذکر کتب المتاخرین | یہ اہم کتاب فارسی میں تھی[3] مولوی ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے غلطی سے اس کو عربی میں بتایا ہے[4]۔ غالباً مولانا عبد الحی حسنی کی کتاب الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کا ایک ماخذ یہ کتاب بھی تھی۔

۲۴۔ النور اللامع فی اخبار صلوٰۃ الجمعۃ عن النبی الشافع | موضوع نام سے ظاہر ہے، اسکی زبان عربی تھی۔

۲۵۔ تحفۃ المتہجدین الابرار فی اخبار صلوٰۃ الوتر وقیام رمضان النبی المختار۔ | اس میں وتر اور قیام رمضان کے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں، اسکی زبان بھی عربی تھی۔

۲۶۔ تنقیح المسائل | یہ فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔

۲۷۔ فتویٰ فوٹوگرافی۔
۲۸۔ مسائل سنین۔
۲۹۔ فیض ابتدائی۔

} مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے ان رسالوں کی زبان فارسی بتائی ہے[5]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۸۰ و ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات ص ۹۱، [2] یادگار گوہری ص ...
[3] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات ص ۵۸ [4] ایضاً ص ۹۰

ہندوستان کے ایک قدیم صاحب دیوان صوفی شاعر

جناب الطاف حسین خاں صاحب شروانی۔ اسلامیہ کالج اٹاوہ

ہندوستان کے صوفیائے کرام میں حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی سلسلۂ چشتیہ کے بڑے نامور بزرگ ہیں، یہ حضرت شیخ بابا فرید الدین گنج شکرؒ (۱۱۷۵ء تا ۱۲۶۵ء) کے بڑے محبوب اور عزیز خلیفہ تھے، کہا جاتا ہے کہ فارسی زبان میں یہ ہندوستان کے پہلے صاحب دیوان صوفی شاعر ہیں شیخ جمال الدین ہانسویؒ ابتداء میں خطیب کے عہدے پر مامور تھے،[1] بعد میں حضرت بابا فریدؒ کے مرید ہو گئے اور دنیا کی تمام آلائشوں سے دستکش ہو گئے، اُن کا سلسلۂ طریقت حسب ذیل ہے۔

---

[1] مراۃ الکاملین (مخطوطہ ذاتی ملکیت) مصنفہ عبداللہ خواجہ عنایت اللہ کاکوری میں لکھا ہے، کہ وہ ابتداء میں فتویٰ دیا کرتے تھے، بعد میں حضرت بابا صاحب کے مرید ہو گئے، ص ۹۲ لیکن پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے ہانسی کا خطیب لکھا ہے، دیکھئے:

The life and Timeo of Shaikh Eridudin gang Shaker

گلزار ابرار میں محمد غوثی لکھتے ہیں، کہ وہ حنفی الاصل ہیں، ص ۷۵۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر

محذوم علاء الدین صابر کلیری	شیخ نظام الدین اولیاءؒ	شیخ جمال الدین ہانسویؒ
سلسلۂ صابریہ	سلسلۂ نظامیہ	سلسلۂ جمالیہ
مولانا برہان الدینؒ	شیخ قطب الدین منور — شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ	
(شیخ جمال الدین کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے کو خلافت نامہ ملا)	(نبیرہ شیخ جمال الدین ہانسویؒ)	

شیخ جمال الدینؒ حضرت بابا فریدؒ کے سب سے پُرانے مرید ہیں[۱]اسی لئے حضرت بابا فریدؒ اُن سے خاص انسیت رکھتے تھے، جس کا اظہار بھی اکثر ہوتا رہتا تھا، ایک مرتبہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے حضرت بابا فریدؒ کو تحریر فرمایا، کہ آپ میرے تمام مریدوں اور خلفاء کو لے لیجئے اور اس کے بدلہ میں مجھے شیخ جمال الدین ہانسوی کو دیدیجئے، حضرت بابا فریدؒ نے جواب میں لکھا کہ جمال میرا جمال ہے، معاوضہ مال میں ہو سکتا ہے، نہ کہ جمال میں[۲]حضرت بابا فریدؒ کے تذکرہ میں مولانا جمالی لکھتے ہیں:۔

نقل است از حضرت سلطان	حضرت سلطان الاولیا نظام الدین
الاولیاء المشائخ نظام الملۃ والدین	رحمۃ اللہ سے منقول ہے کہ میں جب زمانہ

---

[۱] حضرت بابا فریدؒ کے حسب ذیل خلیفہ تھے،

(۱) شیخ نجیب الدین متوکلؒ (۲) مولانا بدر الدین اسحاقؒ (۳) شیخ جمال الدین ہانسویؒ (۴) شیخ نظام الدین اولیاءؒ (۵) شیخ عارف (۶) شیخ علی صابرؒ (۷) مولانا فخر الدین صفاہانی، رحمۃ اللہ علیہ،

[۲] گلزار ابراہیم (ترجمہ) ص ۵۴، [۳] سیر العارفین، ص ۴۹،

قدس سرہ در ایامیکہ من بحضرت
ایشاں در قصبہ اجودھن بودم
اندام مبارک ایشاں را نکسری
صعب واقع شدہ چنانچہ مرا و
مولانا جمال الدین ہانسوی را و
مولانا بدر الدین اسحاق را و درویش
علی بہاری را اشارت فرمود کہ
بروید از براے صحت من در فلاں
گورستان مشغول باشید، بحکم اشارت
حضرت ایشاں بگورستانیکہ فرمود
بودند رفتیم، و شب آنجا مشغول
شدیم"[1]

میں قصبہ اجودھن میں حضرت شیخ
فرید صاحب کی خدمت میں حاضر
تھا، اسی زمانہ میں حضرت کو سخت
بیماری لاحق تھی، انھوں نے مجھے
اور مولانا جمال الدین ہانسوی، اور
مولانا بدر الدین اسحٰق، اور درویش
علی بہاری کو حکم دیا کہ فلاں قبرستان
میں جاکر تم لوگ میری صحت کے
لئے دعا کرو، اُن کے ارشاد کے مطابق
ہم سب لوگ اس قبرستان میں جس میں
جانے کا آپ نے حکم دیا تھا، جاکر
رات بھر دعا میں مشغول رہے،

وہ حضرت بابا صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے، اپنے وطن ہانسی سے سات بار اجودھن تشریف لائے، اور حضرت بابا فرید بارہ سال ان ہی کی خاطر ہانسی میں مقیم رہے[2]، ایک موقع کے اجتماع کا تذکرہ مولانا جمالی کرتے ہیں،

نقل است (از حضرت نظام الدین
اولیا) کہ حضرت وقت نیم روزے
از خانہ بیروں آمد ما و مولانا بدر الدین

حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے
سے منقول ہے کہ ایک روز حضرت شیخ
فرید الدینؒ دوپہر کے وقت گھر سے باہر نکلے

---

[1] سیر العارفین ص ۴۹ - [2] گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۴۵،

اسحاق و مولانا جمال الدین ہانسوی حاضر بودیم، حضرت شیخ درسایہ دیوار استادہ[۵۱]"	میں اور مولانا بدر الدین اسحاق اور مولانا جمال الدین ہانسوی حاضر تھے اور حضرت شیخ دیوار کے سایہ میں کھڑے تھے،

اسی تعلق اور صحبت کا اثر تھا کہ شیخ جمال الدین ہانسوی صدق و صفا میں کمال کو پہنچ گئے تھے، محمد غوثی لکھتے ہیں۔

"چونکہ طریقت اور حقیقت کا جمال اور جمال کی چمک دمک آپ کے حالات سے عیاں تھی، لہذا پیر کی قلبی اور نظری توجہ کے اثر سے آپ کا صدق و صفا حد کمال کو پہنچ گیا تھا[۵۲]"

انہی حالات کے تحت بابا فرید کو حکم تھا کہ ان کے ہر خلافت نامہ کی تصدیق شیخ جمال الدین کریں[۵۳]۔ اگر شیخ جمال الدین کسی کے اجازت نامہ کو چاک کر دیتے، تو حضرت بابا فریدؒ فرماتے، کہ جمال کے چاک کئے ہوئے کو فرید نہیں سی سکتا[۵۴]"

ان باتوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ شیخ جمال الدین کا مرتبہ حضرت بابا فریدؒ کی نظر میں کتنا بلند تھا، اُن کی بزرگی کے بہت سے اشارے حضرت بابا فرید سے ملتے ہیں، مثلاً مولانا جمالی لکھتے ہیں کہ بحکم شیخ ایک بچہ اینٹ اٹھا کر لایا تاکہ اس پر بیٹھ سکیں، مولانا نظام الدین اور مولانا جمال الدین ہانسوی، اور مولانا بدر الدین کے لئے پوری اینٹ لانے کا حکم تھا جب کہ وہ بچہ ایک تیسرے صاحب کے لئے جن کا نام

---

۵۱ سیر العارفین ص ۵۷۔ ۵۲ گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۵۲،

۵۳ سیر الاولیا ص ۱۷۹، ۱۸۰، ۵۴ ایضاً ص ۱۷۹،

سخت تھا، آدھی سے بھی چھوٹی اینٹ لایا۔[۵۱]

"سیر الاولیاء" کے مؤلف لکھتے ہیں، کہ بابا فریدؒ نے شیخ جمال الدین ہانسوی کو عوارف المعارف کا ایک نسخہ بھی عطا کیا تھا، جو بعد میں شیخ نظام الدین اولیاء کے پاس آیا، اور پھر شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے یہ نسخہ شیخ قطب الدین منور کو دے دیا۔[۵۲]

جب شیخ نظام الدین اولیاءؒ بیعت ہوئے تو ان ایام میں حضرت بابا فریدؒ کے یہاں اکثر فاقہ رہتا تھا، حضرت بابا فریدؒ کی خدمت جن حضرات کے سپرد تھی، ان میں شیخ جمال الدین ہانسوی پیش پیش تھے، شیخ جمالی شیخ نظام الدین اولیاء کی زبانی بیان فرماتے ہیں:-

"خدمت شیخ المشائخ جمال الدین	حضرت شیخ المشائخ بابا فرید گنج
ہانسوی از جنگل دیلہ کہ بری از درخت	کی خدمت میں شیخ جمال الدین جنگل سے
کریز حاصل می شود و اکثر مردم آنرا	دیلہ لایا کرتے تھے، یہ ایک قسم کا پھل ہے جو کریل
در سرکہ می اندازند، و اچاری سازند	کے درخت سے حاصل ہوتا ہے، اور اکثر لوگ اسکو
آوردی و مولانا حسام الدین کابلی	سرکہ میں ڈالکر اچار بناتے ہیں، اور مولانا حسام
آب می آوردی و دیگہائے مطبخ شستے	الدین کابلی پانی بھر کر لاتے تھے، اور
و من آن دیلہائے جنگل می پختی در کاہ	باورچی خانہ کے دیگ اور برتن دھویا
و کچکول انداختہ از جہت افطار	کرتے تھے، اور میں ان جنگلی دیلوں کو پکاتا
حضرت شیخ الاسلام	تھا، اور اُن کو پیالوں میں رکھکر حضرت شیخ
و حضار مجلس می بردی و پیش ایشان	الاسلام اور حاضرین مجلس کے افطار کیلئے
بنہادی و آن طعام مذکور را کاہے	لیجاتا تھا، اور اُن کے سامنے پیش کرتا تھا،

[۵۱] سیر العارفین، ص ۵۸ - [۵۲] سیر الاولیاء، ص ۲۴۹، ۲۵۰،

نمک میسّر شد سے دگا ہے | اور اس کھانے کے لئے کبھی نمک میسّر ہوتا
نبود سے[۵۱] | تھا، اور کبھی نہیں ہوتا تھا،

شیخ نظام الدین اولیاؒ، فرماتے ہیں کہ حضرت بابا فریدؒ نے اپنے دست خاص سے مجھے اجازت نامہ اور خلعت عطا کی، اور ارشاد فرمایا، کہ ہانسی میں مولانا جمال الدین کو اور دہلی میں قاضی منتجب کو دکھا دینا، جب حضرت بابا فریدؒ کے فرمان کے مطابق میں ہانسی پہونچا، اور جمال الدین کو اجازت نامہ دکھایا، تو وہ بہت خوش ہوئے، اور یہ بیت پڑھی ؎

خدائے جہاں را فراواں سپاس | کہ گوہر سپردہ بہ گوہر شناس

اور چند روز مہمان رکھ کر رخصت کیا،[۵۲]

ایک مرتبہ شیخ نظام الدین اولیاء اجودھن جاتے ہوئے ہانسی میں شیخ جمال الدین کے یہاں مقیم ہوئے، شیخ جمال الدین نے اپنی عسرت اور غربت کی اطلاع حضرت بابا فرید کو شیخ نظام الدین اولیاء کی معرفت بھیجی، حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا،

" او را بگو چوں ولایت بکس دادہ | اُن سے کہو جب ولایت کسی شخص
شود او را واجب است استعمالِ "[۵۳] | کو عطا کی جاتی ہے تو اس کے لئے
| اس کا استعمال واجب ہو جاتا ہے،

حضرت بابا فریدؒ شیخ جمال الدین کے متعلق فکر مند رہتے تھے، اور ان کی حالت معلوم کرتے رہتے تھے، حضرت بابا فریدؒ کو ایک مرتبہ اطلاع ملی کہ شیخ جمال الدین نے اپنی تمام جائداد

---

۵۱ سیر العارفین، ص ۶۲ - ۶۱ - ۵۲ درر نظامی، ص ۱۲۷،

۵۳ سیر الاولیاء، ص ۱۸۰،

چھوڑ دی ہے، اور عہدہ سے دستبردار ہوگئے، اور ضعف و فاقہ میں مبتلا ہیں، تو اُن کے صبر و ضبط سے بہت خوش ہوئے، اور فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ جمال خوش ہے[51]

ایک موقع پر شیخ نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ ایک دفعہ شیخ جمال الدین اور خواجہ شمس الدین دبیر اور دوسرے دوستوں کے ساتھ حضرت پیر مرشدؒ کی خدمت سے رخصت ہونے کا موقع ملا، تو شیخ جمال الدین نے حضرت شیخ سے وصیت کی درخواست کی، حضرت شیخ نے میری طرف اشارہ کرکے فرمایا، کہ اس کو خوش رکھنا، چنانچہ شیخ جمال الدین اس وصیت کی وجہ سے مجھ پر بہت مہربان رہے، سفر میں چونکہ خواجہ شمس الدین دبیر معدنِ لطافت اور کانِ ظرافت ساتھ تھے، اس لئے ہم بہت خوش رہے، ہم لوگ موضع اگروہ کے قریب پہونچے، یہاں کا حاکم شیخ جمال الدین کا شناسا تھا، اس لئے اُس نے ہم سب کو اپنا مہمان بنا کر رکھا، شیخ جمال الدین نے جب اجازت چاہی تو اُس نے کہا کہ اس وقت اجازت دوں گا جب آپ کی دعا سے یہاں بارش ہوگی، کیونکہ یہاں بارش نہ ہونے سے قحط کا سا حال ہے، شیخ جمال الدین نے زبان سے کچھ نہ کہا، مگر دل سے توجہ فرمائی چنانچہ رات کو اس قدر بارش ہوئی کہ تمام علاقہ سیراب ہوگیا، اس سفر میں جب ہم ایک دوراہے پر پہونچے جہاں سے ایک راستہ سامانہ کو جاتا تھا، تو شیخ جمال الدین ہم لوگوں سے رخصت ہوئے، اور یہ شعر پڑھا،

یارِ قدیم راستی می بردی داد تو مقیم راستی می بردی[52]

فوائد الفواد میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس موقع پر ہم سب پر ایک خاص اثر با راحت ہوا[53] ملفوظات میں درج ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ ایک دفعہ صبح کے وقت

---

[51] سیر الاولیاء، ص ۱۸۰ و ۱۸۱، [52] درر نظامی۔ ص ۱۵۳ - ۱۵۴،

[53] فوائد الفواد (ترجمہ) ص ۲۷۰،

ہانسی میں شیخ جمال الدین کا مہمان تھا، سردی کے ایّام تھے، شیخ جمال الدین نے مجھ سے فرمایا،

بار وغنِ گاؤ اندریں روزے خنک نیکو باشد ہبریسہ و نان تنک

میں نے کہا ذکر الغائب غیبۃٌ (غائب کا ذکر غیبت ہے) شیخ جمال الدین نے فرمایا

غائب نہیں میں نے اُس کو حاضر کرلیا ہے، پھر دسترخوان بچھایا گیا[۵۱]

وفات | شیخ نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ حضرت پیر مرشد کی زیارت کی غرض سے اجودھن جاتے ہوئے ہانسی پہونچا، تو شیخ جمال الدین بیمار تھے، اور میری موجودگی ہی میں شیخ جمال الدین کی وفات ہوئی، مراۃ الکاملین کا مصنّف لکھتا ہے، کہ ۱۲ شعبان کو وفات ہوئی، اور ہانسی میں دفن ہوئے[۵۲]

اولاد | مولانا جمال الدین ہانسویؒ کی وفات کے وقت اُن کی اولاد میں مولانا برہان الدین بہت چھوٹے تھے، حضرت بابا فرید نے اُن کو خلافت عطا فرمائی، اور فرمایا، تم کو وہ تمام اختیارات دئے جاتے ہیں، جو تمہارے باپ کے تھے[۵۳] محمد غوثی مولانا برہان الدین کے متعلق فرماتے ہیں:-

"آپ صاحبِ حال وقال تھے، اور علم وحجت وبرہان بھی جانتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب پدر بزرگوار کے ناسوتی جہان سے کوچ فرمانے کا وقت آیا تو اُن کی کنیز جو اپنے وقت کی عارفہ اور عابدہ تھیں اور جنکو حضرت گنج شکرؒ مادر مومنان فرمایا کرتے تھے، جو خرقہ اور عصا پدر بزرگوار کو حضرت گنج شکرؒ نے عطا فرمایا تھا، سامنے لے آئیں، ارشاد ہوا برہان الدین کو دیدیا، جواب میں عرض کیا ابھی خورد سال ہے، ارشاد ہوا کچھ مضائقہ نہیں، ماہِ نو ہے، جلد بدر ہو جائے گا، اور فرمایا کہ

---

۵۱ دررِ نظامی ص ۱۹۲، ۵۲ مراۃ الکاملین (مخطوطہ) ص ۱۹۲

۵۳ گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۱۸۳، ۱۸۲،

جب اس کا زمانہ ہوش آجائے تو اس کو چاہئے کہ سلطان الاولیا کی خدمت کرے تاکہ ان کی خدمت سے دو جہاں کے کمالات حاصل ہوں[۵۱]"

حضرت سلطان الاولیا کی زندگی میں شیخ برہان الدین نے کبھی کسی کو مرید نہیں کیا، فرماتے تھے کہ شیخ نظام الدین کے ہوتے ہوئے مجھے زیب نہیں دیتا، اُن کو شیخ نظام الدین اولیا سے بڑی عقیدت تھی، شیخ جمال الدینؒ کے دوسرے بڑے صاحبزادے مجذوب تھے لیکن کبھی کبھی یہ بڑی عقلمندی کی گفتگو کرتے تھے،

شیخ برہان الدینؒ کے صاحبزادے شیخ قطب الدین منور اپنے وقت کے بڑے مشہور بزرگ گذرے ہیں، یہ شیخ نظام الدین اولیاء کے مشہور خلیفہ ہیں، شیخ منور، محمد بن تغلق کے عہد کے مشہور بزرگ ہیں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی اور شیخ شمس الدین یحیٰی بھی اس عہد میں تھے، ان بزرگوں نے سلسلۂ چشتیہ کی بڑی خدمت کی ہے، مورخ شمس سراج عفیف شیخ منور کا مرید تھا[۵۲]،

گلزار ابرار کا مؤلف لکھتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق نے قاضی کمال الدین صدر جہاں کی معرفت چند دیہ کا فرمان شیخ منورؒ کے نام کرکے آپ کے پاس بھیجا، آپ نے لانے والے سے فرمایا: میں نے سُنا ہے کہ سلطان نصیر الدین جن ایام میں اوچہ اور ملتان گیا ہوا تھا، تو اُس نے بھی اسی طرح کا فرمان امیر غیاث الدین سپہ سالار کے ہاتھوں حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں، جو دھن بھیجا تھا، لیکن انھوں نے یہ کہکر واپس کر دیا تھا، کہ ہمارے بزرگوں نے بادشاہوں سے کچھ قبول نہیں کیا، شیخ منور کے اس فرمانے پر فرمان لانے والا واپس چلا گیا[۵۳]،

سلطان فیروز شاہ تغلق سے ہانسی میں شیخ منور کی ملاقات کا واقعہ شمس سراج عفیف نے

---

۵۱ گلزار ابرار ترجمہ ص (۱۰۸) ۵۲ سیر الاولیا، ص ۲۰۴، دُرر نظامی ص ۳۵، ۳۶

۵۳ برہان، جولائی ۱۹۶۸ء ص ۷، ۵۴ گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۹۲،

اس طرح لکھا ہے :-

روز جمعہ بود حضرت فیروز شاہ پیش
از نماز جمعہ برائے ملاقات خدمت شیخ
الاسلام شیخ قطب الدین قدس اللہ
سرہٗ العزیز قصد نمودہ درون حصار
درآمدہ در آن وقت خدمت شیخ
برائے نماز جمعہ از خانقاہ بیرون آمدہ
بودند، و پیش در خویش ایستادہ شدہ
بودند، کہ سلطان فیروز رسید، و دراں
وقت خدمت شیخ جبہ خدمت شیخ جمال الدین ہانسوی
پوشیدہ بودند، بر قانون معتاد جد
بزرگوار خود، و این جبہ کہنہ سالہا بود،
المقصود حضرت فیروز شاہ برائے
ملاقات خدمت شیخ منور رفت
و خان اعظم تاتار خان طالب رضائے
رضائے حال برابر بود، ہر دو بزرگوار
بعارف حضرت پروردگار مصافحہ
کردند[1]"

جمعہ کے روز فیروز شاہ نے شیخ
الاسلام قطب الدین قدس سرہ سے
ملاقات کرنے کا ارادہ کیا، اور حصار
میں داخل ہوا، اس وقت حضرت شیخ
نماز جمعہ کے لئے خانقاہ سے باہر تشریف
لائے تھے، اور اپنی خانقاہ کے دروازے
پر کھڑے تھے کہ فیروز شاہ پہنچ گیا،
حضرت شیخ اس وقت اپنے جد امجد
شیخ جمال الدین ہانسوی کا جبہ مبارک
زیب تن فرمائے ہوئے تھے، انہی کی
شان ولایت میں جلوہ نما تھے، یہ جبہ
نہایت پرانا ہو گیا تھا، مختصر یہ کہ
فیروز شاہ حضرت قطب الدین کی
ملاقات کو حاضر ہوا، خان اعظم تاتار
خان بھی ان کے ہم رکاب تھا، دونوں
نے حضرت شیخ سے مصافحہ کیا،

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۸، ۷، ۹، نیز دیکھئے ص ۸۱، ۸۲، ۸۵،

شیخ منور کی قبر ہانسی کے میدان میں ایک گنبد کے نیچے ہے جس کو اب اقطابِ اربعہ کہتے ہیں، وہیں شیخ جمال الدینؒ شیخ برہان الدین اور شیخ نورؒ بھی آرام فرما ہیں[۵]

شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے چند کلمات محمد غوثی نے شیخ جمال الدینؒ، شیخ برہان الدینؒ کے سراپا نصیحت کلمات گلزارِ ابرار میں درج کئے ہیں،

"گفتار بے کردار زیب نہیں دیتی، جس کی سی رفتار تم نہ چل سکو اس کی گفتار چھوڑ دو کیونکہ ایسی گفتار بالکل غیر موثر ہوتی ہے[۶]"

تصانیف۔ شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی صرف دو تصانیف دستیاب ہوتی ہیں،

۱۔ فارسی دیوان۔ یہ دو جلدوں میں ہے، پہلی جلد میں تصوف سے متعلق مختلف موضوعات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے، زندگی کے مختلف ادوار پر گفتگو کی ہے اور سلطان شمس الدین التمش کا مرثیہ لکھا ہے،

دوسری جلد میں قطعات اور رباعیات وغیرہ ملتی ہیں، یہ دونوں دیوان چشمۂ فیض دہلی میں پیرجی رفیع الدین تحصیلدار دہلوی کی معرفت ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئے تھے، مگر اب نایاب ہیں، ان مطبوعہ نسخوں کا سراغ صرف دو جگہ ملا ہے، ایک پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ذاتی کتب خانہ میں، اور دوسرے ندوۃ العلما، لکھنؤ کے کتب خانہ میں جہاں غلطی سے دیوان قطب جمال کے نام سے درج تھا، لیکن اب میری نشاندہی پر اسے درست کر دیا گیا ہے،

۲۔ دوسری تصنیف عربی میں ملہمات کے نام سے ہے، جس میں تصوف کے نکات بڑے عمدہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں، ملہمات بھی ۱۳۰۶ھ میں یوسفی پریس الور سے شائع ہو چکی ہے،

نمونۂ کلام دیوان اول کے چند شعر ملاحظہ ہوں،

---

[۵] گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۹۰۔ [۶] ایضاً ص ۵۴،

همه خواریست اندر عشق بازی | چرا جوئی تو عزت خواری باش
اگر بروانے نیش مار دارے | سپر و پائے اندر غاری باش
بیک سوئے افگن از رہ خار نخفت | پس اندر مسکن گلزاری باش
وصال یار نبود خفتگان را | برائے وصل او بیداری باش
جمالا گر بہ بینی یا نہ بینی | ہمیشہ طالب دیداری باش[۱]

می نیابم وصل روح افزائے تو | زرد و لاغر از غم آں گشتہ ام
تا مگر از حال درباں بر رسی | چوں جمال خستہ درباں گشتہ ام[۲]

دانم کہ وصال چو تو سلطاں | شایستہ ہر گدا نباشد
لیکن چو امید من بوصلت | در نو امیدے رضا نباشد
مقصود جمال خستہ آنست | کز حضرت تو جدا نباشد[۳]

پیری کے بیان میں فرماتے ہیں:-

جوانی رفت و پیری اندر آمد | بیاضی از سواد من بر آمد
مگر صبح ہویدا گشت از شب | مگر کافور اندر عنبر آمد[۴]

مرثیہ سلطان شمس الدین التتمش کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:-

دلا منازچو قارون بمال و نعمت وجاہ | مباش انچہ زان دم کہ جاہ کرد وجاہ

---

۵۱ دیوان جمال الدین ہانسوی جلد اول ص ۱۳۵، ۵۲ ایضاً ص ۲۳۰، ۵۳ ایضاً ص ۲۵۲
۵۴ ایضاً ص ۲۷۰،

اجل چو تیغ قضا برکشد ندارد پاک — زبادشاہ و وزیر و امیر و فیل و سپاہ

اسیر باز اجل گشت چو مرغ ضعیف — خدایگان سلاطین و مہر ظل اللہ

شہی ستارہ حشم چرخ قدر شمس الدین — سر ملوک جہاں طیب اللہ ثراہ

چو پائے بر سر تختش نہاد پیک اجل — ز ملک و ملک جہاں گشت دست او کوتاہ

بخت رفت ز بالائے تخت خسرو دہر — بچار چوب فنا پا نہاد از سر گاہ[51]

شیخ الاسلام حضرت فرید الحق والدین مسعود قدس سرہم کی مدح میں فرماتے ہیں :-

ختم المشائخ آمد و اتش دے گوئی — کاندر ثنا ، ز ذاتش توقیر میرود

گز صد یکے بگفتم از آفرین او — بس در میان بدحش تقصیر میرود

تیر است در بہاد و تو خوے بد جہاں — ا آچہ پیر محو کند تیر میرود[52]

دیوان جلد دوم کے قطعات ملاحظہ ہوں ،

گر ترا رحمتی رسد زنہار — صبر کن غم مخور ز حیرانی[53]

کہ چنیں آمدہ است در قرآں — بعد دشوار یست آسانی ،

ہر کہ را علم با عمل یار است — او نیز و خدا ز اخیار است

---

[51] دیوان جمال الدین ہانسوی جلد اول ص ۳۹۸ ، [52] ایضاً ص ۱۰۴

[53] ایضاً ” ” ” دوم ” ۱۵

عشق او درخت فردوس است　　　میوۂ آن درخت دیدار است[۱]

بے یاد تو این دلم مشوش باشد　　　لیکن چون ترا یاد کند خوش باشد

ماہیت کند یا دبا کے در آب　　　وآن جانورے کہ او در آتش باشد[۲]

ضرورت ہے کہ شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے ان کمیاب دیوانوں کو تصحیح کرکے پھر شائع کیا جائے، اپنی قدامت اور ندرت کے اعتبار سے یہ اس کے مستحق ہیں۔

---

[۱] دیوان جمال الدین ہانسوی جلد دوم ص ۵، [۲] ایضاً ص ۸،

[۳] ایضاً ص ۲۵،

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے، اس کی اسی دلآویزی اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازہ شہرت ہندوستان کی چار دیواری سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا ہے، مشرقیات کے جن غیر مسلم فضلائے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور اُن کی نگرانی میں دار المصنفین کے نقاد و محققین نے اُن کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دیے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل سالوں کے فائل تو بالکل مکمل موجود ہیں:- ۱۹۳۰، ۳۵، ۱۹۳۷، ۱۹۳۸، ۱۹۳۹، ۱۹۴۱، ۱۹۵۱، ۱۹۵۳، ۱۹۵۴، ۱۹۵۵ تا ۱۹۵۷، ۱۹۶۳، ان کو خرید کر اپنے کتبخانہ کی رونق بڑھائیں۔

"منیجر"

استغناء اور بے نیازی

از

مولوی حافظ محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی ایم اے (علیگ)

اصل بے نیاز تو اللہ کی ذات ہے، اِنَّ اللہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ (بلاشبہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے) انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ وہ اس ذاتِ مستغنی کے سوا پوری دنیا سے بے نیاز ہو جائے، اور یہ سمجھ لے کہ جو کچھ ملے گا، اسی سے ملے گا، غیر کے آگے ہاتھ پھیلانا بے کار ہے، خدا کی کارسازی کا یقین دلوں کو طمانیت و قناعت کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے، قانع شخص کسی کے زر و جواہر پر نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالتا، بلکہ ہمیشہ پروردگارِ عالم کی شانِ ربوبیت پر نظر رکھتا ہے، مال و دولت سے حرص کا خاتمہ نہیں ہوتا، بلکہ قناعت ہی باعثِ سکون و اطمینان ہے حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے بڑی حقیقت افروز بات کہی ہے

لیس الغنی عن کثرۃ العروض	دولت مندی مال و اسباب کی
لکن الغنی غنی النفس،	کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل
	تونگری دل کی تونگری ہے،

شیخ سعدی نے "تونگری بدل ست نہ بمال" کہکر حدیثِ نبوی کے اسی مفہوم کو پیش کیا ہے، ایک اور حدیث میں حضورؐ نے اس نکتہ کو اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا ہے، حضرت ابو ذرؓ راوی ہیں کہ ایک بار مجھ سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ابوذر! تمھارے خیال میں مال کی کثرت کا نام تونگری ہے؟" میں نے عرض کیا جی ہاں" فرمایا "تو تمھارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا "استغنا دل کی بے نیازی ہے، اور محتاجی دل کی محتاجی!"[۵۱]

حضرت سہل بن سعد کہتے ہیں، کہ جبرئیل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ مؤمن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے[۵۲]

تاریخ اسلام میں خدا کے سوا ساری دنیا سے بے نیازی کے بصیرت افروز واقعات بکثرت ملتے ہیں، سیکڑوں علماء حق ہیں جنھوں نے غیر معمولی علم وفضل اور اثر و نفوذ کے باوجود ساری زندگی فقر و فاقہ میں گذار دی، اور کبھی زر و جواہر کی چمک دمک کی طرف نظر نہیں ڈالی،

حضرت سلمہؓ بن دینار (المتوفی سنہ ۱۴۰ھ) کو ایک مرتبہ خلیفہ سلیمان بن عبد الملک نے امام زہری کی وساطت سے بلا بھیجا، انھوں نے کہا مجھے تو اُن سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر اُن کو ضرورت ہو تو میرے پاس خود آئیں،[۵۳]

صفوان بن سلیم زہری (المتوفی سنہ ۱۳۲ھ) کی بے نیازی کا یہ حال تھا کہ فرمانروا اُن کی مدد کرنا چاہتے تھے، مگر وہ قبول نہیں کرتے تھے، ایک بار سلیمان بن عبد الملک مدینہ منورہ آیا، اور حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کے ہمراہ مسجد نبوی ؐ کی زیارت کو گیا، نماز ظہر کے بعد مقصورہ کا دروازہ کھولا، تو اس میں صفوان نظر آئے، سلیمان پہچانتا نہ تھا، حضرت عمرؓ بن عبد العزیز سے پوچھا یہ کون بزرگ ہیں، عمرؓ بن عبد العزیز نے کہا "امیر المومنین یہ صفوان

---

۵۱ فتح الباری ج ۱۱ ص ۲۳۲، ۵۲ مستدرک حاکم ج ۴ ص ۳۲۵،

۵۳ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۴۴۴،

بن سلیم ہیں" اُن کا نام سُن کر اُس نے غلام کو پانچ سو دینار کی تھیلی اُن کی خدمت میں پیش کرنے کا حکم دیا، غلام نے لے جاکر پیش کی، اور کہا کہ یہ امیرالمومنین کی جانب سے نذر ہے، وہ یہاں موجود ہیں، صفوان نے کہا تم کو غلط فہمی ہوئی ہے کسی اور کے پاس بھیجی ہوگی، غلام نے عرض کیا آپ صفوان نہیں ہیں ،؟ فرمایا" ہوں تو میں ہی" غلام نے کہا تو آپ ہی کو حکم دیا ہے، فرمایا "جاؤ دوبارہ پوچھ آؤ" جیسے ہی غلام پوچھنے کے لئے لوٹا صفوان فوراً جوتا اٹھا کر مسجد سے نکل گئے، اور پھر جتنی دیر سلیمان مسجد میں رہا، دکھائی نہ دیئے[1]

مشہور اموی حکمراں ہشام بن عبدالملک حج کے سلسلہ میں مکہ معظمہ گیا ہوا تھا، ایک دن خانہ کعبہ میں حضرت سالم (عمر فاروقؓ کے پوتے) سے ملاقات ہوئی، خلیفہ نے کہا، حضرت مجھ کو خدمت کا موقع دیا جائے، حضرت سالم نے فرمایا" اللہ کے گھر میں اللہ کے سوا کسی سے مانگنا شرم کی بات ہے" جب دونوں حضرات کعبہ سے باہر نکلے تو خلیفہ نے پھر عرض کیا کہ اب تو کعبہ سے باہر ہیں، اب کچھ طلب فرمائیں، حضرت نے فرمایا میں آپ سے کیا مانگوں، دنیا یا دین، ؟ ہشام نے کہا کہ دنیا، ارشاد ہوا:-

"دنیا تو میں نے اس کے مالک حقیقی سے بھی کبھی طلب نہیں کی، پھر آپ سے کیسے مانگوں"[2]

حافظ مسعر بن کدام (المتوفی ۱۵۵ھ) آخرت کی بازپرس سے ہر وقت لرزاں اور ترساں رہتے تھے، اور اس کے نتیجے میں وہ دنیا اور اس کی شان و شوکت سے بالکل بے نیاز تھے، چنانچہ حکومت کے عہدوں کو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے، خلیفہ ابوجعفر منصور ان کا عزیز تھا، اس نے اُن کو کسی مقام کا حاکم بنانا چاہا، انھوں نے فرمایا کہ میرے

---

[1] صفوۃ الصفوہ ص ۱۴۸، [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۱۹۰

گھر والے تو مجھ کو دو درہم کا سودا لانے کے لائق بھی نہیں سمجھتے، اور تم مجھے والی بنانا چاہتے ہو"[1]

حافظ عبداللہ بن وہب (المتوفی ۱۹۷ھ) امام مالک کے ارشد تلامذہ میں تھے، حفظ حدیث، وسعت علم، اور کثرت تصانیف میں اُن کو بلند مرتبہ حاصل تھا، انھوں نے تاحیات دربارِ خلافت سے اپنا دامن بچائے رکھا، گو اس سلسلہ میں ان کو بعض مصائب بھی برداشت کرنے پڑے، امام ذہبی نے لکھا ہے کہ عباد بن محمد والی مصر نے ایک بار ان کو بلایا، اور اُن کے سامنے عہدۂ قضا پیش کیا، انھوں نے اس سے کسی طرح پیچھا چھڑایا، اور روپوش ہو گئے، عباد کو اُن کے غائب ہونے کی اطلاع ملی، تو اُس نے غصہ میں اُن کا گھر گروا دیا، مگر اس کے باوجود انھوں نے اس عہدہ کو قبول کرنا پسند نہیں کیا[2]

لیث بن سعد (المتوفی ۱۷۵ھ) اپنے اخلاق و اوصاف اور سیرت و کردار میں اسلامی زندگی کا مثالی نمونہ تھے، خلیفہ منصور نے اُن کے سامنے مصر کی امارت پیش کی، مگر انھوں نے انکار کر دیا، اور شدت اصرار کے باوجود اپنے فیصلہ پر جمے رہے[3]

علمائے حق کی دربار سے بے تعلقی یا کم از کم اُس کی کسی ذمہ داری کو قبول کرنے سے گریز کا سبب یہ تھا، کہ حکومت سے منسلک ہونے کے بعد کسی معاملہ میں اظہار حق کی گنجائش نہیں تھی، جن بزرگوں نے اعلیٰ مناصب کو قبول کر لیا، وہ بڑی آزمائش میں رہے، اور اس آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد دو چار ہی بزرگ ایسے تھے، جو اپنی حق گوئی اور جرأت سے سلامت بچ گئے، ورنہ زیادہ تر لوگوں کا دامن اس آزمائش میں داغدار ہو کر رہا،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۷، [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۷۹،

[3] تہذیب التہذیب ذکر لیث،

امام سفیان ثوری (المتوفی ۱۶۱ھ) کی ذات علم وعمل دونوں کی جامع تھی، اُن کے
م وفضل اور سیرت وکردار کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا تھا، وہ امرا اور خلفا سے ہمیشہ خود بے تعلق
ہے، اور اپنے تعلق کے لوگوں کو بھی اس سے روکتے رہے، ایک بار منصور نے مسجد حرام میں ملاقات
کی، اُس نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اور کعبہ کی طرف رُخ کرکے کہا کہ "قسم ہے اس عمارت
کعبہ) کی، مجھے آپ نے کیسا آدمی پایا، یہ وقت بڑا نازک تھا، مگر امام نے بڑی جرات سے
پنے دل کی بات کہہ دی، اور فرمایا "کعبہ کے رب کی قسم - میں نے تم سے بدتر آدمی
ہیں پایا"

قاضی حفص بن غیاث بغداد وکوفہ کے چیف جسٹس تھے، دنیا کی ہر طرح کی آسائش
ن کے قدموں میں ڈھیر تھیں، لیکن باں ہمہ اُن کے فرط استغنار کا یہ عالم تھا کہ سرکاری
زانہ سے اُن کو تین سو درہم ماہانہ مشاہرہ ملتا تھا، لیکن وہ اس میں سے اپنے جملہ مصارف
کے لئے صرف سو درہم رکھ کر بقیہ رقم مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے،

(اخبار القضاۃ ۳/۱۸۴)

حماد بن سلمہ دوسری صدی ہجری کے اواخر کے ایک جلیل القدر محدث ہیں، علمی
بحر اور فنی مہارت کے ساتھ فضائل اخلاق سے بھی متصف تھے، امرار واعیان سلطنت
کی صحبت سے گریز اور اہل دنیا سے استغنار ان کا وصف امتیازی تھا، اس سلسلہ میں
علامہ ابن جوزی نے اُن کی کتاب زندگی کا درج ذیل کا واقعہ بہت تفصیل کے ساتھ
نقل کیا ہے،

مقاتل بن سلیمان الخراسانی کا بیان ہے کہ میں حماد بن سلمہ کے پاس گیا، تو ان
کے گھر میں ایک چٹائی کے علاوہ کچھ نہ پایا، اسی پر بیٹھے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے،

ایک چمڑے کا توبڑہ تھا جس میں اُن کا سارا علم (یعنی روایات حدیث نبوی) بند تھا، ایک وضو کا برتن تھا، ان کا بیان ہے کہ ایک دن اُن کی موجودگی میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، انھوں نے اپنی لونڈی سے کہا کہ دیکھ بیٹی کون ہے؟ وہ واپس آکر بولی کہ محمد بن سلیمان کا قاصد (غالباً یہ بصرہ کا امیر تھا) فرمایا کہ جاؤ کہدو کہ وہ تنہا میرے پاس آئے، وہ قاصد آیا، اور اس نے ایک خط پیش کیا جس کا مضمون یہ تھا،

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد بن سلیمان کی طرف سے حماد بن سلمہ کے نام۔ اما بعد۔ خدا آپ کو اسی طرح سلامت رکھے، جس طرح اُس نے اپنے اولیاء اور اطاعت گذاروں کو سلامت رکھا ہے، ایک مسئلہ درپیش ہے اگر آپ تشریف لاتے، تو اس کے بارے میں آپ سے استفادہ کرتا، والسلام"

یہ خط ملا تو آپ نے پڑھ کر لونڈی سے کہا کہ قلم دوات لاؤ، اور اس کی پشت پر یہ جواب لکھدو :-

"اما بعد آپ کو بھی خدا اسی طرح سلامت رکھے جس طرح اپنے دوستوں اور فرمانبرداروں کو سلامتی عطا کرتا ہے، میں نے بہت سے ایسے علماء کی صحبت اختیار کی ہے جو کسی کے پاس جایا نہیں کرتے تھے، (اس لئے میں بھی معذور ہوں) اگر آپ کو کوئی مسئلہ سمجھنا ہو تو آپ خود تشریف لے آئیں، اور جو دریافت کرنا چاہیں دریافت کریں، اور ہاں اگر آنے کا ارادہ ہو تو تنہا تشریف لائیے گا، آپ کے ہمراہ خدم وحشم نہ ہوں، ورنہ میں آپ کے ساتھ اور اپنے ساتھ خیر خواہی نہ کرسکوں گا"

والسلام

قاصد یہ جواب لے کر واپس چلا گیا، راوی کا بیان ہے کہ ہم ابھی بیٹھے ہی ہوئے تھے

کہ کسی نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا، لونڈی کو حکم دیا کہ دیکھو کون ہے، اس نے آکر کہا کہ محمد بن سلیمان، فرمایا کہدو کہ آجائیں، مگر تنہا آئیں، چنانچہ وہ خدمت میں حاضر ہوا، اور سلام کرکے بیٹھ گیا، اور تھوڑی دیر بعد بولا کیا وجہ ہے کہ جب بھی میں آپ کے سامنے ہوتا ہوں، میرے اوپر خوف و دہشت طاری ہوجاتی ہے، حماد بن سلمہ نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب عالم اپنے علم دین کے ذریعہ خدا کی خوشنودی چاہتا ہے تو اس سے ہر چیز ڈرنے لگتی ہے، اور جب وہ اس سے دنیا کے خزانے چاہتا ہے تو وہ خود ہر چیز سے ڈرنے لگتا ہے،

محمد بن سلیمان نے پوری توجہ کے ساتھ یہ باتیں سنیں اور پھر کہا کہ یہ چالیس ہزار درہم حاضر خدمت ہیں، انھیں اپنی ضروریات میں صرف فرمائیں، حماد بن سلمہ نے کامل استغنا کے ساتھ فرمایا کہ ان کو لے جاؤ، اور جن لوگوں پر ظلم کرکے ان کو حاصل کیا ہے، اُن کو دے ڈالو وہ بولا، کہ بخدا میں یہ اپنے خاندانی ورثہ سے دے رہا ہوں، فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، مجھے معاف کرو، خدا تعالیٰ تمہیں معاف کرے، تم اس رقم کو تقسیم کردو، وہ بولا کہ میری تقسیم میں اگر کسی مستحق کو نہ ملا، تو وہ ناانصافی کی شکایت کرے گا لیکن آپ نے پھر بھی فرمایا کہ مجھے معاف ہی رکھو (صفوۃ الصفوہ ۳/۲۷۴)

امام عبداللہ بن ادریس (المتوفی ۱۹۲ھ) زندگی بھر جاہ و منصب سے کنارہ کش رہے، خلیفہ ہارون الرشید نے ایک بار اُن کے سامنے قضا کا عہدہ پیش کیا، اور اس کے قبول کرنے پر از حد اصرار کیا، لیکن ابن ادریس نے اپنی عدم صلاحیت کا حیلہ کرکے اس پیش کش کو مسترد کردیا، ان سے پہلے خلیفہ مذکور نے یہ منصب حافظ وکیع کے سپرد کرنا چاہا تھا مگر انھوں نے بھی ٹھکرا دیا تھا، اور بالآخر قاضی حفص نے اس کو قبول کرلیا، پھر ہارون نے

پانچ ہزار درہم بطور نذرانہ پیش خدمت کئے، تو اوّل الذکر دونوں ائمہ نے اس کو لینے سے انکار کر دیا، اور ابن غیاث نے لے لیا، اس واقعہ کے بعد ابن ادریس کو قاضی حفص کی جانب سے سخت تکدر پیدا ہو گیا تھا کیونکہ انھوں نے ائمہ سلف کی شان استغنار کو ٹھیس پہنچائی تھی، بروایت صحیح منقول ہے کہ ابن ادریس نے اس کے بعد قاضی حفص سے تاحیات بات نہ کرنے کی قسم کھالی تھی، اور اس پر قائم رہے، (تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۵۸)

انھی کے استغنار کا ایک دوسرا واقعہ یہ منقول ہے کہ ایک بار خلیفہ ہارون حج کی غرض سے مکۃ معظمہ جارہا تھا، مرراہ کوفہ سے اس کا گذر ہوا، اس کے ہمراہ اس کے دونوں لڑکے امین اور مامون کے علاوہ قاضی ابو یوسف بھی تھے، کوفہ پہنچکر اس نے حکم دیا کہ تمام مقامی شیوخ جمع ہوں تاکہ امین اور مامون ان سے حدیث کی سماعت کر سکیں، چنانچہ حسب الحکم تمام علمار خلیفہ کی فرودگاہ پر مجتمع ہو گئے لیکن عبداللہ ابن ادریس اسے وقار علمی کے منافی تصور کر کے نہیں آئے،

شیوخ کوفہ سے اکتساب فیض کے بعد امین و مامون امام عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے سو حدیثیں سنیں، اس کے بعد مامون نے اُن کی خدمت میں کچھ مال و زر پیش کیا لیکن شیخ نے اُس میں سے کچھ بھی قبول کرنا گوارا نہ کیا، پھر مامون نے اس رقم کو دوگنا کر کے پیش کیا، شیخ نے نہایت غصہ ہو کر فرمایا خدا کی قسم اگر تم اس مسجد کو فرش سے چھت تک بھر کر پیش کرو تو بھی میں حدیث رسول کی تعلیم پر ایک حبہ لینا گوارا نہیں کر سکتا، (البدایہ والنہایہ ۱۰/۲۰۸)

حافظ عفان بن مسلم (المتوفی ۲۲۰ھ) نے حق کے معاملہ میں نہ تو کبھی ارباب سطوت و حکومت کے سامنے سر خم کیا، اور نہ مال و متاع کی حرص اُن کے پایۂ استقامت کو متزلزل

کرکی، یہ روایت بھی منقول ہے کہ

"ایک بار ادمی کو دس ہزار دینار اس غرض سے دئے جا رہے تھے کہ فلاں شخص کے بارے میں سکوت اختیار کریں، نہ اُسے عدول کہیں، اور نہ غیر عدول، لیکن امام موصوف نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا، اور فرمایا

لا ابطل حقا من الحقوق میں کسی شخص کا حق ختم نہیں کرسکتا

شذرات الذهب ۳/۴۴)

اسی طرح حضرت فلاں سے مروی ہے کہ

"ایک شخص نے حافظ عفان کو دو ہزار دینار دے کر کہا کہ آپ فلاں آدمی کی عدالت کی تصدیق فرما دیجئے، لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور فرمایا، میں ایک غلط بات کو ہرگز صحیح نہیں کہہ سکتا۔"

(میزان الاعتدال ص ۲/۲۰۲)

حافظ ابونعیم (المتوفی ۲۱۹ھ) مال و دولت اور زخارفِ دنیا سے بہت بے نیاز تھے۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگوں نے اُن پر تعلیم کی اجرت لینے کا الزام عائد کیا، مگر ابونعیم نے فرمایا:۔

"اگر لوگوں کا یہ خیال صحیح ہوتا، تو میرے ۱۳ نفری گھر کی عسرت اس عالم کو نہ پہونچتی کہ اس وقت میرے گھر میں ایک روٹی بھی نہیں ہے۔"

(تہذیب التہذیب ۸/۲۷۵)

فرط احتیاج کے باوجود استغناء، بے نیازی کی یہ روشن مثالیں صرف قرون اولیٰ کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بلکہ ہر زمانہ میں ایسے بندگان باصفا کثرت سے پائے جاتے رہے جن کے قدموں میں دنیا خود سے آکر گرتی تھی، مگر اس کی طرف التفات نہیں کرتے تھے، اور عسرت کی زندگی کو دولت دو جہاں سمجھتے تھے، ہندوستان کی تاریخ بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں ہے،

شیخ میاں ہمایوں کے زمانہ کے ایک برگزیدہ بزرگ تھے، ہمایوں ان کا بہت معتقد تھا، وہ فرط اعتقاد میں ان کو نذر دینے کی کوشش کرتا تھا لیکن وہ قبول نہ کرتے تھے ایک مرتبہ شیخ ان کے پاس ایک سادہ کاغذ پر اپنی مہر لگا کر بھیج دی، کہ وہ جتنے گاؤں اور جتنی رقمیں چاہیں، اس پر اپنے لئے لکھ لیں لیکن انھوں نے یہ کہکر انکار کردیا، کہ مجھ کو اس کی ضرورت نہیں، اور بلا ضرورت کسی کا حق مار کر فائدہ اٹھانا جائز نہیں، شاہی قاصدوں نے عرض کیا کہ اگر آپ قبول نہیں فرماتے تو اپنے لڑکوں کو دیدیں ان کو ضرورت ہوگی، اس کے جواب میں کہا کہ وہ چاہیں لیں یا نہ لیں، میں ان کو کوئی حکم نہیں دیتا، شاہی قاصدوں نے لڑکوں کی طرف رجوع کیا، تو وہ بولے "بیٹا وہ ہے جو باپ کے نقش قدم پر گامزن رہے،"[1]

شیخ حمید الدین ناگوری کے پاس ایک بیگہ زمین تھی، اسی میں اپنے ہاتھ سے کھیتی کرتے اور اہل و عیال کے لئے روزی فراہم کرتے، ایک چادر کمر سے باندھتے، اور دوسری جسم پر ڈال لیتے، بیوی کے سر پر ٹھیک سے دوپٹہ تک نہ ہوتا، ناگور کے حاکم نے شیخ کی اس درویشی اور تنگدستی کی اطلاع بادشاہ وقت کو دی، بادشاہ نے پانچ سو نقرئی تنکے کے ساتھ ایک گاؤں کا فرمان جاری کیا جب سرکاری عہدہ دار یہ فرمان لے کر شیخ کی خدمت

[1] اخبار الاخیار ص ۲۱۸،

میں پہنچا تو شیخ اندر گئے اور بیوی سے کہا کہ بادشاہ نے پانچسو نقرئی تنکے اور ایک گاؤں کا فرمان بھیجا ہے، تم کیا کہتی ہو، شیر دل بیوی نے کہا یہ قبول کر کے آپ اپنی فقیری کو برباد نہ کیجئے، گھر میں ابھی تھوڑے سے جو موجود ہیں، دو سیر سوت میں نے کات لیا ہے، جس میں میرا دوپٹہ اور آپ کا تہبند بن جائے گا، شیخ اپنی بیوی کی یہ بات سُن کر بہت خوش ہوئے اور باہر آکر سرکاری عہدہ دار سے کہا کہ تمھاری لائی ہوئی چیزوں کی حاجت نہیں،[1]

ایک بار سلطان ناصر الدین محمود کا ملتان کی طرف جانا ہوا تو راستہ میں اجودھن پڑا، جہاں بابا فرید الدین گنج شکرؒ اپنی خانقاہ میں رہتے تھے، سلطان نے اپنے وزیر الغ خاں (بلبن) کو کچھ نقد رقم اور چار گاؤں کا فرمان شیخ کی خدمت میں پیش کرنے کا حکم دیا، چنانچہ الغ خاں یہ رقم اور گاؤں کا فرمان لے کر بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ مسکرائے اور فرمایا کہ یہ نقد رقم تو جتنے درویشوں کی ذات پر خرچ کردوں گا، لیکن یہ فرمان واپس لیجاؤ، اس کے اور بہت سے طالب ہیں، انھی کو دیدو،[2]

بہار شریف کے حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیری کی درویشی کا واقعہ بھی سننے کے لائق ہے، سلطان محمد تغلق نے بہار کے حاکم کو فرمان بھیجا، کہ حضرت مخدوم کے لئے خانقاہ تعمیر کرا دی جائے، اور اس کے اخراجات کے لئے راجگیر کا پرگنہ ان کے حوالے کیا جائے، اگر وہ قبول نہ کریں تو ان کو مجبور کیا جائے، چنانچہ حضرت نے مجبوراً جاگیر تو قبول کر لی، مگر ہمیشہ اسے اپنے لئے بار سمجھتے رہے، جب سلطان محمد تغلق کی وفات کے بعد فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا تو آپ دہلی تشریف لے گئے، درباریوں کو خیال ہوا کہ شاید حضرت مخدوم الملک جاگیر میں اضافہ چاہتے ہیں، لیکن اس وقت لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۵۷، [2] فوائد الفواد ص ۹۹،

شیخ نے جاگیر کی سند نکال کر سلطان کے ہاتھ میں دے دی، اور فرمایا خدا کے لئے اس کو واپس لیجئے، یہ میرے کام کی نہیں، چلتے وقت سلطان نے اخراجات سفر کے لئے ایک بڑی رقم پیش کی، دلدہی کے خیال سے اس کو قبول تو کر لیا، لیکن دربار سے نکلتے ہی اسے فقیروں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا، اور فقیرانہ شان سے وطن واپس ہو گئے،[1]

ایک بزرگ شیخ عبد القادر ثانی (المتوفی ۱۵۳۳ء) گذرے ہیں، جب وہ اپنے والد محمد حسینی کے بعد مسند ارشاد پر بیٹھے، تو بادشاہ وقت نے اُن کے والد کے تمام کاغذات مناصب اور وظائف کی بحالی کے ساتھ ایک نیا فرمان بھی اُن کے نام جاری کیا، لیکن انھوں نے ان تمام چیزوں کو واپس کر دیا، اور کہلا بھیجا کہ اب ہمیں اس میں کسی چیز کی حاجت نہیں ہے، آپ جس کو چاہیں دیدیں،

ایک بار بادشاہ نے اُن کو اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی، اس کے جواب میں انھوں نے یہ لکھ بھیجا:-

ہو ہیچ اب ازیں باب رہ شستن نیست ہر آنچہ بر سر ما می رود مبارک باد
کسے کہ خلعت سلطان عشق پوشیداست بحلہائے بہشتی کجا شود دلشاد

ایک مرتبہ گجرات کے وزیر نے شیخ علی متانی (المتوفی ۱۵۶۷ء) کو اپنے گھر پر مدعو کیا، تو انھوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ اپنے در دولت پر آنے سے معذور رکھیں، فقیر یہیں سے دعا کرتا ہے، لیکن جب اس وزیر نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا، یہ فقیر تین شرطوں کے ساتھ آنے کے لئے تیار ہے، (۱) جہاں چاہوں گا بیٹھوں گا، مجھ کو صدر میں بٹھانے کی کوشش نہ کریں، (۲) اس کے لئے بھی اصرار نہ ہو کہ میں یہ کھاؤں گا اور وہ کھاؤں گا، میرا جو جی چاہے گا

---

[1] سیرت اشرف ص ۳۶۰،

کھاؤں گا، (۳) جب چاہوں گا آپ کی مجلس سے اٹھ کھڑا ہوں گا، اس کے بعد اصرار نہ ہو کہ اور ٹھہروں وزیر نے یہ تینوں شرطیں منظور کرلیں، جب وہ اس کے محل کی طرف چلے تو روٹی کے چند ٹکڑے اپنی اس تھیلی میں ڈالے جو ان کی گردن میں لٹکی رہتی تھی، تنہا وزیر کے محل میں پہنچے، اور دروازے کے قریب بیٹھ گئے، وزیر نے شاہانہ طریقہ پر جو فرش و فروش بچھائے تھے، اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، جب طرح طرح کے کھانے چُنے گئے، تو انھوں نے اپنی تھیلی میں سے روٹی کے چند ٹکڑے نکالے اور کھانے لگے، اور وزیر کے دسترخوان کی کوئی چیز نہ چکھی، اس کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے، خدا حافظ کہا اور السلام علیکم کہکر محل سے باہر نکل گئے، فرمایا، شرط یہی تھی کہ جب چاہیں گے، واپس لوٹ آئیں گے،

(بزم رفتہ کی سچی کہانیاں بحوالہ اخبار الاخیار ص ۲۴۸)

(دارالمصنفین کی نئی کتابیں)

خریطۂ جواہر

مولانا شاہ معین الدین احمد مرحوم ناظم دارالمصنفین کی یہ آخری تصنیف ہے، اس میں مرزا مظہر جانِ جاناں کی بیاض خریطۂ جواہر کے منتخب اشعار کی تشریح و ترجمہ کے ساتھ خود مصنف مرحوم کے اپنے خیالات بھی درج ہیں، ضخامت ۱۴۴ صفحے، قیمت:- ۵ ء ۷ - ۳

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

اس میں عہدِ مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی تفصیلات درج ہیں،

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ضخامت:- ۱۹۰ صفحے قیمت:- ۵۰-۵،

ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (حصہ دوم)

اس میں ظہیر الدین بابر سے لیکر نور الدین جہانگیر تک کے متعلق دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں ہیں،

مرتبہ:- سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ضخامت:- ۱۶۲ صفحے قیمت:- ۲۵-۶ "منیجر"

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

دہلی کالج اور مدرسہ دار البقاء

از

جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف

جن دنوں مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم سوانح مولانا محمد قاسم مفتی کفایت اللہ تصنیف فرما رہے تھے، موصوف نے چند سوالات حضرت والد ماجد مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجے جن میں سے ایک اہم سوال یہ بھی تھا کہ مدرسۂ دار البقاء میں حضرت نانوتویؒ کا قیام تھا، کون سا مدرسہ تھا، اور کہاں تھا، کیا یہ وہی مدرسہ ہے، جس کے صدر مدرس مولانا مملوک العلی نانوتوی تھے، کیا اسی میں مولانا محمد قاسم کا داخلہ ہوا تھا؟ امور مستفسرہ کے جواب کی خدمت والد ماجد نے احقر کے سپرد فرمائی۔ زیر نظر مقالہ جو مولانا موصوف کے مکتوب گرامی کے جواب میں لکھکر بھیجا گیا تھا، بعد نظر ثانی پہلی مرتبہ شائع کیا جا رہا ہے، اس مقالہ کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یادگار دہلی مصنفہ مولوی سید احمد دلی اللّٰہی مصنف فرہنگ آصفیہ۔ تاریخ آثار دہلی مصنفہ سید عبد العزیز دہلوی۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔ مرحوم دہلی کالج از مولوی عبد الحق۔ واقعات دار الحکومت دہلی از مولوی بشیر الدین احمد۔ آثار الصنادید از سر سید احمد خاں دہلوی

طبقات الشعرا از مولوی کریم الدین پانی پتی مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۲۶۴ھ
تذکرۂ علمائے ہند از مولینا رحمان علی ممبر کونسل ریاست ریواں مطبوعہ نولکشور۔
حالات طیب مولینا محمد قاسمؒ از مولوی محمد یعقوب نانوتوی مطبوعہ ۱۲۹۷ھ
در مطبع صادق الانوار بھاولپور۔ تذکرۂ رحمانیہ مولوی عبدالحلیم پانی پتی۔ غدر کے
چند علما از مفتی انتظام اللہ شہابی۔ مزارات اولیائے دہلی از مولوی محمد عالم
شاہ فریدی۔ امیر الروایات ارواح ثلثہ۔ تذکرۃ الرشید از مولینا عاشق الٰہی
میرٹھی۔

حیات النذیر سید افتخار عالم مارہروی۔ ابجد العلوم از نواب صدیق حسن خان۔

مولانا محمد قاسمؒ ۱۲۴۸ھ میں نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دیوبند میں مولوی مہتاب علی کے مکتب میں اور پھر سہارنپور میں مولوی محمد نواز سے حاصل کی۔ اس زمانے میں دہلی شہر بڑے بڑے علما و فضلا کا مرکز تھا۔ خاندان ولی اللہی کے تلامذہ اور منتسبین درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت میں مصروف تھے، انھیں میں سے ایک عظیم الشان ہستی مولینا مملوک العلی نانوتوی کی تھی، جو مدرسہ دہلی کے صدر مدرس تھے، ۱۲۵۸ھ ہجری میں مولینا موصوف نے رخصت لیکر حج کا ارادہ کیا۔ حج سے فارغ ہوکر برس دن کے بعد اپنے وطن نانوتہ تشریف لائے۔ اس وقت مولانا محمد قاسم بھی وہیں تھے، دس گیارہ سال کی عمر تھی، مولینا مملوک العلی نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو اپنے ساتھ دہلی لے جاؤں گا۔ انھوں نے بخوشی منظور کر لیا۔ اور والد سے اجازت لے کر ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ ہجری کے آخر میں وطن سے روانہ ہوکر دوسری محرم ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہونچے۔ چوتھی محرم کو سبق شروع ہوئے مولوی محمد قاسم نے کافیہ شروع کی۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی ابن مولانا مملوک العلی لکھتے ہیں۔ کہ "والد مرحوم نے میری اجواب کا سننا اور تعلیلات کا پوچھنا ان کے سپرد کیا تھا۔ اور ہر جمعے کی رات کو کچھ تھی ہوتی تھی، صیغوں اور ترکیبوں کا پوچھنا معمول تھا، یاد ہے کہ مولوی صاحب سب میں عمدہ رہتے تھے، اسی زمانے میں ہمارے مکان کے قریب مولوی نوازش علی کی مسجد میں مجمع طالب علموں کا تھا۔ ان سے پوچھ پاچھ اور بحث شروع ہوئی۔ مولوی صاحب کی جب باری آئی سب پر غالب آئے۔ اور جب گفتگو ہوتی اس میں مولوی صاحب کو غلبہ ہوتا۔"

مولنا محمد قاسم نے دہلی کالج میں داخل ہو کر بھی کچھ دنوں تعلیم پائی ہے جس کے شعبۂ مشرقی کے صدر مدرس مولنا مملوک العلی تھے۔ چند روز میں اقلیدس کے تمام مقالے دیکھ ڈالے پھر منشی ذکاء اللہ (مصنف تاریخ ہندوستان) چند سوال کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے جو نہایت مشکل تھے، ان کے حل کر لینے پر مولوی صاحب کی نہایت شہرت ہوئی۔ مگر امتحان سالانہ میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔ سب اہل مدرسہ بالخصوص پرنسپل کو بہت افسوس ہوا۔ پھر مطبع احمدی (دہلی) میں اجرت پر تصحیح کتب کا کام شروع کیا۔ اس وقت تمام درسی کتب آپ پوری کر چکے تھے، اس کے بعد مولنا رشید احمد گنگوہیؒ کی معیت میں جو شروع ہی سے آپ کے ساتھی اور ہم سبق تھے، حضرت شاہ عبد الغنیؒ کی خدمت میں حدیث پڑھی، اور اسی زمانے میں دونوں نے حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی۔ اار ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو مولنا مملوک العلی نے وفات پائی تیمار داری میں مولنا محمد قاسم ہر وقت حاضر رہتے تھے آپ کے انتقال کے بعد مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے مملوکہ مکان واقع کوچہ چیلان میں منتقل ہو گئے

مولانا محمد قاسم بھی اسی مکان میں منتقل ہوگئے۔ تقریباً ایک سال کے بعد مولوی محمد یعقوب صاحب بسلسلۂ ملازمت اجمیر چلے گئے۔ اور مولانا تنہا اس مکان میں رہے۔ کچھ دنوں کے بعد مطبع احمدی میں چلے گئے۔ پھر چند روز دارالبقا میں رہے۔ اسی زمانے میں مولانا احمد علی سہارنپوری نے بخاری شریف کے آخری پانچ چھ پاروں کی تصحیح و تحشیہ کا کام آپ کے سپرد کیا۔

رحمان علی صاحب تذکرۂ علمائے ہند لکھتے ہیں کہ "بعد از فراغ علوم چندے بدر آں دہلی تعلق گرفتہ و بعد ترک آں تعلق در مطبع احمدی بہ تصحیح کتب مقرر شد۔" مطبع احمدی کوچہ بلاقی بیگم میں (قریب جامع مسجد) واقع تھا۔ منشی اُمّوجان اس کے مالک تھے۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ کے بعد بوجہ شبہ الزام بغاوت روپوش رہے اور ۱۲۷۷ھ میں حج بیت اللہ کو روانہ ہوئے۔ واپسی پر عام معافی کا اعلان ہوچکا تھا۔ دہلی کا مطبع احمدی ختم ہوچکا تھا۔ منشی ممتاز علی نے میرٹھ میں مطبع ہاشمی میں آپ کو بلا لیا۔ منشی ممتاز علی مطبع ہاشمی کے فرم کار میں تھے۔

بیعت

مولینا محمد یعقوب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اور مولینا رشید احمد گنگوہی نے فراغت تعلیم کے بعد ہی حاجی صاحب سے بیعت کی تھی۔ لیکن تذکرہ علماء ہند سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حاجی صاحب سے ۱۲۷۷ھ میں مکہ معظمہ میں بیعت ہوئے۔ لیکن راقم الحروف کے خیال میں مولانا محمد یعقوب کا بیان صحیح ہے۔ تذکرۃ الرشید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲۷۶ھ میں ہجرت فرمائی تھی۔

مولوی محمد قاسم نے ۱۲۸۵ھ میں دوسرا حج کیا۔ حج سے فارغ ہوکر واپس آئے

تو منشی ممتاز علی بغرض عرب مکہ معظمہ میں ہی تھے۔ مولانا نے اس عرصے میں مولوی محمد ہاشم کے مطبع ہاشمی میں کام کیا۔ پھر منشی ممتاز علی مکہ معظمہ میں ایک سال قیام کرکے واپس آئے اور[1]

---

[1] منشی ممتاز علی کی ہجرت وغیرہ کے بارے میں مورخین کے بیانات میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے، مولانا امداد صابری نے اپنی تازہ تصنیف "دہلی کی یادگار ہستیاں" میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

> ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں مولوی محمد ہاشم نے اندر کوٹ میرٹھ میں مطبع ہاشمی جاری کیا۔ بعد میں اس میں منشی ممتاز علی نے شراکت کی۔ مولانا محمد قاسم اس مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے، پھر ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں منشی صاحب مطبع ہاشمی میں سے دو عدد دستی پریس دہلی لے آئے۔ اور محلہ چوڑی والان میں اپنا مطبع مجتبائی قائم کیا۔ اس سے بھی مولانا کا تعلق رہا۔ پھر ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں منشی صاحب نے مطبع مجتبائی کو مولوی عبد الاحد کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اور اپنی چار صاحبزادیوں کے ساتھ ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے۔" "اختر شہنشاہی" میں مطبع مجتبائی کا مقام اجرا دہلی لکھا ہے، میرٹھ نہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ مطبع میرٹھ میں ختم کرکے ہجرت فرما گئے۔ بلکہ انھوں نے دہلی کا مطبع مجتبائی فروخت کرکے ہجرت فرمائی۔ یہ بھی درست نہیں ہے کہ منشی صاحب دوسرے سال ہندوستان واپس آگئے۔ وہ ہجرت کرنے کے بعد ہندوستان نہیں آئے۔ مکہ معظمہ ہی میں وفات پائی اور قبرستان جنت المعلیٰ میں آرام فرما ہیں۔ (دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۱۰۱)

واضح ہو کہ منشی صاحب موصوف کے ہجرت فرمانے کے بعد ان کے صاحبزادوں میں منشی مشتاق علی اور منشی عبد الغنی نے کھڑکی تفضل حسین میں مطبع مصطفائی کے نام سے اپنا مطبع قائم کیا تھا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اور اپنا مطبع مجتبائی دہلی میں قائم کیا۔ اور مولنا کو بھی میرٹھ سے دہلی لے آئے۔ ۱۲۸۶ھ میں یہ مطبع مجتبائی منشی صاحب نے مولوی عبدالاحد کے ہاتھ فروخت کر دیا اور ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ اور وہیں وفات پائی۔ مطبع مجتبائی بازار چوڑی والان میں واقع ہے۔ جو اس وقت مولوی عبدالاحد کے لڑکوں کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ اور مطبع مصطفائی جو بعد میں منشی ممتاز علی کے صاحبزادوں نے قائم کیا۔ کھڑکی تفضل حسین خان میں متصل زنانہ وکٹوریہ ہسپتال واقع ہے جو اس وقت منشی ممتاز علی کے پوتوں کے تصرف میں ہے۔ مگر مطبع ختم ہو چکا ہے، صرف نام اور سائن بورڈ باقی رہ گیا ہے۔ منشی ممتاز علی کے دو صاحبزادے تھے۔ بڑے منشی مشتاق علی اور چھوٹے منشی عبدالغنیؒ۔ یہ دونوں خطِ نسخ میں دہلی کے مایۂ ناز استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان کے سیکڑوں شاگرد ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مولنا مملوک علی نانوتوی . . . . مولنا رشید الدین خان دہلوی کے شاگرد ہیں۔ اور وہ شاگرد ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہم اللہ کے۔ اور مولنا محمد قاسم اور مولنا رشید احمد گنگوہی نے حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے اور انھوں نے حضرت شاہ محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ مہاجر (نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ) سے اور انھوں نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے پڑھی۔

مولانا رشید الدین خان دہلوی، مفتی صدرالدین خان آزردہ اور مولنا ابوالکلام آزاد کے نانا رکن المدرسین مولوی منور الدین اور مرزا غالب، حکیم مومن خان دہلوی

لے راقم الحروف کو خطِ نسخ میں منشی عبدالغنی سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے استاد خطاطی مولانا اشتیاق احمد صاحب بھی منشی محبوب علی میرٹھی کے واسطے سے منشی ممتاز علی کے سلسلہ میں داخل ہیں۔

نواب مولوی قطب الدین دہلوی، حکیم آغا خان عیش مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا محمد اسمٰعیل شہید وغیرہ یہ تمام اہل کمال ایک ہی زمانے کے ہیں۔

"مدرسہ دہلی"

۱۸۲۵ء میں حکومت انگلشیہ نے مدرسہ غازی الدین (بیرون اجمیری دروازہ) میں علوم مشرقی کا ایک دارالعلوم جاری کیا تھا جس کے صدر مدرس مولانا رشید الدین خان دہلوی مقرر کئے گئے تھے، سرسید احمد خاں، منشی ذکاء اللہ، مولوی ضیاء الدین، اور ڈپٹی نذیر احمد اسی کالج کے فیض یافتہ ہیں۔ یہ کالج ۱۸۴۲ء تک مدرسہ غازی الدین کی عمارت میں رہا۔ پھر ریزیڈنسی کی عمارت (متصل کشمیری دروازہ) میں منتقل ہوگیا۔ ریزیڈنسی کی یہ عمارت دراصل ۱۶۳۷ء میں دارا شکوہ کا دارالمطالعہ تھا۔ ۱۶۳۹ء میں اس میں پنجاب کے مغل صوبہ دار علی مردان خان کا قیام رہا اور ۱۸۰۳ء میں اس میں ریزیڈنسی سر ڈیوڈ اختر لونی بارٹ ہی رہے۔ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۷۷ء تک اسی میں گورنمنٹ کالج یا (دلی کالج رہا۔ پھر ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۶ء تک مدرسہ ضلع اور ۱۸۸۶ء سے ۱۹۰۴ء تک میونسپل بورڈ اسکول اس عمارت میں رہا۔ پھر گورنمنٹ ہائی اسکول اور دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء) کے دوران گورنمنٹ ہائی اسکول کو ختم کر کے اسی عمارت میں پولی ٹیکنک اسکول قائم کیا گیا جو اب بھی موجود ہے۔

یہ دلی کالج جب ۱۸۴۲ء میں مدرسہ غازی الدین کی عمارت سے دارا شکوہ کی عمارت میں منتقل ہوا تو مدرسہ غازی الدین والی عمارت پرنسپل ہی کے سپرد رہی جو بطور بورڈنگ ہاؤس اسی مدرسے کے طلبہ کے کام آتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اس میں پرنسپل نے بطور شاخ کے ایک مدرسہ علوم مشرقی کھولا اس کے بعد پرنسپل سے مدرسہ

غازی الدین کی عمارت گورنمنٹ نے لے لی اور "دارالشفائے یونانی" کے نام سے ایک ہسپتال اس عمارت میں قائم کیا۔ پھر ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد اس عمارت پر پولیس کا قبضہ اور سکونت رہی۔ فروری ۱۹۰۹ء میں اینگلو عربک ہائی اسکول قائم ہوا جو بعد میں عربک کالج بنا۔ اور انقلاب ستمبر ۱۹۴۷ء کے بعد اس کی منتظمہ کمیٹی نے اس کا نام "دہلی کالج" تجویز کیا۔

"مولانا مملوک العلی"

مرحوم دہلی کالج کے صدر مدرس مولوی رشید الدین خان دہلوی کے انتقال کے بعد ان کے عزیز شاگرد مولانا مملوک العلی نانوتوی اس کے مدرس اول ہوئے آپ کے تبحر علمی کے بارہ میں تمام تذکرہ نویس رطب اللسان ہیں۔ اور کئی کئی صفحے لکھے ہیں۔

مولوی کریم الدین مصنف "فرائد الدہر" (طبقات الشعراء) لکھتے ہیں "سوائے درس دہی طلبائے مدرسہ کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ تمام اوقاتِ گرامی ان کے تعلیم طلبہ میں نصف شب تک منقسم ہیں۔ حلیہ ان کا یہ ہے کہ ہنستی پیشانی خندہ رو سفید ریش نورانی صورت متواضع حلیم بردبار متفکر مدبر دانش مند ہیں۔ باوجود کثرت علم وفضل کے کبھی وعظ عام نہیں کہا۔ اور طالبین علم کے ہجوم اور کثرت درس وتدریس کی وجہ سے تصانیف کتب کی طرف توجہ نہ ہوئی۔"

مولوی عبدالحق اپنی کتاب "مرحوم دہلی کالج" لکھتے ہیں کہ ۱۸۴۷ء میں مولوی مملوک العلی کی عمر تقریباً ساٹھ برس تھی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ان سے پڑھا ہے۔" مگر عام طور پر تذکروں میں جہاں مرحوم دہلی کالج کے دیگر فیض یافتوں کا ذکر آتا ہے۔ وہاں مولوی محمد قاسم کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے پرائیویٹ

جدید مولٰنا مملوک العلی سے گھر پر تعلیم پائی۔ پرائیویٹ درس و تدریس کا دستور اس زمانے میں بالعموم رائج تھا۔ چنانچہ مصنف فرائدالدھر کے بیان سے مولٰنا کا یہ معمول معلوم ہوتا ہے۔

مولٰنا محمد یعقوب نانوتوی کا بیان ہے۔" کہ مولٰنا مملوک العلی نے آپ کو مدرسے میں داخل کیا تھا۔ اور ٹیچروں سے کہا تھا کہ تم ان کے حال سے متعرض نہ ہونا۔ ریاضی اقلیدس وغیرہ میں خود پڑھا لوں گا، مگر امتحان سالانہ میں شریک نہیں ہوئے۔ بلکہ ترک تعلق کرکے مطبع احمدی میں ملازمت کرلی۔ اور پھر شاہ عبدالغنی سے حدیث پڑھی۔

مولوی رحمان علی مصنف تذکرۂ علمائے ہند لکھتے ہیں۔" بعد فراغ از تحصیل علوم چندے بمدرسہ انگریزی واقع دہلی تعلق گرفتہ و بعد ترک آں تعلق در مطبع احمدی بتصحیح کتب مقرر شد۔"

مرحوم دہلی کالج یا مدرسہ دہلی یا مدرسہ شاہجہاں آباد یہ تینوں نام اسی دارالعلوم کے ہیں۔ جو مدرسہ غازی الدین بیرون اجمیری دروازہ میں ۱۸۲۵ء میں قائم ہوا تھا۔ جس کے شعبہ علوم مشرقی کے صدر مدرس مولوی رشیدالدین خاں دہلوی مقرر ہوئے تھے۔ اور ان کے بعد مولٰنا مملوک العلی اس کے صدر مدرس رہے اور مولف حیاۃ النذیر کے بیان کے مطابق مولوی سید محمد جو مدرس دوم تھے، مولوی مملوک العلی کے انتقال کے بعد صدر مدرس قرار پائے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۴ء تک اسی دہلی کالج میں پڑھا اور مولوی سید محمد سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا۔

یادگار دہلی اور آثار دہلی وغیرہ میں لکھا ہے کہ" ہندیوں کے قبرستان میں مسجد

افغانان کے اندر حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار قادری رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ اور آپ کے پائیں مولنا مملوک علی نانوتوی کا مزار ہے جو استاد الکل تھے۔ اور شمس العلماء مولوی ضیاء الدین اور شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد ان سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔

"دارالبقا اور دارالشفا"

اس دہلی کالج یا مدرسۂ دہلی کو مدرسۂ دارالبقا کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ مدرسہ دارالبقاء اور شفا خانہ دارالشفا یہ دونوں عمارتیں جامع مسجد شاہجہانی سے تعلق رکھتی تھیں، مولانا ابوالحسنات ندوی مصنف "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" کے بیان کے مطابق دارالبقا کا سنگ بنیاد ۱۰۶۰ھ ہجری میں رکھا گیا تھا۔ یہی جامع مسجد کا سال تعمیر ہے۔ داغ کے شاگرد رشید بیخود دہلوی نے راقم الحروف واصف سے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ دارالبقا جامع مسجد کے جنوب مغربی گوشے پر تھا۔ اس گوشے پر اب چند نامعلوم حضرات کے مزارات اور ایک کنواں بہت بڑا اور پختہ شاہی زمانے کا ہے۔ دارالشفا شمال مغربی گوشے پر تھا۔ یہ دونوں مرور زمانہ کی وجہ سے برباد ہو چکے تھے، مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی (المتوفی ۱۲۸۵ھ) نے زر خطیر خرچ کر کے ان دونوں کی مرمت کرائی جو حجرے شاہی زمانے کے باقی تھے۔ ان کی حسب ضرورت درستی کرائی۔ اور بعض حجرے شاہی طرز پر از سر نو بنوائے۔ درسگاہیں وغیرہ درست کرائیں۔ اور ان دونوں اداروں کو جاری کر دیا۔ اسی وجہ سے یہ دونوں ادارے حضرت مفتی صدرالدین صاحب کی طرف منسوب ہیں۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں یہ دونوں ختم ہو گئے اور عمارتیں گرا کر صاف میدان کر دیا گیا، جامع مسجد کے آس پاس گول سڑک نکالی گئی، چاروں گوشے کٹ کر الگ ہو گئے اور سرکاری ملکیت ہو گئے عوام انکو گھمٹی کہنے لگے بعض لوگ سہو سے بھی کہتے ہیں۔ یہ سہو سے جتنے اب ہیں اس سے بڑے تھے۔ تقریباً ۱۹۳۵ء۔

میں صرف سے کم کرکے سڑکیں چوڑی کی گئیں۔ یادگار دہلی کے مصنف نے تیسرے جنوب مشرقی گوشے پر دار البدیٰ کی نشاندہی کی ہے، چوتھے گوشے کے بارے میں کسی مورخ نے کچھ نہیں لکھا۔

مفتی صدر الدین خان آزردہ کی حویلی بازار مٹیا محل میں تھی جو حویلی صدر الصدور کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ اسی حویلی کے اندر حضرت مفتی صاحب کا انتقال ۱۲۸۵ھ میں بعمر ۸۱ سال ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آپ کی ساری جائداد بہ الزامِ بغاوت ضبطی میں آگئی تھی۔ بعد میں بہت تھوڑی سی جائداد واگذار ہوئی۔ مؤلف تذکرۂ رحمانیہ نے لکھا ہے کہ مفتی صدر الدین خان آزردہ کی مولانا مملوک علی سے معاصرانہ چشمک تھی۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ مفتی صدر الدین خاں آزردہ مولانا رشید الدین خان کے معاصر اور ہم سبق تھے۔ بڑے فراخ دل، فراخ حوصلہ اور خلیق تھے اس زمانے میں مدرسۂ دہلی کے انتظامی بورڈ کے ممبر اور مدرسہ کے ممتحن بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب جامع مسجد واگزار ہوئی۔ اور اس کا انتظامی بورڈ بنایا گیا تو مفتی صاحب بھی اس کے ممبر بنائے گئے۔ مولانا مملوک علی نے اپنے دونوں عزیز شاگردوں (مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد) کو ان کا شاگرد بھی کرایا تھا۔ چنانچہ تذکرۃ الرشید میں مفصل طور پر مفتی صاحب سے ان دونوں کے تلمذ کے واقعات مذکور ہیں۔

آثار الصنادید اور واقعات دار الحکومت وغیرہ دیکھنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دار البقاء اور دار الشفا جامع مسجد کے ساتھ ہی قائم کئے گئے تھے۔ اور کچھ عرصے کے بعد سلطنت مغلیہ کی آئے دن کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے خستہ وخراب ہو گئے تھے۔ پھر مفتی صاحب نے مرمت کرا کر دونوں اداروں کو از سرِ نو جاری کیا۔ دار الشفا کے

متعلق ۱۲۷۳ھ میں سرسید احمد خان نے لکھا ہے کہ "شمالی دروازے کی طرف شاہجہانی دارالشفا ہے کہ سابق میں حکیم بیٹھتے تھے، اور دوائی خانہ رہتا تھا۔ اب لوگ بستے ہیں اور گھر بھی بن گئے ہیں"۔

مولانا محمد قاسمؒ کے متعلق جو مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے کہ کچھ دنوں دارالبقا میں رہے وہ یہی دارالبقا تھا۔ جو جامع مسجد کے جنوب میں واقع تھا۔ اور غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے موجود تھا۔ مولانا مملوک علیؒ کی وفات ۱۲۶۷ھ میں ہوئی۔ اس وقت مولانا محمد قاسم تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے، اور مطبع احمدی میں ملازم تھے، کچھ دنوں آپ مولانا محمد یعقوب کے مکان واقعہ کوچہ چیلان میں بھی رہے پھر جب وہ بسلسلۂ ملازمت اجمیر چلے گئے تو کچھ دنوں ان کے مکان میں تنہا رہنے کے بعد آپ مطبع احمدی میں اور پھر دارالبقا میں منتقل ہو گئے۔ یہ تعلیم و تعلم کا زمانہ نہیں تھا، بلکہ یہ قیام عارضی محض مسافرت کی بنا پر تھا۔ مولانا مملوک العلی کا دارالبقا سے کوئی تعلق ثابت نہیں۔ نیز دارالبقا کی تعلیمی حالت کے متعلق کچھ سراغ نہیں ملا کہ کون کون حضرات اس کے مدرس تھے۔ اور کیسی تعلیم تھی۔

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں۔

(مولفہ مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم)

ہندوستان کی قدیم تاریخ کی کتابوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیم گاہوں کے حالات بہت کم ملتے ہیں، مولانا ابوالحسنات مرحوم نے نہایت تلاش و تحقیق سے اس کتاب میں قدیم مدرسوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائے ہیں۔ جو قابل مطالعہ ہیں۔ قیمت:۔ ۲ روپئے ۰ ۷ پیسے۔

بابُ التقریظ والانتقاد

"دہانِ زخم"

جناب اختر انصاری کے قلم نے شاعری کی مختلف اصناف کے علاوہ ادب، انشا، اور تنقید کے میدان میں بھی جولانیاں دکھائی ہیں نظم و نثر میں اُن کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں اُن کی زیادہ شہرت قطعات کی وجہ سے ہے، دہانِ زخم قطعات کے علاوہ غزلوں، نظموں، رُباعیات اور ایک مثنوی پر مشتمل ۲۸ء سے ۶۲ء تک کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ منتخب کلام کا مجموعہ ہے،

ابتدائی دور کے رنگِ سخن کا اندازہ اس قطعہ اور غزلوں کے بعض متفرق اشعار سے ہوتا ہے،

صدا ہوں شکستِ تمنا کی میں　　نشاطِ محبت کی آواز ہوں
مری شاعری ہے سرودِ حیات　　میں فطرت کے ہاتھوں میں اک ساز ہوں

حسین یادوں کی شمعیں مجھے جلانے دو　　مزار ہیں مرے سینے میں آرزوؤں کے

لیکن آگے چل کر یہ رنگ پھیکا ہو گیا، اب وہ غمِ دل و غمِ حیات کی پرانی حکایتیں دہرانے کے بجائے نئے حالات اور تقاضوں کی جانب توجہ کرتے ہیں،

حقائق کی زد سے بچا دل نہ اختر　　بہت ہم نے خوابوں میں ڈھونڈھیں پناہیں

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب　　چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

غمِ حیات و غمِ دل کی یہ کہن روداد　　مذاقِ نادرہ کاری پہ حرف آتا ہے

مگر اُن کے ہر دور کا کلام درد و کسک سے معمور ہے پہلے اُن کو ماضی کی عشرتوں، جوانی کی حسرتوں اور محبت کی ناکامیوں کا دکھ تھا، اور اب وہ حالات کی بے اعتنائی، سماج کی ناہمواری اور اخلاق

شرافت کے فقدان سے آزردہ نظر آتے ہیں، اُن کے سچے جذبات اور قلبی واردات نے اُن کے کلام کو ایک زخم خوردہ دل کی آپ بیتی اور سوز و گداز کا مرقع بنا دیا ہے، اس حقیقت کا اظہار خود اس طرح کیا ہے

میرا طرزِ سخن نرالا ہے، میں نے نالوں کو نے میں ڈھالا ہے
میرا مجموعۂ کلام اختر خون کے آنسوؤں کی مالا ہے

ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں،

غم زدہ ہیں، مبتلائے دردہیں، ناشاد ہیں ہم کسی افسانۂ غمناک کے افراد ہیں
گردشِ افلاک کے ہاتھوں بہت برباد ہیں ہم لبِ ایام پر اک دکھ بھری فریاد ہیں

وہ دوسروں کے درد کو اپنا درد تصور کرتے ہیں، اور اُن کی آہ و فغاں سنکر خود مجسم فریاد بن جاتے ہیں

مبتلائے درد ہونے کی یہ لذت دیکھئے قصۂ غم جو کسی کا دل مرا دھک دھک کرے

آبروئے غم اور متاعِ درد کی حفاظت کے لئے اُن کی تدبیریں ملاحظہ ہوں،

ہنستے ہیں دہانِ زخم سے ہم گاتے ہیں فغاں کے بربط پر آشفتہ سروں کی دنیا کے انداز نرالے ہوتے ہیں
لبوں پہ موجِ تبسم کو رقص کرنے دو کہ یوں بھی آبروئے غم بچائی جاتی ہے

وہ افکارِ تازہ اور جہانِ نو کی برکتوں سے فیضیاب ہونا اور ظن و تخمین کی تیرہ و تنگ فضاؤں سے نکل کر اس مقام پر پہنچنا چاہتے ہیں جو علم و عرفان کی روشنی سے جگمگا رہا ہو، وہ رسم و رواج کے پرستاروں کو لات و منات کے پجاریوں سے کم ذلیل و بے وقعت نہیں سمجھتے، ملاحظہ ہو:-

رہینِ رسم و روایت ہو جس کی بت شکنی وہ بُت شکن بھی حقیقت میں سومناتی ہو

آج بھی ہے عقیدتوں میں نہاں روحِ اصنام پوچھئے کیا ہو
فکر کی تیرگی قیامت ہے روشنی لاؤ دیکھئے کیا ہو

وہ نئے دور کا اسی لئے خیر مقدم کرتے ہیں کہ موجودہ انسان نے اپنی محنت و صلاحیت سے حیرت انگیز

کارنامے انجام دے رہے ہیں، مہر و ماہ اس کی عقل و فکر کی گرد راہ بن گئے ہیں، اس کے علم و ادراک نے اوہام کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے، ایک نظم "نیا دور" میں فرماتے ہیں :-

اک معدنِ زر ہے نئے انساں کی محنت — اے زرگرِ تقدیر! دوکاں اپنی بڑھا آئے

ادراک حقائق سے مسلح ہے نیا ذہن — اے لشکرِ اوہام! علم اپنے گرا آئے

اک مشعلِ شب تاب ہے، ہر ذرۂ خاکی — اے تاروں بھری رات دیئے اپنے بجھا آئے

کیا کہئے اب اس عالمِ پستی کے فضائل — اے بامِ نہ افلاک! فضیلت کو بھلا آئے

اب خلد بریں ہے تو یہی اپنی زمیں ہے — مسجودِ جبیں ہے تو یہی اپنی زمیں ہے

لیکن اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی اختر صاحب کی نظر سے مخفی نہیں ہے، موجودہ تمدن کی چمک دمک کے اندر آلائشوں کا انبار پوشیدہ ہے، عشرتکدوں سے زخمی دلوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں، سلطانیِ جمہور کے اس زمانہ میں پس ماندہ قوموں کی گرفتاری کے نت نئے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں، گو ایشیا و افریقہ کی قومیں یورپ کے اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرتی جارہی ہیں لیکن اُن کے افکار و نظریات کے تسلط سے ابھی تک اُن کو آزادی میسر نہیں ہو سکی ہے، اور یہ ذہنی و فکری غلامی طوق و سلاسل کی بندشوں سے بھی بدتر ہے،

گلستاں قہقہوں کے دامن میں — خونِ حسرت ہے پوچھئے کیا ہو

بہت آزادیوں میں نہاں ہیں — قفس و دام پوچھئے کیا ہو

ہائے وہ فکر و تصور کی غلامی اختر — جس غلامی کے لئے طوق بھی درکار نہ ہو

مادی ترقی کے باوجود انسان اخلاقی حیثیت سے بہت پست ہو گیا ہے، اُس کا دامن اپنے ہی ابنائے جنس کے خون سے آلودہ ہے، اس کے ظلم کے سامنے فلک کا جور و ستم بھی ہیچ ہو گیا ہے، قتل و غارت کا ہر طرف بازار گرم ہے، اور طبقہ واریت، اور

فرقہ آرائی کی لعنت عام ہوگئی ہے، مثنوی میں انہی حالات کا ذکر ہے، انکی نظموں میں جنگِ عظیم کی ہولناک تباہی اور مغربی قوموں کی بربریت کا شرمناک منظر بیان ہوا ہے، قحطِ بنگال اور فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہوکر جو نظمیں کہی گئی ہیں، ان سے شاعر کی دردمندی اور دلسوزی کا اندازہ ہوتا ہے، مصنف کے نزدیک یہ ساری لعنتیں موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے بطن سے پیدا ہوئی ہیں، اسی زرگرانہ تہذیب وثقافت ہی نے عظمت آدم کو پارہ پارہ کرکے انسانوں کے درمیان تفرقہ و منافرت کی دیواریں کھڑی کردی ہیں، اس لئے وہ سرمایہ داری کے مہلک اثرات سے دنیا کو نجات دلانے کے لئے آدمیت کی عظمت وبرتری کا نقش دلوں میں جاگزیں کرنا چاہتے ہیں اور ایک ایسے سماج کو قائم کرنے کے آرزومند نظر آتے ہیں جس میں خود غرضی اور مفاد پسندی کے بجائے الفت ومحبت اور اخوت بھائی چارگی عام ہو؎

نظم سرمایہ آدمی کے لئے طوقِ لعنت ہے پوچھئے کیا ہو،
زرگرانہ ثقافت وتہذیب بربریت ہے پوچھئے کیا ہو

اُن کی طبیعت غیرت مند اور خودوار واقع ہوئی ہے، اس لئے نہ توکبھی اُن کی زبان دوسروں کی بیجا مدح سرائی سے آلودہ ہوئی، اور نہ اُن کی طبیعت کا میلان کبھی قصیدہ گوئی کی جانب ہوا، اُن کو دوسروں کا منت کش ہونا گوارا نہیں، سرمایہ داروں کی طرح بے رحمی سے مزدوروں کا استحصال کرنے کے بجائے وہ اپنے خون پسینہ کی کمائی کو قابلِ فخر سمجھتے ہیں اور اُن کو جہانِ غیر کے مہر و ماہ کے بجائے اپنے دست و بازو کا تعمیر کردہ نشیمن پسند ہے

اپنی دنیا آپ ہی پیدا کروں میں تو سہی سایۂ گردوں میں ہو میرا بھلا ممکن نہیں

عرق ہو اپنی جبیں کا تو زہر بھی مرغوب ملے جو مفت تو آبِ حیات سے بھی حذر

آخر میں، اختر انصاری کا زیادہ رجحان رباعی کی طرف ہوگیا ہے اور بعض رباعیاں

درحقیقت قرآنی آیتوں اور حدیثوں کے منظوم ترجمے ہیں، قطعات میں ندرت اور جدت کے علاوہ احساسات کی نزاکت اور جذبات کی لطافت بھی ہے، اُن کی غزلیں ایک مضطرب بے قرار روح اور دردمند دل کی آہ سوزناک اور نالۂ شرربار معلوم ہوتی ہیں نظموں کے موضوع میں تنوع اور رنگا رنگی ہے بعض قوم پروری اور حب الوطنی کے جذبات سے معمور ہیں مندرجہ ذیل فارسی نظم "قطب مینار" سے شاعر کے زورِ بیان، شدّتِ تاثر، اور ملی جوش وخروش کا اندازہ کیا جاسکتا ہے،

ہاں دلِ شوریدہ حالم! چشمِ عبرت باز کن ، گردشِ ایام را بنگر، الم را ساز کن،
آہ گرم و نالۂ جاں سوز را طیار شو ، در فراقِ عز ملت دیدۂ خوں بار شو
ایں منارہ را بہ بیں جور زماں اندازہ گیر ، رفعتِ دیرینۂ اسلامیاں اندازہ گیر
زیں لواے حق بپرس افسانۂ بزم کہن ، ہاں بکن سرشار زیں خم خانہ جامِ خویشتن
شیون و آہ و فغاں را عظمتش محتاج نیست ، واے بر تو گر قرارت از الم تاراج نیست

مجموعہ کے آخر میں کئی ممتاز ادیبوں اور نقادوں نے اختر صاحب کی شاعری کے متعلق وقتاً فوقتاً جو کچھ لکھا ہے اس کے اقتباسات درج ہیں،

گو مصنف رواتی شاعری کو پسند نہیں کرتے تاہم انھوں نے مغربی شعروادب کی مضحکہ خیز نقالی سے پرہیز کیا ہے وہ اُردو فارسی اور انگریزی زبانوں سے واقف ہیں، اور انھوں نے مغربی ومشرقی شاعری کے امتزاج سے اپنا ایک منفرد انداز پیدا کیا ہے، اُن کے طرز ادا میں دلکشی اور زبان وبیان میں سلاست وروانی ہے،

ایک آدھ آنچ کی کسر تو رہ ہی جاتی ہے اگر مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ اردو شاعری کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہے جو انور بکڈپو مسلم یونیورسٹی مارکٹ علی گڑھ سے پندرہ روپے میں ملے گا،

"ض"

مطبوعات جدیدہ

انسان کامل:۔ مرتبہ۔ جناب خالد علوی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۶۰۰، مجلد مع گرد پوش قیمت درج نہیں۔ پتہ یونیورسٹی بک ایجنسی ۱۹۴، انار کلی۔ لاہور۔

رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر اردو میں بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اور یہ مبارک سلسلہ اب بھی جاری ہے، اس نئی کتاب میں پہلے آپ کی پاکیزہ زندگی اور پیدائش سے وفات تک کے عام واقعات وحالات تحریر کئے گئے ہیں اور آخر میں مختلف حیثیتوں سے آپ کی سیرت کی جامعیت وکمال کا ذکر ہے۔ اس میں آپ کے ذی وقار شہری سچے اور امانت دار تاجر، بے نظیر خطیب اولوالعزم مبلغ وداعی معلم انسانیت، داعی انقلاب، سپہ سالار اعظم، غیر معمولی مدبر وسیاست داں اعلیٰ مقنن ومنصف، اور رحمۃ للعلمین ہونے کو مختلف واقعات زندگی کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے، اور معیشت ومعاشرت کے متعلق آپ کے تصورات اور آپ کی گھریلو زندگی کا حال دیا گیا ہے، اکثر بحثوں کی تمہید بھی خاصی ہے، سورۂ نجم کی آیت "ومانیطق عن الھوی" کے سیاق وسباق کو نظر انداز کرکے نطق سے تمام اقوال رسول اور حکمت سے حدیث مراد لینا صحیح نہیں ہے آپ کی عصمت وپیغمبرانہ حیثیت کے متعلق مصنف کا نقطۂ نظر اچھی طرح واضح نہیں ہو سکا ہے۔ گو اس کتاب کی اکثر بحثیں مختلف اردو کتابوں خصوصاً سیرۃ النبی اور خطبات مدراس میں آچکی ہیں، تاہم آنحضور صلعم کی سوانح نگاری

بجائے خود نہایت مقدس شغل ہے۔ اس کے لیے مصنف قابلِ تحسین ہیں۔

بریلوی فتنہ کا نیا روپ :۔ مرتبہ۔ مولوی محمد عارف صاحب سنبھلی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۲۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۷ روپیہ کتب خانہ الفرقان۔ لکھنؤ۔

چند سال پہلے "زلزلہ" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی، جو ہماری نظر سے نہیں گذری، اس میں علمائے دیوبند کی تحریروں اور واقعات سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین کے لیے تو علم غیب اور عالم میں تصرف کی قدرت کے عقیدہ کو کفر و شرک بتاتے ہیں مگر خود اپنے اکابر کو ان ہی اوصاف سے متصف مانتے ہیں، زیر نظر کتاب اسی کے جواب میں لکھی گئی ہے، اس میں صاحب زلزلہ کے مغالطوں کی تردید کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ بزرگان دیوبند کے ان واقعات کا خدا کے لیے مخصوص علم غیب اور تصرف سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ ان کی حیثیت کشف و کرامات وغیرہ کی ہے۔ اس مقصد کے لیے توحید و شرک کی حقیقت اور مسئلۂ علم غیب و تصرف کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، تاہم بعض واقعات کی توجیہ سب کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی، زلزلہ میں علمائے دیوبند کی قوم پروری اور بے داغ سیاسی کردار پر جو حرف گیری کی گئی تھی، اس کا ایک مستقل عنوان کے تحت جواب دیا گیا ہے، آخر میں اس طبقہ کی جس سے زلزلہ کے مصنف کا تعلق ہے مختصر تاریخ اور مضحکہ خیز خصوصیات بیان کی گئی ہیں، جابجا زلزلہ کے حوالوں اور اقتباسات میں کتر بیونت کے نمونے بھی دکھائے گئے ہیں۔ یہ کتاب اس فن کے پرانے ماہر مولانا محمد منظور نعمانی کی

نگرانی میں محنت سے لکھی گئی اور مدلل ہے۔

زلزلہ در زلزلہ :- مرتبہ - مولوی نجم الدین صاحب احیائی تقطیع خورد،

کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۱۰ مجلد مع گردپوش، قیمت ہے پیسے

پتہ - ہلال بکڈپو - مبارکپور - اعظم گڈھ - یو - پی۔

یہ کتاب بھی زلزلہ کے رد میں لکھی گئی ہے، اور تقریباً ان ہی مباحث پر مشتمل ہو

جو سابق کتاب میں درج ہیں، اس میں حوالے اور اقتباسات کی غلطیوں پر زیادہ

گرفت کی گئی ہے، اس لئے جذباتی انداز اور مناظرانہ رنگ بہت نمایاں ہوگیا ہے

اور کہیں کہیں تو وہی لب و لہجہ اور رکیک انداز اختیار کیا گیا ہے، جس کی اس طبقہ

سے جس کے رد میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، شکایت کی گئی ہے، مصنف نے دارالمصنفین

کو اس کی اور علامہ شبلی نعمانیؒ کی کتابوں کے بارے میں صاحب زلزلہ کے حلقہ کے

خیالات نقل کرکے خاص طور پر متوجہ کیا ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

دارالمصنفین کو گذشتہ ساٹھ سال سے اس حلقہ کے علاوہ بعض دوسرے حلقوں

کی جانب سے بھی اسی طرح کی باتیں سننی پڑ رہی ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ

ان فضول بحثوں کو نظر انداز کرکے اپنے مفید اور ضروری کاموں ہی میں لگا ہوا

ہے۔ اگر مسلمان اپنے باہمی اختلافات ہی میں الجھ کر اپنی صلاحیتیں ضائع کرتے رہے

تو آنے والا دور ان کے لیے آج کے دور سے بھی زیادہ سخت ہوگا ۔ ع

ع ڈرو اُس سے جو وقت ہے آنیوالا

طنزیات و مقالات :- مرتبہ - جناب محی الدین صاحب بدایونی متوسط

تقطیع، کاغذ کتابت اچھی، صفحات۔ قیمت مٹیں روپیہ۔ شایع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

سید محفوظ علی بدایونی مرحوم علی گڑھ کے لائق فرزند، اردو کے ممتاز اہل قلم اور طنز و ظرافت میں بڑے صاحب کمال تھے، مولانا محمد علی مرحوم سے بڑا تعلق رکھتے تھے اور انکے انگریزی اور اردو اخباروں کامریڈ اور ہمدرد کے انتظام و انصرام میں بڑے دخیل بھی تھے، ہمدرد میں تجاہل عامیانہ کا عنوان انہی کی جدت قلم کا نتیجہ تھا انکا تحریری سرمایہ کم ہے تاہم جو کچھ ہے ادب عالیہ کا نمونہ ہے ۱۹۵۶ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے انکے انیس مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا اب سید صاحب کے ہم وطن اور عقیدت مند محی الدین صاحب بدایونی نے بڑے سلیقہ سے تقریباً تین درجن مضامین کا یہ نیا مجموعہ شایع کیا ہے جو آٹھ حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں مولانا محمد علی مرحوم اور تحریک خلافت سے متعلق اور دوسرے میں مزاحیہ مضامین شامل ہیں آخری دو حصے تحقیقی و تاریخی مضامین کیلئے خاص ہیں بقیہ حصوں میں ایک سفرنامہ، تین افسانے، دو تنقیدی اور زبان سے متعلق مضامین دیئے گئے ہیں، یہ ہمہ رنگ اور مختلف النوع مضامین ادبی رعنائی و لطافت سے معمور اور مصنف کے سنجیدہ و باوقار قلم اور شگفتہ و دلکش طرز تحریر کا نمونہ ہیں، ابتدا میں مرحوم کے حالات و کمالات سے متعلق تین مفید مضامین درج ہیں سید محفوظ علی مرحوم جن فرضی ناموں سے اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھتے تھے لائق مرتب نے اپنے مضمون میں ان سب کی مفصل وضاحت کر دی ہے، سید صاحب کے فرزند جناب سید امین علی اور مولانا ضیاء احمد بدایونی مرحوم کے مضامین میں مرحوم کے خاندانی حالات، روزمرہ زندگی کے واقعات، اخلاق و عادات، شرافت و بیداری اور ادبی و علمی ذوق کی پختگی وغیرہ کا ذکر ہے، اس مجموعہ میں "حدیث دیگراں" کے عنوان سے مشاہیر علم و ادب کے تاثرات بھی نقل کیے گئے ہیں لیکن انکو یکجا اور علحدہ نقل کرنے کے بجائے موقع و محل کے لحاظ سے ہر حصہ مضامین کے ساتھ شامل کیا گیا ہے، مولانا محمد علی، مولوی عبدالحق، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر اقبال، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، رشید احمد صدیقی، حفیظ جالندھری، قاضی عبدالغفار، سید ہاشمی فرید آبادی، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، ابواللیث صدیقی، عبادت بریلوی وغیرہ متعدد ارباب کمال کے تاثرات سے اس مجموعہ کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اردو کے بعض نامور ارباب علم و قلم کو انکے تحریری سرمایے کی کمی کے باوجود بڑی شہرت و اہمیت حاصل ہے، سید محفوظ علی بدایونی کا شمار بھی اسی زمرہ میں ہونا چاہئے مگر افسوس انکو خاطر خواہ شہرت نہ ملی، ایسے باکمال ادیب کے ادب پاروں کو تلاش و جستجو سے مرتب کر کے شایع کرنا ایک مفید ادبی خدمت ہے، اسکیلئے لائق مرتب ارباب ذوق کے شکریے کے مستحق ہیں۔ "ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبیؐ، سیر الصحابہؓ و تاریخ اسلام کے علاوہ دارالمصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں

دینِ رحمت

بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے ہیں وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا۔ اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت دس آنے شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا۔ انہی کی مولانا عبدالسلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں ان کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ان کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں قیمت:- ۶ روپیہ ۲۵

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد ان میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے قیمت: ۶ روپے پچاس پیسے

مؤلفہ قاضی تلمذ حسین مرحوم

"نیچر"

نمبر ۵ جلد ۱۱٦

نومبر ۱۹۷۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن ۔ عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۱۶ ماہ نومبر ۱۹۷۵ء مطابق ماہ ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ عدد ۵

مضامین

شذرات — عبدالسلام قدوائی ندوی — ۳۲۲-۳۲۴

مقالات

یہود اور قرآن مجید — ضیاء الدین اصلاحی — ۳۲۵-۳۴۴

حافظ یزید بن ہارون اسلمی — حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی رفیق دارالمصنفین — ۳۴۵-۳۶۰

عربی شاعری مغلوں کے عہد میں — مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم — ۳۶۱-۳۷۵

پچاسی سالہ جشن تعلیمی ندوۃ العلماء لکھنؤ — حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی — ۳۷۶-۳۹۹

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۴۰۰

شذرات

ندوہ کے ہشتاد و پنجسالہ تعلیمی جشن کا ذکر ان اوراق میں آچکا ہے، ۳۱ اکتوبر کو شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کی صدارت میں اس جشن کا آغاز ہوا، اور ۳ نومبر تک اس کا سلسلہ جاری رہا، ان چار دنوں میں مختلف دینی، علمی اور ثقافتی مسائل پر بحث ہوئی، اس بین الاقوامی اجتماع میں ایشیا اور افریقہ کے متعدد ملکوں کے اہل علم و نظر اور صاحب رسوخ و اثر اصحاب نے شرکت کی اور انھوں نے ہندوستانی علماء اور زعماء، ماہرین تعلیم و تربیت، اور مصلحین تہذیب و معاشرت کے ساتھ بہت سے تعلیمی و تہذیبی مسائل پر غور و خوض کیا، تقریریں ہوئیں، مقالات پڑھے گئے، اور تجویزیں پیش کی گئیں، ان تبادلۂ خیال سے بحث و نظر کے بہت سے نئے گوشے سامنے آئے، ذہن و دماغ میں نئے خیالات ابھرے، فکر و عمل کے نئے میدان سمجھ میں آئے، اور اشتراک و تعاون کی نئی صورتیں نظر آئیں،

اس اجتماع میں جو فکر انگیز خیالات ظاہر کئے گئے، ان میں شاید سرفہرست وہ تجویز ہے جس میں مشورہ دیا گیا ہے کہ تعلیم کی دوئی دور کی جائے، اور ثنویت کے بجائے اس میں وحدت پیدا کی جائے، آج مدتوں سے ہماری تعلیم دین و دنیا کے دو خانوں میں بٹی ہوئی ہے، اور دینی و دنیاوی درسگاہیں علیحدہ علیحدہ قائم ہیں، اس دوعملی نے قوم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، اور ذہن و دماغ کے دو ایسے سانچے بن گئے ہیں، جن کے ربط و اتصال کی کوئی گنجایش نہیں ہے، ہر ایک کے غور و فکر کا رنگ جدا، اور عمل کا ڈھنگ الگ ہے، دیندار دنیا کے معاملات سے ناآشنا اور زمانہ کے تقاضوں سے بے خبر ہیں، اور دنیا دار دینی تعلیمات سے ناواقف اور روحانی ضرورتوں سے لاعلم ہیں، اس ناواقفیت اور لاعلمی نے ہماری زندگی کی اخلاقی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے، اور اس ناآشنائی و بے خبری نے رہنمائی و رہبری کی صلاحیت باقی نہیں رکھی، دیندار مجبور اور

دلّیا وہ سب بند ہو گئے، اس جمود، بے عملی و بے نوری نے قلب پر راہِ عمل گم کر دی ہے اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ

ع ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں

اسلام دین و دنیا کی تفریق سے نا آشنا ہے، وہ محض حمد و ثنا کے ترانوں پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ احکامِ دین کا نفاذ بھی کرتا ہے، وہ بندگی کی تعلیم بھی دیتا ہے اور بندہ نوازی کی بھی، وہ جسم کی تازگی کے ساتھ روح کی بالیدگی کا بھی طالب ہے، وہ دنیا کو ترک کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ اُسے مطیۃ الآخرۃ (آخرت کی سواری) بنانے کا مشورہ دیتا ہے، اسی بنا پر شروع میں نصاب نظامِ تعلیم میں دین کے ساتھ دنیا کے تقاضوں کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا لیکن بعد میں یہ جامعیت باقی نہیں رہی، اور دینی و دنیاوی تعلیم کے حلقے الگ الگ ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا پر دین کی سیادت قائم نہ رہی، اور دنیاوی معاملات مذہب کی گرفت سے آزاد ہو گئے، آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک طرف دنیا کا انتظام کرنے والوں کو شریعت کا دائرہ تنگ نظر آنے لگا اور وہ محسوس کرنے لگے کہ مذہب زندگی کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لئے اسے صرف عبادت گاہوں تک محدود رہنا چاہئے، اور دوسری طرف اہلِ مذہب اربابِ دنیا کو الحاد سے ہمکنار سمجھنے لگے،

ندوۃ العلماء نے اس صورتِ حال کو محسوس کیا اور دین و دنیا کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو از سرِ نو استوار کرنے کی کوشش کی لیکن حالات کی ناسازگاری نے اس کوشش کو پورے طور پر کامیاب نہ ہونے دیا، مگر اس جلاس کے بعد ایسی امید ہو چلی ہے کہ بانیانِ ندوہ کی یہ آرزو پوری ہو، اس سلسلہ میں نصابِ تعلیم پر از سرِ نو نظر ڈالنا پڑے گی، اور دینی و دنیوی علوم کو اس طرح سمونا پڑے گا کہ دونوں میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے، اس کے ساتھ اونچی سطح پر اسلامی علوم کے مطالعہ و تحقیق کا ایسا انتظام کیا جائے، اس کے بعد تفسیر و حدیث اور فقہ و کلام میں ایسے صاحبِ نظر علماء پیدا ہو سکیں جو زمانہ کے تقاضوں سے باخبر اور اسلامی ماخذوں سے پورے طور پر واقف ہوں اور ان کے اندر اسلامی اصول کو حالات پر منطبق کرنے کی صلاحیت ہو تاکہ وہ ابنائے عصر سے اُن کی زبان میں بات کر سکیں، اور اربابِ کار کو شریعت کی وسعت و جامعیت کا یقین دلا سکیں،

مولانا محمد میاں سے ناظرین معارف بخوبی واقف ہیں، ان کی علمی و عملی خدمات محتاج تعارف نہیں، وہ [illegible] شریعت و مسلک رندانِ عشق کے قائل تھے، انھوں نے علمی شغف اور قومی خدمت کو اپنی زندگی میں سمو لیا تھا، مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف کیلئے سکونِ قلب اور فراغ خاطر ضروری سمجھا جاتا ہے، لیکن محمد میاں نے سیاست کے پرشور ہنگاموں اور قید و بند کی پریشانیوں میں یہ منزل طے کی ہے، انھوں نے کبھی دار و رسن کا خوف کیا نہ آبلہ پائی کا گلہ، وہ مطالعہ میں مصروف ہوتے یا درس و تدریس میں منہمک یا خاندانی مشاغل میں مشغول، جیسے ہی جنگ آزادی کا بگل بجتا میدان میں نکل آتے، اور اس کی ہر پریشانی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے، وہ زندگی بھر اسی روش پر چلتے رہے، سیاست کے ساتھ تقویٰ پر عمل بہت مشکل ہے، مگر انھوں نے سیاسی زندگی کو پاکیزگی سے کبھی جدا نہیں ہونے دیا، اُن کی خدمت بے لوث اور ان کی سیرت بے داغ تھی، جماعتی زندگی میں کشمکش عام ہے، ہر شخص سیادت کا طالب ہوتا ہے، لیکن ان کا دامن اس عیب سے پاک تھا، انھوں نے اپنے مفاد پر جماعت کے مفاد کو ہمیشہ مقدم رکھا، اور اس ایثار میں ہر پریشانی کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے رہے، افسوس ہے کہ علم و عمل اور ایثار و خدمت کا یہ مجسمہ دنیا سے رخصت ہو گیا، اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے، اور دوسروں کو اُن کی پاکیزہ اور پُرخلوص زندگی کو نمونۂ عمل بنانے کی توفیق عطا فرمائے،

شورش کاشمیری کی وفات بھی بڑا سانحہ ہے، انکی نشو و نما آزادی ہند کی جد و جہد کے دوران ہوئی، انھوں نے آزادی وطن کے علمبرداروں کے ساتھ زندگی کا بڑا حصہ گزارا، مولانا آزاد، عطاء اللہ شاہ بخاری، اور مولانا ظفر علی خاں سے انھیں گہرا تعلق تھا، ملک کی تقسیم سے پہلے اُن کا قیام لاہور میں تھا، آزادی کے بعد وہ وہیں رہ گئے، لیکن انھیں وہاں کبھی اطمینان نصیب نہیں ہوا، اُن کی زندگی کا بڑا حصہ جیلوں میں بسر ہوا، کبھی کبھی دار و رسن کا خطرہ بھی ہوا، مگر اُن کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہیں ہوئی، وہ بڑے قادر الکلام شاعر اور پرزور خطیب تھے، اُن کا زور بیان اور حسن کلام مولانا ظفر علی خاں کی یاد دلاتا تھا، اعلانِ حق میں بڑے جری تھے، اور اس راہ میں شدائد و مصائب سے کبھی ہراساں نہیں ہوئے، زندگی بھر تکلیفیں برداشت کرتے رہے مگر کبھی باطل سے سمجھوتہ نہیں کیا، وہ دار المصنفین کے بڑے ہمدرد اور بہی خواہ تھے، اور اس کی خدمت و اعانت کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے،

اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے، اور اُن کی حق گوئی کا پورا صلہ عطا فرمائے،

مقالات

یہود اور قرآن مجید

از

ضیاء الدین اصلاحی

قرآن مجید میں تذکیر و استدلال کے لئے گذشتہ قوموں کا اکثر ذکر کیا گیا ہے، اُس نے یہود[1] کے واقعات سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں، اس مضمون میں اس صحیفۂ عبرت کے کچھ اوراق قرآن مجید کی روشنی میں روشن کئے جاتے ہیں، اس سے یہود کی گذشتہ اور موجودہ تصویر سامنے آئے گی اور یہ اندازہ ہوگا کہ خدا کی اس محبوب اور روئے زمین کی سب سے مقدس اور برگزیدہ قوم کو اس کے گوناگوں عظیم الشان احسانات کی ناقدردانی کے نتیجہ میں کیا کیا خمیازے بھگتنے پڑے، اور وہ کیسی کیسی ذلتوں اور رسوائیوں سے دوچار ہوئی، اور شکست و ریخت کے کن مراحل سے گذری،

---

[1] حضرت ابراہیمؑ کی بیوی حضرت سارہؓ کے بطن سے جو نسل چلی اس کو قرآن نے بنی اسرائیل کہا ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند حضرت اسحاق ؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا، یہ لوگ شام میں آباد تھے، قدیم فلسطین شام کا جز تھا، بنی اسرائیل ایک قومی و نسلی اصطلاح ہے، جو مذہبی حیثیت سے یہود کہلاتے ہیں،

اس سلسلہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات کا ذکر کیا جاتا ہے جو اُس نے یہود پر کئے تھے، یہود پر اللہ نے بیشمار انعامات کئے تھے، ذیل میں چند نمایاں اور غیر معمولی انعامات کو نمبروار پیش کیا جاتا ہے،

۱- ہدایت و شریعت کا انعام | یہود پر خدا نے سب سے بڑا فضل و انعام یہ کیا تھا کہ اُن کو اپنی ہدایت و شریعت کی عظیم الشان نعمت عطا کی تھی، چنانچہ فرمایا،

یابنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی	اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو
انعمت علیکم واوفوا بعهدی	یاد کرو جو میں نے تم پر کی، اور میرے
اوف بعهدکم وایای فارهبون	عہد کو پورا کرو، تو میں تمہارے عہد کو
(بقرۃ ۵ - ۴۰)	پورا کروں گا، اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو،

مذکورۂ بالا آیت میں نعمت سے خدا کی ہدایت و شریعت کی نعمت مراد ہے، جو دراصل ان کے اور بنی اسرائیل کے درمیان ایک معاہدہ تھی، اور جس پر مضبوطی سے قائم رہنے کا اُن سے مطالبہ کیا گیا ہے، وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں تھے، ان دونوں اولوالعزم پیغمبروں نے اُن کو اسی ہدایت خداوندی کو اختیار کرنے کی وصیت اور تاکید کی تھی، ارشاد ہوتا ہے:

ووصّٰی بها ابراهیم بنیه و	اور ابراہیمؑ نے اسی (ملت ابراہیمی
یعقوب یابنیّ انّ الله اصطفٰی	و ہدایت خداوندی) کی وصیت
لکم الدّین فلاتموتنّ الّا و	اپنے بیٹوں کو کی، اور اسی کی وصیت
انتم مسلمون ام کنتم شهداء	یعقوب نے بھی اپنے بیٹوں کو کی تھی
اذ حضر یعقوب الموت اذ	کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے
قال لبنیه ما تعبدون من	لئے دین اسلام کو منتخب کیا، سو تم نہ

بعدی قالوا نعبد الٰهك و
اله آبائك ابراهیم و اسمٰعیل
و اسحٰق الٰهاً واحداً و نحن
له مسلمون ۝
(بقرہ ۱۳۲، ۱۳۳).

مرنا، مگر اسلام کی حالت پر، کیا تم اس
وقت موجود تھے جب یعقوب کی موت
کا وقت آیا جب کہ اس نے اپنے بیٹوں
سے پوچھا تم میرے بعد کس کی پرستش
کرو گے، وہ بولے کہ ہم تیرے معبود
اور تیرے آبا و اجداد ابراہیم اسمٰعیل
اور اسحاق کے معبود کی پرستش کریں گے
جو ایک ہی معبود ہے، اور ہم سب اسی کے
فرمانبردار ہیں،

اس آیت میں حضرت ابراہیم کے ساتھ حضرت یعقوب کی وصیت کو بھی ذکر کرنے اور اس کو زیادہ اہمیت دے کر بیان کرنے کی وجہ یہی ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل تعلق انہی سے تھا، وہ براہ راست ان کی اولاد تھے، چنانچہ انہوں نے بڑی تاکید سے فرمایا، کہ یہ جو عظیم الشان نعمت اور بھاری امانت تم کو ملت ابراہیمی کی صورت میں عطا کی جا رہی ہے، اس کا حق پوری طرح ادا کرنا، اور اس سے کسی حال میں بھی بے پروا نہ ہونا، خواہ اس راہ میں کتنی ہی آزمائشیں کیوں نہ پیش آئیں تمہیں بہرحال اسی ہدایت خداوندی اور شریعت الٰہی پر قائم رہنا اور ملت ابراہیمی پر مرنا اور جینا ہے،

خداوند قدوس نے یہود کو ہدایت و شریعت کی نعمت ہی نہیں بخشی تھی، بلکہ اس پر قائم اور استوار رکھنے کے لئے ان کے اندر پے در پے انبیا و رسل مبعوث کئے، اور نبوت و رسالت کا ایک طویل سلسلہ اُن کے اندر جاری کیا، وہ حضرت ابراہیم و اسحاق اور یعقوب علیہم السلام

کی تو اولاد ہی میں تھے، ان کے بعد بھی یہود کے درمیان متعدد انبیاء مبعوث ہوئے، حضرت موسیٰ سے حضرت مسیح تک رسولوں کا ایک وسیع سلسلہ گذرا ہے، فرمایا:-

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰا	اور یاد کرو جب کہ حضرت موسیٰؑ
قَوْمِ اذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ	نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تو
عَلَیْکُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ	اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو کہ
(مائدہ - ۲۰)	اس نے تم میں نبی اٹھائے،

خود حضرت موسیٰؑ کی بعثت کو بھی خدا نے اپنی نعمت بتایا ہے، جو بنی اسرائیل کو ہدایت الٰہی اور نعمت خداوندی سے وابستہ رکھنے اور کفر و شرک کی ضلالت سے بچانے کے لئے ہوئی تھی ارشاد ہوتا ہے،

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ	اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں
اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ	کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں
اِلَی النُّوْرِ (ابراھیم - ۵)	سے روشنی کی طرف نکالو!

حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے جو کتاب دی تھی، وہ بھی سراپا صحیفۂ ہدایت و بصیرت اور خدا کی عظیم الشان نعمت ہی تھی، تاکہ اس کو اختیار کرکے وہ لوگ ملت ابراہیمی اور دین حنیف پر قائم رہیں، فرمایا،

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًی	بیشک ہم نے توراۃ اتاری جس
وَّنُوْرٌ یَحْکُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ	میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی
الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ	کے مطابق خدا کا فرمانبردار
هَادُوْا وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ	انبیاء، علماء اور فقہاء یہود

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللّٰهِ وَکَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءَ ، (مائدہ - ۴۴)
کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے، بوجہ اس کے کہ وہ کتاب الٰہی کے امین اور اس کے گواہ ٹھہرائے گئے تھے،

دوسری جگہ الواح توراۃ کے متعلق کہا گیا ہے،

وَلَمَّا سَکَتَ عَنْ مُّوْسَی الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ وَفِیْ نُسْخَتِهَا هُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ یَرْهَبُوْنَ ، (اعراف - ۱۵۴)
اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوا تو اس نے تختیاں لیں، اور اس کے نوشتہ میں ہدایت و رحمت ہے، ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں،

ان آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہود کے اندر گوناگوں انبیاء کا مبعوث کیا جانا، اور ان کو ہدایت و شریعت سے سرفراز کرنا ایک اہم خدائی انعام تھا،

۲- دنیا والوں پر فضیلت و برتری | یہود پر اللہ تعالیٰ کا دوسرا زبردست احسان یہ تھا کہ ان کو ساری دنیا کے لوگوں پر فضیلت و برتری عطا کی گئی تھی، وہ روئے زمین کی سب سے برگزیدہ قوم اور خدا کے سب سے محبوب بندے تھے، قرآن مجید نے اس فضلِ خداوندی کا ذکر کئی جگہ کیا ہے، سورہ بقرہ میں فرمایا :-

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (بقرہ - ۴۷)
اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی، اور اس بات کو میں نے تمھیں دنیا والوں پر فضیلت دی

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دینی سیادت و امامت کی طرح ان کو دنیاوی عزت و وجاہت سے بھی پوری طرح نوازا تھا، اور وہ ان دونوں حیثیتوں سے تمام اقوام عالم میں ممتاز تھے، ملاحظہ ہو،

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ	اور بیشک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب
الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ	حکومت اور نبوت عطا کی، اور اُن
وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ	کو پاکیزہ روزیاں دیں، اور دنیا
وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ،	والوں پر اُن کو فضیلت بخشی،

(جاثیہ - ۱۶)

بنی اسرائیل نے جب حضرت موسیٰؑ سے اپنی شرکت و بت پرستی کی تمنا ظاہر کی تو انھوں نے کہا خدا کے برگزیدہ بندے ہونے کے باوجود یہ کیسی بیہودہ باتیں اور لغو خواہش پوری کر رہے ہو،:-

اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ	کیا میں تمھارے لئے اللہ کے سوا
فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ،	کوئی اور معبود ڈھونڈوں در آنحالیکہ
(اعراف - ۱۴۰)	وہی ہے جس نے تم کو اہل عالم پر
	فضیلت بخشی،

اُن کو ہدایت و شریعت کی نعمت اس لئے بخشی گئی تھی، کہ وہ اس پر کاربند ہو کر دنیا و آخرت کے فوز و فلاح کے مستحق بن جائیں، اور توحید خالص اور دین حق کے علمبردار ہو کر دنیا کی امامت و فرمانروائی کے منصب جلیل پر فائز رہیں، اور ایمان و یقین کی بدولت ہر قسم کی ذلت و محکومی سے نجات پا جائیں، چنانچہ جب ان کو یہ امتیاز بخشا گیا تھا کہ اُنکے درمیان

سلسلہ انبیاء و مرسلین مبعوث ہوتے رہے ہیں ان میں ملوک و امراء بھی برابر پیدا ہوتے رہے،

وَاِذْ قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِہٖ یٰقَوْمِ	اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم
اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللہِ عَلَیْکُمْ	سے کہا، اے میرے ہم قوم! اپنے
اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ	اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو کہ اس
مُّلُوْکًا وَّاٰتٰکُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ	نے تم میں نبی اٹھائے، اور تم کو بادشاہ
اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ،	بنایا، اور تم کو وہ کچھ بخشا جو دنیا والوں
(مائدہ - ۲۰)	والوں میں سے کسی کو نہیں بخشا،

یعنی نبوت و رسالت کی طرح اُن کو حکومت و سلطنت بھی بخشی گئی تھی، اور وہ عرصہ دراز تک خدا کی ان دونوں عظیم الشان نعمتوں سے بہرہ ور رہے، امت مسلمہ کے ظہور سے پہلے وہی منصب امانت و شہادت حق پر مامور تھے، ان کے سوا اور کسی قوم کو یہ دینی پیشوائی و برتری، اور دنیاوی اعزاز و وجاہت اور قوموں کی ہدایت و رہنمائی کا مقام جلیل حاصل نہیں تھا،

یہ واضح رہے کہ یہود کے ساتھ خدا نے فضل و احسان کا یہ جو عظیم الشان معاملہ کیا تھا، وہ اس کا کوئی اندھا دھند فیصلہ نہ تھا، بلکہ اس کے علم و حکمت کا نتیجہ اور ایک مناسب انتخاب تھا،

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰھُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی	اور ہم نے علم و واقفیت کے ساتھ
الْعٰلَمِیْنَ،	ان کو دنیا والوں کی رہنمائی کیلئے
(دخان - ۳۲)	منتخب کیا تھا،

۳۔ فرعون کے غلاموں سے نجات | بنی اسرائیل پر خدائی انعامات کی فہرست میں ایک بڑا انعام

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو فرعون جیسے جابر و قاہر حکمران کے ظلم و تشدد سے چھٹکارا دلایا، فرعون اُن کو نہایت حقیر و ذلیل، پست، اور گھٹیا سمجھتا تھا، اور اُن سے ہر قسم کی خدمت اور بیگاری کے کام لیتا تھا، حد یہ تھی کہ وہ اُن کے بچوں کو قتل کرا دیتا تھا، خدا نے بنی اسرائیل کی اس محکومانہ زندگی اور فرعون کے جبر و تشدد کا قرآن حکیم میں کئی جگہ ذکر کر کے ان پر اپنا احسان جتلایا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وَاِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ	اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم کو آلِ
يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ	فرعون کے قبضہ سے چھڑایا، وہ تمھیں
يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ	بُرے عذاب چکھاتے تھے، تمھارے
نِسَاءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ	بیٹوں کو ذبح کرتے، تمھاری عورتوں
رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ	کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمھارے
(بقرہ - ۴۹)	رب کی طرف سے بڑی ہی آزمائش تھی،

بنی اسرائیل کی تاریخوں سے بھی معلوم ہوتا ہے، کہ ان پر مصر میں شدید مظالم ڈھائے جا رہے تھے، اور اُن کو طرح طرح کی ذلتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، توراۃ کا بیان ہے،

"مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی، اور انھوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت کھیت کی کروا کے اُن کی زندگی تلخ کی، ان کی ساری خدمتیں جو وہ اُن سے کراتے تھے، مشقت کی تھیں،"

قرآن مجید نے مصر کے قبطیوں اور فرعون و آلِ فرعون کے تمام مظالم اور بدسلوکیوں کی تصویر صرف ایک ہی مختصر اور جامع فقرہ میں اس طرح کھینچ دی ہے،

يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ ۝	وہ تمھیں بُرے عذاب چکھاتے تھے،

بنی اسرائیل کے لئے جو اپنی تاریخ کے ان واقعات سے اچھی طرح واقف تھے، اسی ایک مختصر اور بلیغ نقرہ نے تفصیلات کا پورا دفتر کھول دیا ہوگا پھر اس ظالمانہ سلوک کے قرآن نے دو نمونے بیان کئے ہیں کہ وہ ان کے لڑکوں کو قتل کرکے نسل کشی کر رہے تھے، اور لڑکیوں کو زندہ باقی رکھتے تھے، قرآن کی بلاغت نے اس موقع پر لڑکیوں کے بجائے نساء (عورتوں) کا لفظ استعمال کرکے بنی اسرائیل کو غیرت اور طیش دلایا ہے، پھر فرمایا:-

وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ	اور اس میں تمھارے خداوند کی جانب سے بڑی آزمایش تھی،

تاکہ بنی اسرائیل کو خدا کے غیر معمولی فضل وکرم کا پوری طرح احساس ہو کہ اس نے کیسی شدید ابتلاء و آزمایش، اور سخت جبر و قہر اور رسواکن عذاب سے اُن کو نجات دلائی تھی، اسی لئے سورۂ دخان میں فرمایا:-

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ مِنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰۗــؤٌا مُّبِيْنٌ، (دخان - ۳۰ - ۳۳)	اور ہم ہی نے بنی اسرائیل کو ذلت کے عذاب سے نجات دی، بیشک وہ سرکش اور حد سے آگے بڑھنے والا تھا، اور ہم نے دیکھ بھال کر بنی اسرائیل کو دنیا والوں کی رہنمائی کے لئے منتخب کیا تھا، اور ہم نے اُن کو ایسی نشانیاں عطا کی تھیں، جن میں صریح آزمایش تھی،

۴- فرعون کی عبرتناک تباہی و بربادی | اسی ضمن میں بنی اسرائیل پر خدا کا یہ انعام واحسان

بھی تو یہی ذکر ہے کہ اس نے اولاد کو فرعون کے مظالم سے نجات دلانے کے بعد اس کو اور اس کے متبعین اور اعوان و انصار کو نہایت ہی عبرتناک طور پر ہلاک و برباد کر دیا، یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت اور رحمت و عدل کا ایک اہم باشان واقعہ تھا جس کو بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا، وہ نہایت مظلوم اور بے سروسامان تھے، پھر اس بے سروسامانی و مظلومی کے باوجود محض خدا کے فضل و رحمت سے انھوں نے آسانی کے ساتھ سمندر کو پار کر لیا، لیکن ان کا تعاقب کرنے والا فرعون اور اس کا لشکر جرار دولت و قوت اور اقتدار کے نشہ میں سرشار تھا، مگر اس کے باوجود وہ خدا کے قہر و غضب کا نشانہ بن گیا، اور سمندر کی لہروں کی لپیٹ میں آکر غرق ہو گیا، فرمایا،

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ، (بقرہ - ۵۰)

اور یاد کرو جب کہ ہم نے دریا کو پھاڑ کر تمھیں پار کرایا، پس تمھیں نجات دی اور آلِ فرعون کو غرق کر دیا، اور تم (اس واقعہ کو) دیکھتے رہے،

"وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ" کا مدعا یہ ہے کہ بنی اسرائیل اپنے وطن مصر کو چھوڑ کے لئے نکلنے والے زبردست اور قاہر دشمن اور اس کے عظیم الشان لشکر کی دستبرد سے نجات پانے اور چشم زدن میں اس کی ہلاکت و بربادی کا جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا، ساحل پر کھڑے ہو کر بچشم خود مشاہدہ کر رہے تھے، توراۃ میں ہے کہ

"اسرائیلیوں نے مصریوں کی لاشیں دریا کے کنارے پر دیکھیں،"

(سفر خروج - ۳۱-۱۴)

بنی اسرائیل سالہا سال سے فرعون کے مظالم انگیز کر رہے تھے، جب خدا نے موسیٰ

کی غلامی سے نجات دینے کے لئے اُن کو ہجرت کرنے کا حکم دیا، تو وہ حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں مصر سے اپنے آبائی وطن شام و فلسطین جانے کے لئے چھپ کر رات کے وقت نکلے، جیسا کہ دوسری جگہ ہے:۔

فاسر بعبادی لیلا انکم	سو میرے بندوں کو رات میں
متبعون واترك البحر رهوا	لے کر چلو، بیشک تم لوگوں کا پیچھا کیا
انهم جند مغرقون ٥	جائے گا، اور سمندر کو ساکن چھوڑدو
(دخان ۲۳ و ۲۴)	یہ ڈوبنے والی فوج ہے،

فرعون کو اُن کی روانگی کا علم ہوا تو اُس نے پیچھا کیا بنی اسرائیل نے فرعون کو لشکر سمیت آتے دیکھا تو بہت گھبرائے، حضرت موسیٰؑ نے ان کا اضطراب اور گھبراہٹ دور کرنے کے لئے تسلی دی، اور وحی الٰہی کے ایما سے اُن کو بے خوف و خطر سمندر میں چل پڑنے کا حکم دیا، سمندر کا پانی سمٹ کر دونوں طرف پہاڑ جیسی دیواروں کی طرح کھڑا ہو گیا، اور درمیان میں خشک راستہ نکل آیا، اس طرح اسرائیلیوں کا قافلہ سمندر پار کر گیا، یہ صورت دیکھ کر فرعون اور اس کی قوم بھی سمندر پار کرنے کے لئے اس میں گھس پڑی، لیکن ابھی وہ اس کے درمیان ہی میں تھی کہ پانی کی کھڑی دیواریں

ملہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بڑے لڑکے حضرت اسمٰعیلؑ اور اُن کی والدہ حضرت ہاجرہؑ کو وادی غیر ذی زرع (مکہ) میں لیجا کر چھوڑا، جہاں اُن کی نسل خوب پھلی پھولی، اور دوسرے لڑکے حضرت اسحاقؑ اور اُن کی والدہ حضرت سارہؑ کو شام و فلسطین کی سرزمین میں آباد کیا، حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کو کنوئیں میں ڈال دیا، اس سے نکال کر قافلہ والوں نے ان کو مصر میں فروخت کر دیا، یہیں بالآخر اُن کے دوسرے بھائی اور والدین بھی پہنچ گئے، اس طرح بنی اسرائیل مصر میں آباد ہو گئے تھے، حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں ان کو پھر اپنے آبائی وطن جانے کا حکم دیا گیا،

آپس میں مل گئیں، اور سمندر کا پانی پہلے کی طرح پھر رواں ہوگیا، چنانچہ بنی اسرائیل کی نگاہوں کے سامنے فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق ہوگیا، ڈوبتے وقت اس نے ایمان قبول کرنا چاہا، مگر اس وقت اس کا ایمان خدا کی بارگاہ میں مقبول نہ ہوسکا، اور خدا نے اسکے جسم کو مرقع عبرت بنا کر باقی رکھا، سورۂ یونس اور سورۂ دخان میں اس کے غرق ہونے کی یہ تفصیل موجود ہے؛

توراۃ کے باب خروج میں اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان ہوئی ہے:۔

"پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا، اور خداوند نے رات بھر پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا، اور پانی دو حصے ہوگیا، اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہو کر گذر گئے، اور پانی اُن کے داہنے اور بائیں دیوار تھی؛

اور باب تثنیہ میں ہے:۔

" اور اُس نے مصر کا لشکر اور اُن کے گھوڑوں اور رتھوں کا کیا حال کیا، اور کیسے اُس نے بحر قلزم کے پانی میں اُن کو غرق کیا جب وہ تمہارا پیچھا کر رہے تھے؛ اور خداوند نے اُن کو کیسا ہلاک کیا، کہ آج کے دن تک وہ نابود ہیں"

اس خدائی اہتمام اور قدرت کے تصرفات پر کے عجائبات پر غور کیجئے کہ جس مقام سے بنی اسرائیل کے لئے خشک راستہ ہوگیا تھا، اور انھوں نے نہایت آسانی سے سمندر پار کرلیا تھا، اسی مقام سے جب فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ گذرنا چاہا، تو وہ اپنے لشکر سمیت ڈوب گیا، اس کے غیر معمولی جاہ و جلال کے باوجود اس کا یہ انجام کس قدر عبرتناک ہے، آخری وقت میں وہ اس ایمان اور ہدایت خداوندی کو قبول کرنے پر بھی آمادہ ہوگیا تھا، جس کو قبول کرلینے پر اُس نے ساحرین مصر کو دھمکایا تھا لیکن آج دوسروں کو قتل کی

دھمکیاں دینے والا خود خدا کے قہر و انتقام کی زد میں آکر لوگوں کے لئے سامان صد عبرت بن گیا،

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ	پس جب ان لوگوں نے ہم کو غصہ
فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ فَجَعَلْنٰهُمْ	دلایا، تو ہم نے اُن سے بدلہ لیا، اُن
سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ۝	ان سب کو ڈبو دیا، اور اُن کو بعد
(زخرف ۵۵-۵۶)	میں آنے والوں کے لئے سرگذشت اور

کہاوت بنا دیا،

قرآن نے فرعون کی ہلاکت کے ضمن میں ایک اور اہم نکتہ کی جانب اشارہ کیا ہے، اس کو اپنی قوم اعوان و انصار، آل و اتباع اور لاؤ لشکر پر بڑا بھروسہ اور اپنی دولت و ثروت اور قوت و اقتدار پر بڑا ناز تھا، اسی زعم میں وہ اپنی عظمت و شوکت اور قوت و برتری کو بہت فخر سے بیان کیا کرتا تھا، اور بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ کا بڑی حقارت اور تمسخر سے ذکر کرتا تھا، لیکن اس کی ساری رعونت خاک میں مل گئی، اور اس کا غرور پاش پاش ہو گیا، نہ اعوان و انصار کی جماعت اور لہلہاتے باغ اور سرسبز و شاداب کھیتیاں اس کے کچھ کام آئیں، اور نہ اُس کی قوت و اقتدار اور مصر کی سلطانی و فرمانروائی نے اُس کو کوئی فائدہ پہنچایا، اتنے جابر و قاہر حکمران اور ایسی عظیم الشان حکومت و سلطنت کے فرمانروا پر کوئی شخص آنسو بہانے والا اور غم کرنے والا نہ تھا، اس عبرتناک انجام کو خود قرآن ہی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے،

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ	انھوں نے چھوڑے کتنے باغ، کتنے
وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ	چشمے کتنی کھیتیاں، کتنے عمدہ مکانات
كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ	اور کتنے آرام کے ساز و سامان جن میں

وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ فَمَا
بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ
وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِیْنَ ○
(دخان-۲۵-۲۹)

مزے سے رہتے تھے، ایسا ہی ہم
مجرموں کے ساتھ کرتے ہیں، اور
ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا
وارث بنا دیا، ان پر نہ آسمان
رویا، اور نہ زمین، اور نہ اُن
کو مہلت دی گئی،

اس تفصیل سے پوری طرح سے اندازہ ہوگیا ہوگا، کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کو نجات دلاکر اور اس کو تباہ و برباد کرکے ان پر کتنا بڑا احسان و انعام کیا تھا،

غلبہ وتمکن فی الارض | اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو غلبہ و تمکن اور زمین کا وارث بناکر ان پر غیر معمولی فضل و احسان کیا تھا، اس کے گذشتہ افضال و عنایات کی طرح یہ انعام بھی نہایت حیرت انگیز طور پر ہوا تھا، کیونکہ بنی اسرائیل کو حقیر و ذلیل، کمزور و ناتواں، بے بس اور بے سہارا خیال کیا جاتا تھا، ان کے مقابلہ میں فرعون کی شان و شوکت اور قوت بہت غیر معمولی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی عجیب کرشمہ سازی سے اقتدار و قوت کے نشہ میں سرشار لوگوں کو ہلاک اور مجبور و مظلوم لوگوں کو غالب کار فرما بناکر دکھادیا کہ کوئی چیز بھی اُس کے قبضہ و قدرت اور ارادہ و اختیار کے دائرہ سے باہر نہیں ہے،

ارشاد ہوتا ہے:-

نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى
وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ
اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ

اور ہم تمہارے سامنے موسیٰ اور
فرعون کے بعض واقعات ٹھیک
ٹھیک بیان کرتے ہیں، ایمان والوں

أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً
مِنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي
نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ
وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ
اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَ
نَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ
الْوَارِثِينَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي
الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ
هَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ
مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ٥
(قصص ۳-۶)

اور بیشک فرعون نے زمین میں
سرکشی کی، اور اس نے لوگوں کی
ٹولیاں کر دی تھیں، ان میں سے
ایک گروہ کو کمزور سمجھتا تھا، اس
کے بیٹوں کو قتل کرتا تھا، اور اُن
کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا،
بیشک وہ فساد برپا کرنے والوں
میں تھا، اور ہم ان لوگوں پر احسان
کرنا چاہتے تھے، جن کو زمین میں کمزور
سمجھا گیا تھا، اور اُن کو سردار اور
وارث بنانا اور زمین میں قبضہ
دلانا چاہتے تھے، اور فرعون اور
ہامان اور ان دونوں کے لشکروں
کو اس چیز کو دکھانا چاہتے تھے جس
سے وہ بچتے تھے،

حضرت موسیٰ اپنی قوم کو فرعون کے مظالم اور جیرہ دستیوں پر صبر و ضبط کی تلقین کرتے تھے اور کہتے تھے، کہ اُس کے قبضہ و اختیار میں کچھ نہیں ہے، سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے، وہ اس سے حکومت و فرمانروائی چھین کر تمہیں دیدے گا، تم اس پر بھروسہ کرو، اور اسی سے مدد چاہو، وہ اپنے بندوں کو بے سہارا نہیں چھوڑ سکتا،

قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِہ اسْتَعِینُوا بِاللّٰہِ	موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے
وَاصْبِرُوا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُورِثُھَا	مدد چاہو، اور ثابت قدم رہو،
مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہ وَالْعَاقِبَۃُ	زمین اللہ کی ہے، وہ جس کو اپنے
لِلْمُتَّقِیْنَ ہ	بندوں میں سے چاہتا ہے، اس کو
(اعراف - ۱۲۸)	اس کا وارث بناتا ہے، اور انجام
	کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے
	والوں ہی کے لئے ہے،

فتح و کامرانی کے اسی دن کا بنی اسرائیل کو نہایت بے چینی سے انتظار تھا، اور وہ اپنی عجلت پسندی، اور بے صبری کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کی شان میں عجیب عجیب گستاخیاں اور نامعقول حرکتیں بھی کیا کرتے تھے، بالآخر خدا کا وعدہ پورا ہوا، اور فرعون کے جاہ و اقتدار کا خاتمہ ہوگیا، اس کے نیست و نابود ہونے کے بعد اللہ نے بنی اسرائیل کو ان کے آبائی وطن فلسطین و شام کی سرزمین میں بسایا، اور تخت و تاج کا وارث بنایا،

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوا	اور جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے، ہم
یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ	نے ان کو اس سرزمین کے مشرق و مغرب
وَمَغَارِبَھَا الَّتِیْ بَارَکْنَا فِیْھَا	کا وارث ٹھہرایا، جس میں ہم نے برکتیں
وَتَمَّتْ کَلِمَۃُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی	رکھی تھیں، اور تیرے رب کا اچھا وعدہ
عَلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ بِمَا صَبَرُوا	بنی اسرائیل پر پورا ہوا، بوجہ اس کے
وَدَمَّرْنَا مَا کَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ	کہ وہ ثابت قدم رہے، اور ہم نے
وَقَوْمُہ وَمَا کَانُوا یَعْرِشُوْنَ ہ	فرعون اور اس کی قوم کی ساری تعمیرات

(اعراف - ۱۳۷) اور اُن کے سارے باغ و چمن ملیا

میٹ کر دیئے،

یہ بھی اللہ کا اللہ سے لطف و کرم ہی کا ایک معاملہ تھا کہ فرعون کی صدیوں کی غلامی سے چھٹکارا پانے کے بعد وہ اس مبارک سرزمین میں پہنچ گئے، جو مادی اور روحانی خیر و برکت کا سرچشمہ تھی یعنی شام و فلسطین کی وہ مقدس سرزمین جو انبیاء و رسلؑ کا گہوارہ تھی، اور جہاں خدا کا پاکیزہ اور بابرکت گھر تھا، علاوہ ازیں یہ سرزمین زرخیزی اور شادابی کے لیے بھی مشہور تھی، اسلیے بنی اسرائیل کو وہاں رزق کی کوئی پریشانی نہ ہوئی،

۲۔ صحرائے سینا میں انعامات اور دھوپ، فاقہ اور پیاس کی تکلیفوں سے بچانے کے خدائی انتظامات

اوپر گذر چکا ہے کہ مصر سے نکال کر اللہ نے بنی اسرائیل کو آباد کرانے کے لیے شام و فلسطین کی سرزمین کا انتخاب کیا تھا، اس سرسبز و شاداب مقام کا انتخاب اسی لئے کیا گیا تھا کہ بنی اسرائیل کو معیشت اور رزق کی جانب سے کسی قسم کی پریشانی لاحق نہ ہو، جیسا کہ فرمایا:-

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ، (یونس ۹۳) اور ہم نے بنی اسرائیل کو اچھا ٹھکانا دیا، اور پاکیزہ رزق بخشا،

اور دوسری جگہ فرمایا:-

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (جاثیہ - ۱۶) اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکومت اور نبوت عطا کی، اور ان کو پاکیزہ رزق دی، اور دنیا والوں پر برتری بخشی،

مگر بنی اسرائیل سے جب اس سرزمین میں داخل ہونے کے لئے کہا گیا تو وہ اپنے بزدلی

کی وجہ سے وہاں جانے کے لئے تیار نہ ہوئے، اور ایسے ڈرے سہمے ہوئے تھے، کہ گویا وہاں کی قومیں اُن کو ہڑپ کر جائیں گی، حالانکہ اُن کے سامنے ابھی فرعون کی عبرت انگیز ہلاکت کا منظر پیش آ چکا تھا، اور یہ علاقہ اللہ اُن کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا، لیکن وہ فلسطینی قوم کی قوت اور زور آوری سے اس قدر مرعوب تھے کہ جس ملک پر قبضہ کرنے کی امنگیں لے کر یہاں تک پہنچے تھے، اس پر قبضہ کرنا تو درکنار پھر مصر پلٹ جانے کی باتیں کرنے لگے، اور انھیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ خدا نے اُن کو اس ملک کی میراث دینے کا قسم کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے، جیسا کہ خود توراۃ میں ہے:

" خداوند نے قسم کھا کر اُن سے وعدہ کیا، کہ میں نے یہ علاقہ تم کو دیا۔"

(باب گنتی : ۱۴)

حضرت موسیٰؑ نے دشت فاران میں اُن کی ہمت و حوصلہ بڑھانے کے لئے بڑی زور دار اور موثر تقریر کی، اس میں ان افضال و عنایات کا حوالہ دیا، جو مصر سے نکلنے کے وقت سے لیکر اب تک برابر سایہ کی طرح بنی اسرائیل کے ساتھ رہے، اور ان قطعی و حتمی وعدوں کا ذکر بھی کیا جو اُن کے درمیان سلسلۂ نبوت جاری کرکے اُن کو ایک عظیم حکمراں قوم بنانے کے لئے، اللہ نے فرمائے تھے، اس میراث کا حوالہ دیا جو ایک شاداب و زرخیز علاقہ کی شکل میں اُن کو ملنے والی تھی، اور جس کو اللہ نے اُن کے لئے لکھ دیا تھا، ان وعدوں اور یقین دہانیوں کے ساتھ اُن کو ارض مقدس پر حملہ کرنے کی دعوت دی، اور بزدلی، پست ہمتی اور کم حوصلگی کے برے نتائج سے خبردار کیا، بارہ سرداروں کو اس علاقے کے حالات دریافت کرنے کے لئے بھیجا، ان لوگوں نے علاقے کی سرسبزی و شادابی کی رپورٹ دی، اور اس تفتیشی مہم کے دو ارکان نے بھی اس بزدل و پست ہمت قوم کا حوصلہ بڑھانے کے لئے للکارا، مگر ان پر ان تقریروں کا کوئی اثر ہوا، اور نہ اُن کا خوف و ہراس اور بزدلی اور دہشت زدگی دور ہوئی، اور وہ کسی طرح بھی فلسطینیوں کا

مقابلہ کرکے ان کے ملک پر قبضہ کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے، اُن کی اس ناقدری اور بزدلی کی یہ سزا دی گئی، کہ چالیس سال تک کے لئے سرزمین مقدس اُن کے لئے حرام قرار دے دی گئی اور یہ مدت انھوں نے صحرا گردی اور بادیہ پیمائی میں گذاری تاکہ اُن کی غلامانہ زندگی کا خاتمہ ہو اور اُن کی کوکھ سے وہ نسل اُبھرے جو صحرا کی فضا میں پل کر جوان ہوئی ہو، اور یہ اپنی بہادری، خود اعتمادی، اور ہمت و حوصلہ کی بدولت ارضِ مقدس کو فتح کرسکے، کیونکہ بقول اقبال ؎

کرتا ہے فطرت کے مقاصد کی نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کوہستانی

قرآن مجید نے ان واقعات کو سورۂ مائدہ میں تفصیل سے بیان کیا ہے؛

یہ اگرچہ ایک طرح کی سزا تھی، جو بنی اسرائیل کو دی گئی، مگر اس کے باوجود اللہ نے اس لق ودق میدان اور بے آب وگیاہ صحرا میں اُن کی راحت کا مکمل انتظام فرما دیا، دھوپ سے بچنے کے لئے سایہ مہیا کردیا، پانی کے بارہ چشمے جاری کردیئے، اور رزق و معیشت کی جانب سے ان کی پریشانی دور کردی، قرآن مجید نے صحراے سینا کے ان انعامات کا جو دھوپ پیاس اور فاقہ کی تکلیفوں سے بچانے کے لئے کئے گئے تھے، اس طرح ذکر کیا ہے:۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا	اور ہم نے تم لوگوں پر بدلیوں کا
عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ كُلُوا	سایہ کیا، اور تم پر من وسلویٰ
مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا	اتارا، کھاؤ ہماری بخشی ہوئی
ظَلَمُونَا وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ	پاکیزہ چیزوں میں سے، اور انھوں
يَظْلِمُونَ ...... وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ	نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، بلکہ وہ
مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ	خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے

بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ
اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ
اُنَاسٍ مَشْرَبَهُمْ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا
مِنْ رِزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي
الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ،
(بقرہ ۶۰)

سے، اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم
کے لئے پانی طلب کیا، تو ہم نے کہا
اپنی لٹھیا پتھر پر مارو، تو اس سے
بارہ چشمے پھوٹ نکلے، ہر گروہ
نے اپنا اپنا گھاٹ معین کرلیا،
پیو اور کھاؤ اللہ کی روزی سے
اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو،

ان نعمتوں کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجئے، کہ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں جہاں رزق اور غذا کے اسباب و وسائل مفقود تھے، لیکن وہ بنی اسرائیل کو تخم ریزی اور آبپاشی کی گوناگوں زحمتوں اور مشقتوں کے بغیر محض فضل خداوندی سے میسر آگئی تھی، اور اس خانہ بدوشی میں جہاں سایہ کے درخت نہیں تھے، دھوپ کی شدت اور آفتاب کی تمازت سے بچانے کے لئے خدا نے بادلوں کا سایہ کر دیا تھا، پھر پیاس کی شدت اور تکلیف دفع کرنے کے لئے ایک پہاڑی سے بارہ چشمے جاری کر دیئے، تاکہ اُن کے ہر ہر خاندان کے الگ الگ گھاٹ متعین ہو جائیں، اور اُن کے درمیان پانی لینے پر کوئی جھگڑا نہ ہو،

اس طرح کے اور بھی گوناگوں احسانات خدا نے یہود پر کئے تھے جن کو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے خدا کی ناشکری اور اسکی نعمتوں کی ناقدری کی، اور اس کی نافرمانی کی، اس کے پیغمبروں اور اس کی آیتوں کی تکذیب و استہزا کیا، آگے اسی کی تفصیل بیان کی جائے گی، (باقی)

حافظ یزید بن ہارون اسلمیؒ

از حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی رفیق دارالمصنفین ایم اے (علیگ)

دوسری صدی ہجری کے اوائل میں جن اتباع تابعین نے علم و عمل کی قندیلیں فروزاں کیں ان میں ایک ممتاز نام حافظ یزید بن ہارون اسلمی کا بھی ہے۔ جو فقہ و حدیث میں مہارت تامہ رکھنے کے ساتھ سیرت و کردار کے اعلیٰ مرتبہ پر بھی فائز تھے، زہد و تقویٰ، بے نفسی و خشیت الٰہی اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کی شخصیت کے نمایاں ترین جوہر تھے۔ ان کی علمی جلالت کا اندازہ کرنے کے لیے ان کے چند ممتاز ترین شیوخ، تلامذہ کا مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تابعین کرام میں سے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس بن مالک کے شاگرد یحییٰ بن سعید اور سلیمان بن طرخان تیمی سے اکتساب فیض کیا تھا یحییٰ حدیث کی روایت کے ساتھ تفقہ میں بھی کمال رکھتے تھے۔ یزید بن ہارون نے انکی تین ہزار حدیثیں حفظ کی تھیں[1] سلیمان تیمی (المتوفی ۱۴۳ھ) کا طغرائے امتیاز زہد و ورع اور عبادت و ریاضت تھا۔ وہ قائم اللیل اور صائم النہار تھے[2]

حافظ یزید زمرۂ اتباع تابعین میں، امام شعبہ، سفیان ثوری، عبد العزیز بن عبد اللہ الماجشون، حماد بن زید اور حماد بن سلمہ سے مستفید ہوئے تھے، امام شعبہ کا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵، [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۱۲۔

شمار اگرچہ کبار تبع تابعین میں ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنے علم وفضل، دیانت وتقویٰ اور بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے تابعین کے زمرہ میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ انھوں نے دو صحابیوں حضرت انس بن مالک اور عمرو بن مسلمہ کو دیکھا تھا۔ رویت صحابہ کا یہ فضل انکی تابعیت کے لیے کافی ہے۔ اپنے فضل وکمال کی وجہ سے وہ امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے[1]

امام سفیان ثوری زمرہ اتباع تابعین کے گل سرسبد تھے، علم وفضل کے لحاظ سے ان کا شمار ان ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے، جو ایک جداگانہ فقہی مسلک کے بانی تھے گو ائمہ اربعہ کے مسلک کے سامنے اس مسلک کا چراغ زیادہ دنوں تک نہ جل سکا تاہم فقہ وحدیث کی تمام کتابوں میں ائمہ اربعہ کے ساتھ سفیان ثوری کی آراء واجتہادات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس عہد میں جن علماء کو قرآن اور اسکی تفسیر وتاویل سے خاص شغف تھا۔ اور جنھوں نے اس فن میں اپنی تاریخی یادگاریں بھی چھوڑی ہیں، ان میں امام موصوف بھی ہیں ان کی یہ تفسیر ابھی حال میں چھپ گئی ہے۔

عبدالعزیز بن عبداللہ الماجشون (المتوفی ۱۶۴ھ) ایسے جلیل القدر فقیہ تھے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے ان کو اس فن میں امام مالک پر بھی فوقیت دی ہے[2] اسی بنا پر مدینہ میں سرکاری طور پر صرف دو ہی آدمی فتویٰ دینے کے مجاز تھے، ابن الماجشون اور امام مالک۔ علم وفضل کے ساتھ جواہر عمل سے بھی مالامال تھے۔ زہد وتقویٰ کے بلند مقام پر متمکن تھے۔ خطیب بغدادی نے احکام ومسائل میں ان کے صاحب تصانیف ہونے کا ذکر کیا ہے[3]

۱؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۲۷، ۲؎ تہذیب التہذیب ج ۶/ ۳۴۳

۳؎ تاریخ بغداد ج ۱۰/ ۴۳۹

حماد بن زید (المتوفی ۱۷۹ھ) حصول علم کے بعد اگرچہ دولت بینائی سے محروم ہوگئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے وہ مقام پیدا کیا کہ بڑے بڑے ائمہ حدیث ان سے استفادہ کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ امام الجرح والتعدیل عبدالرحمن بن مہدی کا قول ہے کہ میں نے حماد سے بڑا عالم سنت کسی کو نہیں دیکھا۔ ابو عاصم بیان کرتے ہیں کہ حماد بن زید کی حیات میں ان کی سیرت و اخلاق کے لحاظ سے دنیا میں ان کا کوئی مثل موجود نہ تھا۔[۱] یزید بن زریع ان کو سید المحدثین کہکر پکارتے تھے۔[۲] وہ بے مثل قوت حافظہ کے مالک تھے، عجلی کہتے ہیں کہ حماد بن زید کو چار ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں اور ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔[۳] حدیث کے ساتھ فقہ میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا۔ عبدالرحمن بن مہدی بیان کرتے ہیں کہ میں نے بصرہ میں حماد بن زید سے بڑا فقیہ کوئی نہیں دیکھا۔[۴]

حماد بن سلمہ (المتوفی ۱۶۷ھ) اپنے علم و فضل کے ساتھ زہد و اتقا اور تدوین حدیث میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ بقول حافظ ذہبی " وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سعید بن ابی عروبہ کے ساتھ تصنیف و تالیف میں حصہ لیا تھا۔[۵]

حدیث کے تمام مجموعوں میں حماد بن سلمہ کی روایتیں موجود ہیں۔ خصوصیت سے ابوداؤد الطیالسی نے جو ان کے تلمیذ رشید ہیں اپنی مسند میں کئی سو روایتیں ان کے واسطے سے نقل کی ہیں۔ اسی طرح یحیی بن ضریس کے پاس انکی دس ہزار مرویات تھیں، تبحر علم کے ساتھ زیور عمل سے بھی آراستہ تھے۔ امام عبدالرحمن بن مہدی فرماتے تھے کہ حماد بن سلمہ

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۰ [۲] ایضاً۔ [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۰

[۴] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۰ [۵] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۲

کا یہ حال تھا کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ کل آپ کو موت آجائے گی تو اس سے زیادہ عمل کی ان کو ضرورت نہ ہوتی۔[1] ان کی ساری زندگی منظم تھی کوئی لمحہ رائیگاں نہیں جانے دیتے تھے۔

مذکورۂ بالا سطور میں حافظ یزید بن ہارون کے چند اساتذہ و شیوخ کے علمی و عملی علوئے مرتبت کی ایک اجمالی جھلک پیش کی گئی۔ ان منتخب روزگار فضلاء سے اکتساب ضو کرکے حافظ یزید بھی چشمک زن آفتاب بن گئے تھے۔ اور پھر خود ان کے دبستان علم سے جن اساطین دہر نے گل چینی کی سعادت حاصل کی ان میں امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، یحیٰی بن معین، علی بن مدینی، اور آدم بن ابی ایاس کے نام قابل ذکر ہیں۔ اور یعرف الشجر بثمرہ کے مصداق ان ائمہ و حفاظ حدیث میں سے ہر ایک اپنے استاد حافظ یزید کے فضل و کمال کا شاہد عدل ہے۔

ان مذکورہ بالا تلامذہ میں امام احمد ابن حنبل کی شخصیت محتاج بیان نہیں ہے وہ نہ صرف ایک فقہی مسلک کے بانی اور شہرۂ آفاق مسند کے جامع تھے، بلکہ اپنے فہم و تدبر نزاہت نفس، اخلاص، صبر و استقلال، زہد و تقویٰ اور تواضع و انکسار کے باعث تاریخ کا ایک درخشاں باب بن چکے ہیں۔ انھوں نے فتنہ خلق قرآن میں استقامت اور جرأت حق گوئی کا جو بے مثل اور قابل تقلید نمونہ پیش کیا وہ تاریخ کے اوراق کی زینت ہے۔ اس کا امکان قوی ہے کہ ان کے یہ اوصاف عالیہ حافظ یزید بن ہارون کے فیضان صحبت کا نتیجہ ہوں جو مامون الرشید کی منشا کے علی الرغم تمام زندگی پوری جرأت کے ساتھ یہ اعلان کرتے رہے کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ جو شخص خلق قرآن کا قائل ہے وہ کافر ہے۔[1]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۴۲

امام المسلمین اسحاق بن راہویہ (المتوفی ۲۳۸ھ) کا شمار ان اساطین امت میں ہوتا ہے جنھوں نے دینی علوم خصوصاً تفسیر و حدیث کی بے بہا خدمات انجام دیں اور اپنی تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں، قوت حافظہ میں ان کی نظیر خال خال ہی ملتی ہے ابوداؤد خفاف کا (جو ان کے تلامذہ میں ہیں) بیان ہے کہ ایک بار ابن راہویہ نے گیارہ ہزار حدیثیں املا کرائیں۔ اور پھر ان کو دوبارہ دہرایا تو ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا[1]۔ امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور احمد بن حنبل جیسے جلیل المرتبت ائمہ ان سے تلمذ کا شرف رکھتے تھے، اور ان سب نے اپنی کتابوں میں ان کی مرویات نقل کی ہیں۔

حافظ یزید کے تلامذہ میں یحیی بن معین (المتوفی ۲۳۳ھ) جیسے فن اسماء الرجال کے ماہر بھی شامل تھے۔ پہلی صدی ہجری میں جب پیشہ ور واعظوں اور قصہ گویوں نے گرمی مجلس کی خاطر بکثرت بے سروپا روایتیں بیان کرنی شروع کر دیں تو بے شمار غلط باتیں رواج پاکر زبان زد خاص و عام ہوگئیں۔ محدثین نے اپنی خداداد فہم و بصیرت سے اس فتنہ کی اہمیت کو بروقت سمجھ لیا اور ہمت و جرأت کر کے اس کے مقابلہ کے لیے میدان میں آگئے۔ پہلی صدی کے آخر ہی میں اس اہم کام کی درغ بیل پڑ گئی تھی۔ مگر دوسری صدی میں محدثین نے باقاعدہ ایک نئے فن اسماء الرجال کی بنیاد ڈال کر اس فتنہ کا بڑی حد تک سدباب کر دیا۔ انھوں نے غور و خوض کے بعد اصول و قوانین مرتب کیے۔ رواۃ کے سیرت و کردار کا ایک معیار مقرر کیا۔ اور پھر اسی کے مطابق روایات کے رد و قبول کا فیصلہ کیا۔ یحیی ابن معین نے اس سلسلہ میں جو غیر معمولی محنت

---

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۰۹

دشمنی کی ہے۔ تہذیب التہذیب اور تاریخ بغداد میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے بقول صالح بن محمد وہ معاصر ائمہ حدیث میں سب سے زیادہ رجال سے واقف تھے مراتب حدیث اور جرح و تعدیل میں ان کے فرط احتیاط اور احساس ذمہ داری کا یہ عالم تھا کہ اس خوف سے رات کی نیند حرام ہو جاتی تھی کہ روایت میں کہیں غلطی نہ ہو گئی ہو یا کسی راوی کی تعدیل و تنقید میں حق و صواب کا دامن نہ چھوٹ گیا ہو[1]

علی بن مدینی بھی ابن معین کی طرح جرح و تعدیل کے امام شمار ہوتے ہیں بقول سفیان بن عیینہ وہ حدیث کا مرجع و ماوی تھے۔ امام بخاری جن کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے علی بن المدینی کے علاوہ کسی کے سامنے خود کو حقیر نہیں سمجھا[2]۔ ابن ماجہ اور نسائی نے ان سے بالواسطہ روایتیں کی ہیں۔ وہ محض حدیث کے حافظ اور راوی نہیں تھے، بلکہ اس کے عارف و ماہر بھی تھے۔ سند و متن رواۃ و روایت ہر چیز پر ان کی نظر تھی۔ خامیوں اور نقائص کا پورا علم رکھتے تھے۔ ابو حاتم کا قول ہے کہ علی معرفت حدیث و علل میں ایک علامت و نشان تھے[3]۔

حافظ یزید کے ایک اور ممتاز ترین شاگرد آدم بن ابی ایاس ہیں جو امام شعبہ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ علوم قرآن کی کامل معرفت اور اس کی مختلف قراءتوں سے بہرہ وافر رکھتے تھے۔ علماء کی اکثریت نے حدیث میں ان کے پایہ ثقاہت پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ جلالت علم کے ساتھ عمل اور تقوی و صالحیت کا بھی مجسم پیکر تھے عجلی کا قول ہے "کان من خیار عباد اللہ"[4]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۰۳ [2] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۱۱۲ [3] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۵۲ [4] ایضاً [5] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۲۰۵۔

کی زندگی سنت نبوی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں۔ وکان من الصالحین متمسکاً بالسنۃ[1] خطیب بغدادی رقمطراز ہیں۔ کان احد عباد اللہ الصالحین[2]"

زیر تذکرہ حافظ یزید بن ہارون کے اساتذہ وشیوخ کے مقام بلند کی طرف جو مذکورۂ بالا اشارات کئے گئے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس نے ایسے یگانۂ عصر ماہرین فن سے کسب فیض کیا ہو۔ اور پھر جس کے حلقۂ اثر میں ایسے ایسے بے نظیر اہل فضل وکمال شامل ہوں خود اس کے علوئے شان کا کیا عالم ہوگا۔ اس لئے ذیل میں ہم حافظ یزید بن ہارون کے حالات وکمالات کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

نام ونسب یزید نام اور ابو خالد کنیت تھی۔ اصل وطن واسط (عراق) تھا۔ بنو اسلم کے غلام ہونے کے باعث اسلمی اور وطن کی نسبت سے واسطی کہے جاتے ہیں[1]۔

ولادت اور تعلیم وتربیت اپنے وطن واسط میں ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گذرا۔ اس لیے اغلب ہے کہ ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی ہوگی، اسوقت واسط میں شعبہ بن الحجاج ابو مالک وغیرہ کے حلقہائے درس قائم تھے، امام یزید نے ان ائمہ سے اکتساب فیض کے بعد دوسرے مقامات کا سفر کیا اور ہر خرمن علم سے خوشہ چینی کی کوشش کی۔

شیوخ وتلامذہ انکے اساتذہ اور تلامذہ کی فہرست کافی طویل ہے، مشہور اشخاص کے حالات گزشتہ صفحات میں بیان ہوچکے ہیں۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۶۶ میں

شیخ یزید کے شیوخ کی مذکورہ بالا فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تقریباً تمام ہی اسلامی ملکوں کے شیوخ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

واسط سے باہر جانے کی وجہ سے وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "حاسدوں کی وجہ سے واسط میں رہکر علم وفضل میں ممتاز ہونا نہایت مشکل تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہاں رہکر کوئی بھی علم میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے دریافت کیا کیا آپ بھی واسط میں رہکر ہم میں بلندپایہ نہ ہوسکے؟" فرمایا۔ ہاں!

ما عرفت حتی خرجت من واسط میں بھی اس وقت تک معرفت حاصل نہ کرسکا جب تک واسط سے باہر نہیں آیا۔

قوت حافظہ گو امام یزید فقہ میں بھی بلند مقام رکھتے تھے۔ لیکن ان کا اصل طغرائے کمال فن حدیث تھا۔ اور بلاشبہ اس میں انھوں نے غیر معمولی درک بہم پہونچایا تھا۔

خداوند قدوس نے انھیں ذہانت اور قوت حافظہ کی غیر معمولی دولت سے سرفراز فرمایا تھا۔ اس حیثیت سے وہ بلاشبہ اپنے بہت سے ہم عصروں سے ممتاز تھے۔ حتی کہ بعض محققین نے انھیں قوت حفظ میں امام وکیع پر بھی فوقیت دی ہے۔[1] خود فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تیس ہزار حدیثیں اسناد کے ساتھ ازبر ہیں۔ اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔

بالخصوص شامیوں کی روایتیں ان کو کثرت سے حفظ تھیں۔ کہتے تھے کہ مجھے شامیوں کی بیس ہزار حدیثیں اس طرح یاد ہیں کہ ان کے بارے میں ان سے سوال کی ضرورت نہیں تھی۔[2] امام جرح وتعدیل علی بن المدینی کا بیان ہے کہ میں نے یزید بن ہارون سے

---

[1] تذکرہ ج ۱ ص ۲۹۰ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹

زیادہ قوی الحفظ کسی کو نہیں دیکھا۔[1] ایک دوسری روایت میں ان کے الفاظ یہ ہیں۔

مارأیت احدا احفظ من الصغار و	میں نے صغار وکبار میں یزید بن ہارون سے
الکبار من یزید بن هارون[1]	زیادہ قوت حافظہ رکھنے والا نہیں دیکھا

یحییٰ بن یحییٰ کا قول ہے کہ عراق کے حفاظ حدیث چار ہیں[2] دو شخص ادھیڑ عمر کے اور دو سن رسیدہ مؤخر الذکر تو ہشیم اور یزید بن ربیع ہیں اور ادھیڑ عمر کے وکیع بن جراح اور یزید بن ہارون ہیں۔ لیکن آخر میں فرماتے ہیں۔

واحفظ الکھلین یزید بن	ان دونوں ادھیڑوں میں یزید بن
هارون[3]	ہارون زیادہ قوت حفظ رکھتے ہیں۔

عمر کے آخری حصہ میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے۔ اس لئے کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے تھے۔ جب کسی حدیث کے متعلق کچھ شبہ پیدا ہوتا تو اس کی توثیق وتصدیق کے لئے اپنی تربیت یافتہ ایک لونڈی سے پڑھوا کر اطمینان کر لیتے تھے۔ بعض محدثین اس بات کو ان کے ضعف حفظ کی دلیل قرار دیتے تھے۔

لیکن خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ متعدد ائمہ حدیث نے حضرت یزید بن ہارون کے غیر معمولی حفظ کا اعتراف کیا ہے، اور یہ تسلیم کیا ہے کہ انھیں اپنی روایت کی ہوئی حدیثیں خوب یاد تھیں، البتہ بڑھاپے میں فرط ضعف اور نابینائی کی وجہ سے ان کو اپنے حافظہ پر پورا اعتماد نہ تھا۔ اس لیے جب حدیث کے بارے میں تردد ہوتا تھا تو اس کی توثیق لونڈی سے کتاب پڑھوا کر کر لیتے تھے۔ ان کا یہ فعل کمال احتیاط کی

---

[1] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶۔ [2] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۳۹

[3] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۶۔

دلیل ہے۔ وکہ ان کے قابل اعتماد ہونے کی[1]

ان کا حافظہ بڑھاپے میں ممکن ہے کچھ کم ہوگیا ہو مگر اس کی وجہ سے ان کے اتقان فی الحدیث میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی، چنانچہ متعدد ائمہ حدیث نے ان کے اتقان فی الحدیث کی تعریف کی ہے، ابو زرعہ فرماتے ہیں۔ والاتقان اکثر من حفظ السرد اتقان فی الحدیث سند ون کے یاد رکھنے سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔

خود یزید بن ہارون کو بھی اپنے حافظہ پر پورا وثوق اور اعتماد تھا۔ ایک مرتبہ ان سے کسی نے کہا کہ ہارون السلمی آپ کے پاس اس لیے آرہا ہے کہ وہ چند حدیثوں کے الفاظ میں ردوبدل کرکے آپ کے حافظہ کا امتحان لے اسی اثنا میں ہارون آموجود ہوا۔ یزید نے اس کی آواز سن کر کہا "ہارون مجھکو یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ میرے قوت حفظ کا امتحان لینے کی غرض سے مجھپر بعض مشتبہ احادیث پیش کرنا چاہتے ہیں تو آپ اپنی جیسی کوشش کر لیجیے خدا مجھکو تیا مت کے دن کھڑا نہ کرے۔ اگر میں اپنی احادیث کو اچھی طرح یاد نہ رکھ سکوں"

ایک دوسرے موقع پر شیخ یزید نے فرمایا میں بیس ہزار احادیث رکھتا ہوں جسکا جی چاہے ان میں کوئی ایک حرف کم و بیش کرکے دیکھ لے[2]

درس حدیث | شیخ یزید کا مستقل حلقہ درس واسط میں تھا۔ مگر وہ کبھی کبھی بغداد میں بھی آکر تشنگان علم کو سیراب کرتے تھے خطیب کا بیان ہے کہ

قدم یزید بغداد وحدث بها ثم عاد الی واسط[3]	شیخ یزید بغداد آئے وہاں درس حدیث دینے کے بعد واسط چلے گئے۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۶۶ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۲

[3] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۳۶۔

کبار ائمہ حدیث ان سے کسب فیض کو باعث شرف و افتخار تصور کرتے تھے ان کی مجلس درس میں طالبان علم کا بیحد ہجوم رہتا تھا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی طلبہ کی تعداد ستر ہزار تک پہنچ جاتی تھی، یحیٰ بن ابی طالب بیان کرتے ہیں کہ میں بغداد میں ان کی مجلس میں شریک تھا۔

وکان یقال ان فی المجلس	کہا جاتا تھا کہ ان کی مجلس میں ستر
سبعین الفاً[1]	ہزار لوگ شریک تھے۔

فقہ حدیث کے ساتھ وہ فقہ میں بھی کامل مہارت رکھتے تھے، ابو عبداللہ سے کسی نے دریافت کیا یزید بن ہارون فقیہ بھی تھے، فرمایا ان سے زیادہ ذہین و فہیم میری نظر سے نہیں گذرا، سائل نے پھر کہا کہ اچھا ابن علیہ کے متعلق کیا خیال ہے بولے وہ فقیہ تو ضرور تھے۔ لیکن مجھکو ان کی نسبت اتنا علم نہیں جتنا کہ یزید بن ہارون کی نسبت ہے۔[2]

زہد و عبادت علم و فضل کے ساتھ زہد و اتقا اور عبادت و ریاضت کی صفات بھی ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھیں، وہ نماز نہایت خشوع و خضوع سے ادا کرتے تھے۔ اور خوف خدا سے ہمہ وقت لرزتے رہتے تھے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا۔ جن کی زندگی کا مقصد اور مشن ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔[3]

احمد بن سنان کا بیان ہے کہ میں نے کوئی عالم ایسا نہیں دیکھا جو یزید بن ہارون سے زیادہ بہتر طریقہ پر نماز ادا کرتا ہو۔ وہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو معلوم

---

[1] العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۳۵۱ [2] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۴۰

[3] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۶۹

ہوتا تھا، کہ گویا کوئی ستون ہے، جو بے حس و حرکت اپنی جگہ پر نصب ہے فرصت ہوتی تو وہ مغرب و عشا اور ظہر و عصر کے درمیان میں نوافل پڑھا کرتے تھے، اس عہد میں یزید بن ہارون اور ہشیم دونوں طویل نماز پڑھنے میں مشہور تھے۔ کثرت نوافل اور کثرت تلاوت کے باوجود یہ خوف ان پر ہر وقت طاری رہتا تھا کہ مبادا قرارت قرآن میں کوئی غلطی ہو جائے اور قیامت میں قابل مواخذہ قرار پائیں فرمایا کرتے کہ مجھکو ڈر ہے کہ قرآن میں کسی غلطی کے صادر ہو جانے سے میں ان خوارج کا مصداق نہ بن جاؤں جن کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

یقرءون القرآن لایجاوز	وہ لوگ قرآن پڑھتے ہیں لیکن قرآن
حناجرھم یمرقون منھا	ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتا وہ
کما یمرق السھم من	دین سے اس طرح باہر ہو جاتے ہیں
الرمیۃ [1]	جسطرح تیر نشانہ سے نکل جاتا ہے۔

عاصم بن علی کا بیان ہے کہ میں اور یزید بن ہارون مدت تک ابن الربیع کے پاس رہے اس اثنار میں میں نے یزید بن ہارون کو دیکھا کہ وہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتے تھے۔ اور تمام رات نماز میں کھڑے ہی کھڑے گذار دیتے تھے ایک شخص نے حضرت یزید سے پوچھا، آپ شب میں کتنی دیر سوتے ہیں، بولے اگر میں رات میں سوتا ہوں تو خدا میری آنکھوں کو نیند سے محروم کر دے [2]

خوف خدا | یزید بن ہارون پر خشیت الٰہی کا غلبہ اس درجہ رہتا تھا کہ ان کی

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۴۱ [2] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۴۱

آنکھیں ہر وقت پرنم رہتی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ بینائی سے محروم ہوگئے کسی نے دریافت کیا آپ کی دونوں خوبصورت آنکھیں کیسے ضائع ہوگئیں، فرمایا

ذھب بھما بکاء الاسحار[۱] گریہ صبح گاہی نے میری دونوں آنکھیں لے لیں۔

عزت و وقار ان کے علم و فضل زہد و اتقا اور جذبہ امر بالمعروف کا لوگوں کے دلوں پر اتنا گہرا اثر تھا کہ خلفاء وقت تک کوئی غلط اقدام کرنے سے ڈرتے تھے۔

خلق قرآن کے مسئلہ کی ابتدا تو دوسری صدی کی ابتدا میں ہو چکی تھی۔ مگر امام بن حنبل کے عہد میں اس نے ایک ہمہ گیر فتنہ کی شکل اختیار کر لی تھی، معتزلہ کے اثر سے مامون بھی اس کا قائل ہوگیا تھا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ اپنے اس عقیدہ کی تبلیغ و اشاعت کرے لیکن حضرت یزید بن ہارون کے خوف سے اس کے اظہار کی جرأت نہ کر سکا قاضی یحییٰ بن اکثم کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مامون نے ہم سے کہا۔

لولا مکان یزید بن ھارون لاظھرت القرآن مخلوق[۲] اگر یزید بن ہارون کے مرتبہ اور اثر کا خیال نہ ہوتا جو لوگوں کی نگاہ میں ان کا ہے تو میں قرآن کے مخلوق ہونے کا اعلان کر دیتا۔

کسی درباری نے پوچھا امیر المومنین یہ یزید بن ہارون کون ہیں۔ جن سے آپ بھی اس قدر خوفزدہ رہتے ہیں۔ مامون نے جواب دیا میں ان سے اس لیے نہیں ڈرتا کہ ان کے ہاتھ میں کوئی سلطنت یا اقتدار ہے۔ بلکہ مجھے خوف یہ ہے، کہ اگر میں اپنے

۱؎ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۶۹ ۲؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۲

عقیدہ کا اظہار کر دوں اور وہ میری تردید کر دیں تو ایک عظیم فتنہ کھڑا ہو گا۔ اور میں فتنہ سے ڈرتا ہوں" وہ شخص بولا اچھا میں تصدیق کرتا ہوں۔

چنانچہ شخص مذکور واسط آیا اور ایک مسجد میں جہاں حضرت یزید بن ہارون تشریف رکھتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا" امیرالمومنین آپ کو سلام عرض کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میرا ارادہ ہے کہ قرآن کے کلام مخلوق ہونے کا اعلان کر دوں۔ یہ سن کر یزید بن ہارون فوراً بولے تم امیرالمومنین پر بہتان طرازی کرتے ہو، وہ لوگوں کو کسی ایسی بات پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ جن کو وہ نہیں جانتے ہیں اگر تم سچے ہو تو مجلس میں دوسروں کی آمد کا انتظار کرو اور جب لوگ آجائیں۔ تو اس بات کا اعادہ کرنا۔

راوی کا بیان ہے کہ دوسرے روز مجلس گرم ہوئی تو یہ شخص پھر کھڑا ہوا اور اس نے پہلے روز والی بات دہرائی کہ امیرالمومنین کلام اللہ کے مخلوق ہونے کا اظہار کرنے کے خواہشمند ہیں یزید بن ہارون نے پوری دلیری کے ساتھ جواب دیا کہ تم امیرالمومنین پر تہمت باندھتے ہو وہ کسی ایسی بات پر لوگوں کو آمادہ نہیں کر سکتے جس کو لوگ بالکل نہ جانتے ہوں اور جس کا قائل کوئی ایک شخص بھی نہ ہوا ہو۔

اس گفتگو کے بعد اس شخص نے مامون کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ امیرالمومنین آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ بالکل بجا اور درست تھا۔ اس معاملہ میں بلاشبہ آپ کا علم بہت زیادہ تھا[1]

یزید بن ہارون کو معلوم تھا کہ مامون الرشید کا رجحان خلق قرآن کی طرف ہے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۴۴

لیکن اس کے باوجود ان کی حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ وہ بے خوف ہو کر اعلان کرتے تھے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ جو شخص خلق قرآن کا قائل ہے وہ کافر ہے[1]

بے نفسی | انسان فطرۃً خود پسند واقع ہوا ہے، لیکن ائمہ کرام کی زندگیوں کا یہ درخشاں رخ ہے کہ انھیں ہمیشہ اپنی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی، وہ اپنی تعریف و توصیف پر بجائے خوش ہونے کے ناپسندیدگی ظاہر کرتے تھے یزید بن ہارونؒ عمر بھر اس عجز و فروتنی کا کامل نمونہ تھے

علی بن الجندی الحرانی اس عہد میں ایک پر گو شاعر تھا۔ اس کو ان سے قلبی عقیدت تھی ایک مرتبہ اس نے حاضر ہو کر آپ کی مدح میں ایک طویل قصیدہ پڑھا جس میں تشبیب کے بعد وہ کہتا ہے۔

الیٰ یزید بن ہارون الذی کملت — فیہ الفضائل او اشفی علی ختن

حتی اتیت امام الناس کلھم — فی العلم و الفقہ والآثار والسنن

والدین والزھد والاسلام قد علموا — والخوف للّٰہ فی الاسرار والعلن

براً نقیاً، نقیاً، خاشعاً، ورعاً — مبرأً من ذوی الآفات والابن

ماذاک منک کان طفلاً فی شبیبتہ — حتی علاہ مشیب الراس والذقن

شاعر نے اس قصیدہ کو نہایت دلسوزی اور محبت کے ساتھ لکھا تھا۔ اس لیے طبیعت پہ جبر کر کے سن تو لیا مگر بقول راوی ان کی یہ کیفیت تھی کہ جب شاعر نے وہ اشعار پڑھے جن میں شیخ کی مدح کی گئی تھی تو آپ نے اس کو روک دیا اور اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹنے لگے[2]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۴۴ - [2] ایضاً

امر بالمعروف نہی عن المنکر | امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جذبہ عہد صحابہ اور تابعین میں عام تھا۔ یزید بن ہارون بھی اس کا مجسم نمونہ تھے، مامون جیسے باجبروت خلفا بھی اس بارے میں شیخ سے خوف زدہ رہتے تھے، محمد بن احمد اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ یزید بن ہارون ان بزرگوں میں سے تھے جنھوں نے امر بالمعروف نہی عن المنکر اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں دکان یزید من الآمرین بالمعروف والناھین عن المنکر[1]

مرجع خلائق | یزید بن ہارون اپنے علمی فضائل اور عملی کمالات کے باعث عوام و خواص کے مرجع بن گئے تھے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کی مجلس میں بسا اوقات ستر ستر ہزار کا مجمع رہتا تھا[2]

ابوبکر یحیی بن ابی طالب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم یزید بن ہارون کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، لوگ ان پر جھکے ہوئے ہر طرف سے سوالات کی بارش کر رہے تھے۔ لیکن وہ خود خاموش تھے۔ اور کسی کو کوئی جواب نہ دیتے تھے، جب سب خاموش ہوگئے تو آپ نے فرمایا ہم واسط کے رہنے والے ہیں اور واسط کے لوگ تغافل میں ضرب المثل ہیں یعنی ہم لوگ ایسی باتوں کا جواب دیکر اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کیا کرتے[3]

وفات | بالآخر ۲۰۶ھ میں واسط میں علم و فضل کی یہ شمع خاموش ہوگئی، اس وقت ۸۸ برس کی عمر تھی[4]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۴۳۔ [2] التہذیب ۱۱ ص ۳۶۹ [3] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۴۵۔ [4] العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۳۵۰ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶

عربی شاعری مغلوں کے عہد میں

از مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

شعرالعجم، اور شعرالہند کے بعد شعرالعرب کی اشاعت بھی دارالمصنفین کے پیش نظر تھی، چنانچہ اس کے رکن اور ملک کے ممتاز مصنف مولانا عبدالسّلام ندوی مرحوم شعرالہند کی طرح اس کو بھی مرتب کرنا چاہتے تھے، مگر افسوس کہ یہ نامکمل رہ گئی شعرالعرب کے کچھ اجزا مرحوم کی زندگی میں معارف میں چھپے تھے۔ اس شمارہ میں بھی اس کا ایک ٹکڑا ادبی تبرک کی حیثیت سے قارئین معارف کی ضیافت طبع کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔

مغلوں کے زمانہ میں ہندوستان میں کوئی قابل ذکر شاعر نہیں پیدا ہوا، البتہ ان کے حدود سلطنت کے باہر مصر و شام میں جو قابل ذکر شعرا گذرے ہیں، اس تحریر میں ان کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے، اختصار کی وجہ سے مثالیں نہیں دی گئی ہیں۔ امید ہے کہ عربی شعر و ادب کے قدرداں اس خوان ادب سے لطف اندوز ہوں گے انشاءاللہ بقیہ اجزا کو بھی جو محفوظ رہ گئے ہیں آیندہ وقتاً فوقتاً شائع کیا جائے گا "معارف"

مغلوں کے جابرانہ اقتدار نے لوگوں کی زبانوں اور عقلوں پر مہر لگادی، اس لیے

طبیعتوں پر جمود کا عالم طاری ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اس دور میں کوئی قابل ذکر عربی شاعر پیدا نہ ہو سکا، البتہ مغلوں کی سلطنت سے باہر بالخصوص مصر و شام میں چند قابل ذکر شعراء پیدا ہوئے، دوسرے ملک بھی اگرچہ خوش گو شعراء سے خالی نہ تھے۔ تاہم عام طور پر شاعری فطری چیز نہیں رہی، بلکہ ایک لفظی صنعت بن گئی۔ اور شعر و ادب دونوں باہم مخلوط ہو گئے۔ اور شعراء شاعری کے علاوہ ادبی مواعظ و حکم وغیرہ کی کتابیں لکھنے لگے، فن شعر مبتذل ہو گیا۔ اور لوگ اوقات فرصت میں دل بہلانے کے لیے شعر کہنے لگے، اور تجار اور پیشہ ور لوگ مثلاً درزی، بڑھئی، اور گندھی وغیرہ سب کے سب شاعر ہو گئے۔ اگرچہ یہ اس دور کی مخصوص خصوصیت نہ تھی، بلکہ اس سے پہلے بھی عوام کے گروہ میں شعراء پیدا ہوئے ہیں، لیکن جب وہ شاعری میں کمال پیدا کر لیتے تھے، تو خلفاء و امراء کے مقرب بارگاہ ہو کر اپنے پیشہ سے بے نیاز ہو جاتے تھے، اور معجزانہ شعر کہنے لگتے تھے۔ جیسا کہ شعرائے امویہ و عباسیہ میں اس قسم کے بہت سے شعراء پیدا ہوئے۔ لیکن مغلوں کے دور میں ادبی کساد بازاری کی وجہ سے کوئی شاعر، شاعری سے کسب معاش نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے پیشے سے الگ نہیں ہوتا تھا، اور شاعری صرف دل بہلانے کے لیے کرتا تھا۔

بدوی اور حورانی عجمیوں کے کثرت اختلاط سے فصیح عربی زبان خراب ہو گئی، اس لیے شعراء کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا، جس کو ابن خلدون مستعجمہ کہتا ہے، یہ شعراء غزل، مدح، مرثیہ اور ہجو سب کچھ پہلے شعراء کی طرح کہتے تھے۔ لیکن ان کے اشعار اعراب سے خالی ہوتے تھے، اور ان میں بہت سے عامیانہ الفاظ شامل ہوتے تھے، یہ شعراء پہلے اپنے نام سے قصیدہ کی ابتدا کرتے تھے، پھر تشبیب کہتے تھے، اس کے بعد اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے تھے، تونس، الجزائر اور مراکش میں ان شعراء کا بہت بڑا گروہ پیدا

ہو گیا تھا، جو اپنے قصائد کو "اصمعیات" اور اہل مصر و شام اون کو بدوی کہتے تھے وہ اس کو گاکر پڑھتے تھے۔ اور اس راگ کو بدویوں کے مقام حوران کی نسبت سے "حورانی" کہتے تھے، ابن خلدون نے مقدمۂ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں نقل کی ہیں،

عروض البلد، موالیا وغیرہ | اس دور میں مربع اور مخمس کی ایجاد ہوئی جس میں ہر شعر کے چوتھے قافیہ کا التزام کرتے تھے، اس صنف کو مولدین نے آٹھویں صدی ہجری میں ایجاد کیا، ابن خلدون نے ایک اور صنفِ شعر کا ذکر کیا ہے۔ جو موشح کے مثل تھی اہل شہر، شہری زبان میں اس کو نظم کرتے تھے، اور اس کو "عروض البلد" کہتے تھے۔ سب سے پہلے ایک اندلسی ابن عمیر نامی نے جو فاس میں آیا تھا، اس کو ایجاد کیا اور موشح کے طریقہ پر ایک قطعہ نظم کیا، لیکن اوس نے اوس میں اعراب کو قائم رکھا تھا، اس کے بعد اہل فاس نے اوس کو پسند کیا اور تغیر اعراب کے اس طریقہ کے مطابق نظم کہنے لگے، پھر اس کو مختلف اصناف مثلاً فردوج کاری بلویا اور غزل میں تقسیم کیا، یہ شام کے عام لوگوں کی اوس نظم کے مشابہ ہے، جس کو قصید یا "قریض" کہتے ہیں، اور اس اخیر صنف کو ایسے اوزان میں نظم کرتے ہیں، جن میں بعض سریانی ہیں، اس دور میں ایک عامیانہ صنفِ شعر کو پختگی حاصل ہوئی۔ جس کو موالیا کہتے ہیں، اس کا رواج بغداد میں تھا، اور اس کی مختلف قسمیں تھیں، مثلاً قوما "کان وکان" مفرد اور دوبیت، پھر وہ منتقل ہو کر بغداد سے قاہرہ میں آئی، اور اسی زمانہ سے وہاں اس کا رواج ہوا اور مصریوں نے اس میں خوب خوب دادِ سخن دی چونکہ اس دور سے پہلے جنگ صلیبی کے زمانے میں اہل فرنگ نے شام میں بہت دنوں تک قیام کیا تھا۔ اس لئے غالب

یہ ہے کہ اوس کا اثر ادیبوں پر پڑا، جو اون کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

تاریخ گوئی | اس دور کے اخیر میں حروف تہجی کے ذریعہ سے کسی واقعہ کی تاریخ نکالنے کا رواج ہوا، پہلے ادبا نے نثر میں ان سے کام لیا، اور اس کی سب سے قدیم مثال ۸۵۷ھ میں قسطنطنیہ کی فتح ہے، جس کو عثمانیوں نے "بلدۂ طیبہ" کے لفظ سے نکالا ایک دوسرے شخص نے ایک سبیل کی، جو ۹۶۶ھ میں قائم ہوئی اون الفاظ میں تاریخ نکالی، "رحم اللہ من ونا وشرب" اس تاریخ سے پہلے نظم میں بھی شعرا نے تاریخیں نکالیں چنانچہ ۹۲۲ھ میں ابن المؤید الاماسی کی وفات ہوئی، تو ایک شاعر نے اوس کی یہ تاریخ کہی

قل للذی یبغی تاریخ رحلتہ ۔۔۔ نجل المؤید مرحوم ومبرور

اور صرف شعر کے دوسرے مصرعے کے حساب سے تاریخیں نکالیں،

۹۷۰ھ میں محمد پاشا مقتول والی مصر کی وفات ہوگئی۔ تو ایک شاعر نے یہ تاریخ نکالی،

قتلہ بالنار نوز ۔۔۔ وہو فی التاریخ "ظلمہ"

اس کے بعد شعرا نے فن تاریخ گوئی میں نہایت وسعت پیدا کی یہانتک کہ ایسے قصائد نظم کرنے لگے جن کا ہر مصرع تاریخ ہوتا تھا، بعض اوقات اشعار کی ابتداء کے حروف لے لیے جاتے ہیں، جن سے ایسے الفاظ جمع ہو جاتے ہیں کہ اون سے اشعار بن جاتے ہیں۔ اور ان کے ہر مصرعے سے ایک یا دو تاریخیں نکل آتی ہیں، جیسا کہ ۱۱۳۰ھ میں نکلادی نے شیخ عبدالغنی النابلسی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا، اور ۱۲۵۰ھ میں شیخ ناصیف الیازجی نے ابراہیم پاشا کی مدح میں ایک قصیدہ اوس کے جواب میں لکھا، دوسرے شعرا نے اس میں یہ جدت پیدا کی کہ ہر شعر کے غیر منقوط

حروف سے ایک تاریخ اور منقوط سے دوسری تاریخ نکالی،

شعراء مملوکوں کے دور میں | اس دور میں ہم نے شعراء کی تقسیم اون کے وطن کے لحاظ سے کی ہے، اور شعراے مصر وشام کے لیے ایک فصل خاص کر دی ہے، دوسرے شعراء کے لیے اور فصلین قائم کی ہیں، اور صرف انہی مشہور شعراء کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے ایسی یادگارین چھوڑی ہیں، جو دستیاب ہوسکتی ہیں، اور پھر سنہ وفات کی ترتیب کے موافق اون کا تذکرہ کیا ہے،

شعراے مصر وشام

التلعفری المتوفی ۶۷۵ھ | شہاب الدین محمد بن یوسف بن مسعود بن برکۃ الشیبانی التلعفری ۵۹۳ھ میں پیدا ہوا، اور اکابر وسلاطین کی مدح کی جن میں ایک الملک الاشرف موسیٰ ایوبی تھا۔ اوباش اور قمار باز تھا۔ اور ملک اشرف اس کو جو کچھ دیتا تھا۔ اوس سے جوا کھیل جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اوس سے اوس کو حلب میں جلاوطن کر دیا۔ وہان اوس نے عزیز غیاث الدین کی مدح کی اور اوس نے اسکے ساتھ سلوک کیا، لیکن اوس نے اوس کے ساتھ بھی یہی طرز عمل اختیار کیا، اس لیے حلب میں یہ منادی کرادی گئی کہ جو شخص شہاب تلعفری کے ساتھ جوا کھیلے گا اوس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے گا، اب اوس پر زمین تنگ ہوگئی۔ اور دمشق میں چلا آیا، اور بھیک مانگ کر برابر جوا کھیلتا رہا۔ اخیر میں فرمان روائے حماۃ کا ندیم ہوا، اور اسی حالت میں وفات پائی۔ اس کا دیوان ۱۳۱۰ھ میں بیروت میں چھپ گیا ہے، اور فوات الوفیات (جلد ۲ صفحہ ۲۷۰) میں اسکے اشعار کی بہت سی مثالیں ہیں۔

۲۔ الشاب الظریف المتوفی ۶۸۸ھ | اس کا نام محمد بن سلیمان ہے، ۶۶۱ھ میں مصر میں پیدا ہوا اور اپنے باپ عفیف الدین تلمانی سے پہلے عنفوان شباب میں

وفات پائی۔ اوس کے اشعار لطافت میں مشہور ہیں، اور اس کا دیوان متعدد بار مصر وغیرہ میں چھپ گیا ہے۔ دوسری ادبی کتابیں بھی اس کی تصنیفات میں ہیں جن میں سب سے اہم مقامات ہے، جس کے نسخے پیرس اور برلن میں ہیں، (فوات الوفیات ج ۲ ص ۲۱۱)

۳۔ عفیف الدین تلمسانی المتوفی ۶۹۰ھ — اس کا نام سلیمان بن علی بن عبد اللہ ہے، اور وہ الشاب الظریف کا باپ ہے، اوس کا خاندان کوفہ کا رہنے والا تھا اور وہ تصوف کا مدعی تھا، اور صوفیوں کی اصطلاح میں کلام کرتا تھا، بعض لوگ اس کو بد دین اور نصیری مذہب کی طرف مائل سمجھتے ہیں، نہایت شریفانہ اخلاق رکھتا تھا اور صاحب وجاہت تھا، اس نے متعدد شہروں میں سرکاری خدمات انجام دیں، دمشق میں سرکاری خزانہ سے تعلق رکھتا تھا، اور شاہ دمشق کے دربار میں معزز تھا، وہ صوفی تھا۔ اور بلاد روم میں چالیس خلوت خانے تعمیر کیے، غرض اس کے طور طریقے میں ہم رنگی نہ تھی، دمشق میں ۶۹۰ھ میں وفات پائی۔ اوس کا دیوان حروف تہجی کے مطابق مرتب کیا گیا ہے، اور اس کے نسخے برلن لندن، اور اسکوریال میں ہیں، اس کی ایک کتاب عروض میں بھی، برلن میں ہے۔ (فوات الوفیات جلد اول ص ۱۰۸)

۴۔ البوصیری المتوفی ۶۹۶ھ — امام محمد بن سعید الصنہاجی البوصیری صاحب بردہ کے ماں باپ میں سے ایک مصر میں بوصیرہ کا اور دوسرا دلاص کا رہنے والا تھا، اس لیے بعض لوگ اوس کو دلاصیری بھی کہتے ہیں، وہ قصیدہ بردہ کی وجہ سے جس کو اوس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں لکھا ہے، مشہور ہوا، یہ قصیدہ

الکوکب الدریہ فی مدح خیر البریہ کے نام سے مشہور ہے، اور اوس میں ۱۶۲ اشعار ہیں، دس مطلع میں، سولہ نفس و ہوائے نفس میں، تیس لغت میں، انیس آپ کی ولادت میں، دس دعا میں، دس قرآن مجید کی مدح میں، تین معراج میں، بائیس آپ کے جہاد میں، ۱۴ استغفار میں اور بقیہ اشعار مناجات میں ہیں، بہت سے لوگوں نے اس قصیدے کی شرح لکھی ہے، اور وہ بار بار چھپ چکا ہے، اوس نے دو قصیدے بھی لکھے ہیں، جن میں قصیدہ نونیہ میں شرقیہ مصر کے بعض عہدہ داروں کی ہجو لکھی ہے۔ فوات الوفیات (ج ۲ ص ۲۰۴) میں اوس کے حالات کے ضمن میں اوس کا بعض حصہ شائع ہوا ہے، سعاد کے متعلق بانت سعاد کے وزن میں اوس کا قصیدہ ہمزیہ ہے،

۵۔ سراج الدین الوراق المتوفی سنہ ۶۹۵ھ۔ | عمر بن محمد بن حسن الوراق یوسف سیف الدین بن سپہ سالار والی مصر کا مہر منشی تھا۔ وہ نہایت پرگو شاعر تھا، اور علم بدیع سے واقف تھا۔ صاحب فوات الوفیات نے لکھا ہے، کہ مجھکو اوس کا دیوان خود اس کے قلم کا لکھا ہوا سات بڑے اجزا میں ملا، اور یہ وہ دیوان ہے جس کو اوس نے اپنے لیے انتخاب کیا تھا۔ اور قائم رکھا تھا، غالبًا اصل دیوان پندرہ جلدوں میں تھا، اور ہر جلد کی دو جلدیں ہو سکتی تھیں، اس لیے اوس کا دیوان بلا لحاظ اچھے اور برے اشعار کے کم از کم ۳۰ جلدوں میں تھا، اور اس کا خط نہایت عمدہ اور پختہ تھا۔ اس کے دیوان سے صلاح الدین صفدی نے ایک مجموعہ انتخاب تیار کر کے حروف تہجی کے مطابق مرتب کیا، جس کا نام "لمع السراج"، رکھا، اور اس کا ایک نسخہ برلن میں ہے۔ (فوات الوفیات ج ۲ ص ۱۰۶)

۶۔ شہاب الدین الغزاوی، متوفی سنہ ۷۱۰ھ | احمد بن عبد الملک الغزازی قاہرہ میں قیسار یہ

جوکہ وہ بزازی کا پیشہ کرتا تھا، اور ظرافت و تذکرہ کے لیے شعر کہتا تھا، ظریف اور خوش گو تھا، بالخصوص موشح کو نہایت خوبی کے ساتھ لکھا ہے، اوس کا میلان چیستان گوئی کی طرف تھا، اور اوس نے اچھے اچھے چیستان لکھے ہیں، اوس نے اپنے دیوان کو پانچ ابواب پر تقسیم کیا ہے، ایک باب نعت رسول میں دوسرا امراء اور وزراء وغیرہ کی مدح میں اور بقیہ ابواب چیستان اور ہجو وغیرہ میں ہیں اوس کی ایک کتاب غرائب الاوزان ادن مخمسات و موشحات میں ہے، جن کو اندلسیون نے ایجاد کیا تھا۔ اوس کا ایک ناقص نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ۲۰۰ صفحات میں ہے۔ فوات الوفیات (ج ۲ ص ۸۴) میں اوس کا جو حال ہے۔ اوس میں اوس کی نظم کی مثالین درج ہیں، درر کامنہ ج ۳ میں بھی اوس کا تذکرہ ہے۔

۷۔ ابن دانیال الموصلی المتوفی۔ سنہ ۷۱۰ھ شمس الدین محمد بن دانیال بن یوسف الموصلی الطبیب ارمدی ایک باکمال ناظم و ناثر تھا، صلاح الدین صفدی نے اس کو اپنے زمانہ کے ابن حجاج اور اپنے شہر کے ابن سکرہ کا خطاب دیا ہے، فوات الوفیات (ج ۲ ص ۱۹۰) میں اوس کے اشعار کی بہت سی مثالیں درج ہیں، اور اس میں مذکور ہے کہ اوس نے سنہ ۶۸۶ھ میں وفات پائی لیکن یہ غلط ہے کیونکہ اوس نے خود اوس کے حالات میں لکھا ہے۔ کہ فتح الدین بن سید الناس نے اوس کو دیکھا تھا، اور سید الناس سنہ ۶۷۱ھ میں پیدا ہوا، اور سنہ ۷۳۴ھ میں وفات پائی، اس لیے سنہ ۶۸۶ھ ابن دانیال کی وفات خلاف عقل ہے، کشف الظنون میں ہے کہ اوس نے سنہ ۷۱۰ھ میں وفات پائی اور یہی صحیح ہے، ابن دانیال کی ایک کتاب کا نام "طیف الخیال" ہے، اوس نے اوس میں لعبت خیال الظل کا وصف بیان کیا ہے، جس کو شام کے لوگ "کراکوز"

کہتے ہیں، اوس کا ایک نسخہ کتب خانہ تیموریہ میں ۱۰۲ صفحات میں ہے، وہ ایک ظریفانہ ناول کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں بہت سی رندانہ ظریفانہ باتیں اور فحش الفاظ ہیں، اگر یہ معائب نہ ہوتے تو وہ ایک ڈراما کے قسم کی کتاب ہوتی۔ جس کی مثالیں اوس زمانہ مین عربی میں بہت کم ہیں۔

۸۔ ابن نباتہ المصری المتوفی ۷۶۸ھ جمال الدین ابو بکر محمد بن محمد بن الحسن الجذامی المصری مصر میں ۶۸۶ھ میں پیدا ہوا، اور وہیں ۷۶۸ھ میں وفات پائی۔ وہ نظم ونثر میں شہرت رکھتا ہے۔ اور نثر میں قاضی فاضل کی روش اختیار کی ہے، اوس کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک بڑا دیوان جو حروف تہجی کے مطابق مرتب کیا گیا ہے، اور اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ۳۵۶ صفحات میں ہے، اوس کا بعض حصہ اسکندریہ میں بغیر تاریخ کے چھپا ہے، اور اس کا دوسرا ٹکڑا مصر وغیرہ میں ۱۲۸۶ھ میں چھپا، پورا دیوان مصر مین ۱۳۲۳ھ میں چھپا۔

(۲) القطر النباتی۔ اس میں صرف اوس کے قطعات ہیں، اور اس کا نسخہ پیرس میں ہے،

(۳) تعلیق الدیوان رسالوں وغیرہ کا مجموعہ ہے، اور اس کا نسخہ برلن میں ہے۔

(۴) مطلع الفوائد ومجمع الفرائد وہ ادب کی ایک جامع کتاب ہے۔ اور اوس کا نسخہ پیرس میں ہے۔

(۵) سجع المطوق، مطلع الفوائد کی تقریظ اور تقریظ نگارون کے حالات اور اوس کے احباب کی خط وکتابت کا مجموعہ ہے، کتب خانہ خدیویہ میں اوس کا ایک نسخہ

۲۷۶ صفحات میں ہے

(۶) سرح العیون فی شرح رسالۃ ابن زیدون، اس میں اہم تاریخی فوائد درج ہیں، کیونکہ اس میں شعرائے جاہلیت اور آغاز اسلام میں سے اہم شعراء کا ذکر کیا ہے، اس لیے وہ ان کے حالات و واقعات کی شرح ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ آکسفورڈ میں ہے، اور مصر میں ایک ضخیم جلد میں چھاپا گیا ہے،

(۷) دیوان الخطب، یہ ابن نباتہ کے خطبات کا مجموعہ ہے، اور مصر میں ۱۳۰۲ھ میں اور بیروت میں ۱۳۱۱ھ میں چھپا ہے،

(۸) سلوک دول الملوک، یہ ایک سیاسی نوعیت کی کتاب ہے، یعنی بادشاہوں پر خود اپنی ذات، اپنے اہل و عیال اور اپنی رعایا کے متعلق کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں، دائنا کی اکاڈیمی میں اس کا ایک نسخہ ہے، اور اسی موضوع پر اوس کے موجز بھی ہیں، جس کا نام فرائد السلوک ہے، اور اس کا نسخہ برلن میں ہے۔

(۹) سوق الرقیق، متغزلانہ رنگ کا قصیدہ ہے، اور اس کے نسخے برلن اور پیرس میں ہیں،

(۱۰) تلطیف المزاج فی شعر الحجاج اس کا نسخہ آکسفورڈ میں ہے، اوس کے اور بھی متفرق قصائد و خطبات یورپ کے کتب خانوں میں ہیں، اور اس کے حالات (درر الکامنہ ج ۳) میں ہیں،

۹- ابن ابی حجلہ المتوفی ۷۷۶ھ	ابو العباس شہاب الدین احمد بن یحییٰ التلمسانی نزیل قاہرہ ۷۲۵ء نظم ونثر کا ماہر تھا، اور بہت سے مقامات و مجامیع لکھے ہیں

جن میں سب سے اہم یہ ہیں۔

(۱) دیوان الصبابہ جو شعر و ادب کا مجموعہ ہے۔ اور اس کی ابتدا میں مولف کا تذکرہ ہے، جو اس کی کتاب مغناطیس الدر النفیس سے منقول ہے، یہ دیوان مختلف قسم کے کشتگان عشق کے حالات پر مشتمل ہے، اس نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس نے صرف چھوٹے چھوٹے نوادر جمع کیے ہیں، اور اس نے اس کو چند ابواب پر منقسم کیا ہے، کوئی باب حسن و جمال میں ہے، کوئی باب ان لوگوں کے حالات میں ہے، جو لوگ ناسن کر یا دوسرے طریقہ پر عاشق ہوئے، یہ دیوان سنہ ۱۲۷۹ھ میں مصر وغیرہ میں چھپا ہے،

(۲) سکردان السلطان، اس نے اس کو ملک الناصر کے لیے لکھا ہے، اور مختلف قسم کی سنجیدہ ظریفانہ باتوں، نصائح، آداب، سیر اور نوادر پر مشتمل ہے، اور پاکیزہ اسلوب میں لکھا گیا ہے، وہ اس کی ابتدا ساتویں عدد سے کرتا ہے، اس لیے کتاب کو ایک مقدمہ اور سات ابواب پر منقسم کیا ہے۔ مقدمہ اقلیم مصر پر ہے، اور پہلا باب ہفت کشور کے خواص پر، دوسرا باب بادشاہ کے تعلق پر اس عدد کے ساتھ، تیسرا باب مناسبت اقالیم پر، چوتھا باب اس پر کہ وہ ساتواں بادشاہ ترکی بادشاہوں سے ہوگا۔ پانچواں باب اس کی سیرت پر، چھٹا باب اتفاقات غریبہ پر اور ساتواں باب کتاب کے بعض الفاظ کی تفسیر میں ہے، یہ کتاب اہم تاریخی فوائد پر مشتمل ہے، جن میں ایک حاکم بامراللہ کی سیرت اور اس کے اعمال غریبہ ہیں، جو دوسری کتابوں میں نہیں مل سکتے، وہ سنہ ۱۲۸۳ھ میں مصر میں اور سنہ ۱۳۱۷ھ میں مخلاۃ کے حاشیہ پر چھپ گئی ہے۔

(۳) الطاری علی السکردان، اس نے اس کو سلطان ملک الناصر کی مدح میں پانچ بابوں میں لکھا ہے۔ اور اس کا ایک نسخہ پیرس اور گوٹا میں ہے۔

(۴) سلاۃ الحزین فی موت البنین (۵) منطق الطیر

(۶) چند قصائد۔ اسکندریہ کی جنگ پر جو ۷۶۷ھ میں ہوئی۔ اور یہ تمام کتابیں برلن میں ہیں۔

(۷) جوار الاخیار فی دار القرار۔ عقبہ کے حالات، اور اس کی قبر، اور اس کے حسن جوار وغیرہ میں ہے، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ۴۰۳ صفحات میں ہے۔

(۸) الطب المسنون فی دفع الطاعون۔ کتب خانہ خدیویہ میں ہے۔

۱۰۔ شمس الدین الہواری المتوفی سنہ ۷۸۰ھ — ابو عبد اللہ شمس الدین محمد بن جابر الہواری الاندلسی الضریر اسپین میں پیدا ہوا، اور مصر میں سفر کرکے آیا اور ابو جعفر غرناطی کے دامن سے وابستہ ہوگیا، پھر دمشق کا سفر کیا، اور آخر میں فرات میں قیام کیا اور وہیں وفات پائی۔ اس نے اپنی حسب ذیل یادگاریں چھوڑی ہیں۔

(۱) بدیعیۃ العمیان یا حلۃ السیرا فی مدح خیر الوری۔ اس کا ایک نسخہ برلن میں ہے، اور اس نے اس کی شرح بھی کی ہے، اور اس کا نام طراز الحلہ وشفاء الغلہ رکھا ہے، اور وہ اسکوریال اور کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے،

(۲) کتاب العین فی مدح سید الکونین۔ نعتیہ قصائد کا مجموعہ ہے، جو حروف تہجی کے مطابق مرتب کیا گیا ہے، اور وہ برلن میں موجود ہے،

(۳) قصیدہ نحویہ ایک قصیدے میں مقصور و ممدود اور دوسرے میں ض اور ظا کے تلفظ میں فرق بتایا گیا ہے، اور یہ دونوں قصیدے پیرس میں ہیں۔

(۴) نظم فصیح ثعلب و التسہیل حفظ اس کا ایک نسخہ پیرس میں ہے۔

(۵) وسیلۃ الآبق۔ یہ چند رجزوں کا مجموعہ ہے، جس میں ابونعیم کی روایت کے مطابق صحابہ اور تابعین کے نام جمع کیے ہیں، اس کا ایک نسخہ جزائر کے کتب خانہ میں ہے۔

(۶) قصائد فی مدح النبی و مواضع اخری پیرس میں ہے (الدرر الکامنہ ج ۱)

۱۱۔ القیراطی المتوفی ۷۸۱ھ | برہان الدین ابواسحاق ابراہیم بن عبد اللہ بن محمد بن عسکر بن مظفر بن شادلی بن ہلال القیراطی الطائی نے قاہرہ میں اپنے زمانہ کے علماء کی صحبت اختیار کی، اور متعدد مقامات میں درس لیا۔ اور ۷۸۱ھ میں مکہ میں وفات پائی، اس کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) مطلع النیرین۔ یہ دیوان نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہے، اور اس میں نظم و نثر میں وہ خط و کتابت ہے، جو اس میں اور جمال الدین بن نباتہ میں ہوئی ہے، یہ دیوان ۱۲۹۷ھ میں مصر میں چھپا ہے،

(۲) الوشاح المفصل فی خلق الشباب المحصل یہ دوسرا ادبی مجموعہ ہے اس کا ایک نسخہ گوٹا میں ہے، اس کے متفرق قصائد برلن اور پیٹرسبرگ میں ہیں۔ (الدرر الکامنہ ج ۱)

۱۲۔ ابن مکانس المتوفی ۷۹۴ھ | وزیر فخر الدین ابوالفرج عبد الرحمن بن عبد الرزاق، القبطی ممتاز شاعر تھا، اور اس کی تصنیفات یہ ہیں۔

(۱) دیوان انشا۔ اس کے لڑکے فضل اللہ مجد الدین نے اس کو جمع کیا، اور اسکے نسخے برلن، منشن، پیرس، برٹش میوزیم اور کتب خانہ خدیویہ وغیرہ میں ہیں۔

(۲) بہجۃ النفوس الاوانس بمختصر دیوان المجد بن مکانس، عبد اللہ الادکاری نے ۱۰۵۲ھ میں اس کا اختصار کیا۔ اور اس کا ایک نسخہ گوٹا میں ہے۔ اس کے دو جز لیڈن

ایک قصیدہ برلن میں اور دوسرا برٹش میوزیم میں ہے۔

١٣- ابن حجۃ الحموی المتوفی سنہ ۸۳۷ھ | ابوالمحاسن تقی الدین ابو بکر بن علی بن عبداللہ بن حجۃ الحموی القادری سنہ ۷۶۷ھ میں حماۃ میں پیدا ہوا، اور ازراری کے لقب سے شہرت پائی۔ تحصیل علم کے لیے موصل، دمشق اور قاہرہ کا سفر کر کے اپنے وطن کو واپس آیا۔ پھر مؤید شیخ کے زمانہ میں مصر کا قصد کیا، اور سرکاری عہدے حاصل کیے اور حماۃ میں وفات پائی

اس کی علمی یادگاریں حسب ذیل ہیں۔

(۱) خزانۃ الادب و غایۃ الارب یا تقدیم ابی بکر۔ یہ قصیدہ بردہ کے طرز اسکے قافیہ اور اس کے وزن پر ایک نعتیہ نظم ہے، یہ بدیع کے تمام انواع پر مشتمل ہے۔ اور اس میں اس نے ان کی اچھی طرح شرح کی ہے، وہ مصر میں متعدد بار یعنی ۱۲۷۳ھ، ۱۲۹۱ھ، سنہ ۱۳۰۴ھ میں چھپ چکی ہے۔ اور اس کا ایک قلمی نسخہ ۵۰۲ بڑے صفحات میں کتب خانہ خدیویہ میں ہے۔

(۲) ثمرات الاوراق۔ محاضرات کی کتاب ہے۔ اور اس میں بہت سے ایسے تاریخی اور ادبی فوائد ہیں، جن کی ضرورت مجلسوں میں ہوتی ہے، اور اس کے تتمہ میں مؤلف کا سفرنامہ ہے، جس کا سلسلہ مصر سے شروع ہو کر دمشق میں ختم ہوا، اس نے اس کے ذریعہ سے ان دونوں شہروں کا حال لکھا ہے۔ وہ مصر میں متعدد بار چھپ چکا ہے جن میں ایک بار سنہ ۱۳۰۰ھ میں چھپا ہے۔

(۳) تاہیل الغریب ادب میں ہے، اور ثمرات الاوراق کا تتمہ ہے، اور اس کے موضوع کی ترتیب وہی ہے، جو ثمرات الاوراق کی ہے، سنہ ۱۳۰۰ھ میں مصر میں ثمرات الاوراق کے ساتھ چھپا ہے۔

(۴) کشف اللثام فی التوریہ والاستخدام اس میں بدیع کی مختلف صنعتوں پر بحث ہے اور بیروت میں ۱۳۱۲ھ میں چھپ گئی ہے۔

(۵) قہوۃ الانشا، معاصرین مولف کے سرکاری وغیر سرکاری خطوط کا مجموعہ اور اس دور کے ممتاز لوگوں کے ادب و انشا کی زندہ تصویر ہے، اور اس کا ایک نسخہ کتب خانہ خدیویہ اور اسکوریال میں ہے۔

(۶) الثمرات الشہیۃ فی الفواکہ الحمویہ اس کے اشعار کا مجموعہ ہے، اور برلن، کتب خانہ خدیویہ اور اسکوریال میں موجود ہے۔

(۷) ثبوت الحجۃ علی الموصلی والحلی لابن حجۃ۔ صفی الدین الحلی اور عزالدین الموصلی کے بدیع پر ایک تنقیدی بحث ہے، اور برلن میں موجود ہے۔

(۸) مجری السوابق۔ گھوڑوں کی گھوڑدوڑ کے متعلق چند قصائد کا مجموعہ ہے جن میں بعض قصیدے اس کے اور بعض ابن نباتہ کے ہیں، اور اس کا ایک نسخہ گوتا میں ہے۔

(۹) تغرید الصادح۔ برلن میں ہے۔ اور اس کے دوسرے قصائد بڑے بڑے کتب خانوں میں ہیں۔ (باقی)

اقبال کامل

اس میں ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے شاعرانہ کارناموں کے اہم موضوعوں یعنی خلیفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریۂ ملت، تعلیم سیاست، صنعت لطیف (صنعت و فنون لطیفہ) اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

طبع چہارم قیمت ۱۲-۵۰ "منیجر"

پچاسی سالہ جشن تعلیمی ندوۃ العلماء لکھنؤ

از محمد نعیم ندوی صدیقی، رفیق دار المصنفین

ندوۃ العلماء کی تاسیس سنہ ۱۸۹۴ء میں ہوئی، اس کا آغاز ایک ہمہ گیر علمی و دینی اور تعلیمی و اصلاحی تحریک کی حیثیت سے ہوا، اور اس نے اپنے بانیوں کے اخلاص و للہیت کے باعث بہت قلیل عرصہ میں نہ صرف پورے ملک بلکہ بیرون ملک کی توجہ بھی اپنی طرف مبذول کرلی۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں بمقام کانپور ندوۃ العلماء کا پہلا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ اور اس کے بعد پھر ہر سال مختلف مقامات پر اس کے جلسے بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوتے رہے، لیکن بعض وجوہ سے یہ مفید سلسلہ صرف ۲۳ سال تک جاری رہ سکا۔ اس کا آخری اجلاس نومبر ۱۹۱۲ء کو امرتسر میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے بعد پھر تقریباً نصف صدی تک مختلف اسباب کی بنا پر اس کا کوئی اجلاس نہیں ہو سکا تھا۔ اس طویل مدت میں ندوۃ العلماء کی مقبولیت شہرت اور عظمت کے غلغلہ سے عالم اسلام ہی نہیں پوری دنیا گونج اٹھی ہے، اسلئے وقت کا اہم تقاضا تھا کہ اس کی تاسیس کا پچاسی سالہ جشن منعقد کیا جائے۔ چنانچہ کارکنان ندوۃ العلماء نے دو سال قبل ایک بین الاقوامی اجتماع "جشن تعلیمی" کے نام سے منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس میں ندوہ کی تعلیمی اسکیم کا تعارف نیز جدید تعلیمی مسائل پر تبادلہ خیال اور باہم مفید نظریات سے استفادہ کا موقع مل سکے۔ اور ہندوستان کے معدن بے بہا مین

جن اہل علم اور اصحاب دعوت وعزیمت نے جو اصلاحی، علمی کارنامے انجام دیئے۔ اور یہاں کے عربی مدارس اور دینی اداروں نے مغربیت کے سیل رواں کا جس طرح جم کر مقابلہ کیا اسکی صحیح تصویر ممالک عربیہ اسلامیہ اور دوسرے ملکوں کے مندوبین کے سامنے آجائے۔

اس جشن تعلیمی کی تیاریوں میں ہماہمی اور جوش وخروش اس وقت پیدا ہوا جب آخری طور پر ۲۰ اکتوبر تا ۳ نومبر ۱۹۷۵ء کی تاریخیں اس کے لیے طے کر دی گئیں، چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق گذشتہ دنوں یہ اجلاس منعقد ہوا۔ جو نہ صرف نظم وشائستگی اور ظاہری وصوری محاسن بلکہ اپنی افادیت ومعنویت میں بھی دیرینہ اعلیٰ روایات کا کامل نمونہ تھا، اس کو بلا شبہ ہر حیثیت سے ایک تاریخی اور یادگاری اجلاس کہا جا سکتا ہے۔ یوں تو اس مہرجان کو کامیاب بنانے اور اس کی شایان شان تیاریوں میں تمام کارکنان ندوۃ العلماء نے مثبتی اسپرٹ کے ساتھ شب وروز محنت وجد وجہد کی ہے، لیکن اس کی کامیابی کا اصل مرجع ومنبع مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی ذات گرامی ہے، یہ محض ان کے اخلاص حسن نیت اور بے لوثی کا ثمرہ تھا، کہ ان کی دعوت پر پورے عالم اسلام کے بہترین دماغ اور ممتاز اہل فکر و دانشور اتنی کثیر تعداد میں مجتمع ہوگئے، کم از کم ہندوستان کی تاریخ میں اس کی مثال شاید ہی مل سکے کہ کسی موقع پر بیک وقت اس قدر بلند مرتبہ اور اعلیٰ پایے کے ۶۷ غیر ملکی مہمان کسی شخصی دعوت پر یکجا ہو گئے ہوں، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود نے کرسی صدارت کو زینت دے کر اس اجلاس کے وزن اور وقار میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے، ہندوستان کے جن علماء وفضلاء، ادباء وشعراء، اور اہل ذہل داعیان قوم نے اس جشن میں شرکت کی ان کی تعداد تو حد شمار سے باہر ہے، صرف غیر ملکی مندوبین کی فہرست بھی بہت طویل ہے (جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔) ذیل میں صرف

مختصراً اجلاس ممالک اور اداروں کے نمائندوں کی تعداد کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مصر (۶) سعودی عرب (۳) اور اصل یہاں سے کئی وفود آئے تھے، سرکاری وفد میں نو، مدینہ یونیورسٹی کے وفد میں ۳ اور ملک عبد العزیز یونیورسٹی کے وفد میں ۳ ارکان تھے، اس کے علاوہ مدرسہ صولتیہ مکہ سے تین، دار الافتاء ریاض سے تین، اور رابطہ عالم اسلامی مکہ سے دو نمائندوں پر مشتمل وفود آئے تھے، متحدہ عرب امارات (۹) قطر (۲) کویت (۰) شام (۵) عراق (۳) ایران (۲) اردن (۲) بحرین (۲) الجیریا (۱) روس (۱) یوگنڈا (۲) نیپال (۱) تھائی لینڈ (۱) جاپان (۱)

مذکورہ بالا تمام غیر ملکی مندوبین کی اکثریت ۳۰ اکتوبر ہی کو لکھنؤ پہونچ چکی تھی جن کے قیام کا حسب امکان شایان شان انتظام اودھ کلارک اور گلمرگ ہوٹلوں میں کیا گیا تھا۔ پروگرام کے مطابق ۳۱ اکتوبر کو ٹھیک ساڑھے نو بجے افتتاحی اجلاس کا آغاز ہوگیا۔ شروع سے آخر تک اس جشن کے اسٹیج سکریٹری کے فرائض مولانا محمد رابع صاحب ندوی نے انجام دیئے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ موصوف بہت ہی حسن و خوبی سے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئے۔ وسیع و عریض اور خوبصورت ڈائس پر عرب مہمانوں کی قطاریں بڑا دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔ عرب ملکوں کے نمائندے عام طور پر عربی لباس یعنی سفید توب سر پہ رومال اور اس پر سیاہ عقال میں ملبوس تھے۔ قاری ذرو دالحی ندوی کی تلاوت قرآن پاک سے اجلاس کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی اس کے بعد طلبہ نے ندوہ کا ترانہ پیش کیا۔ جس کا ہر ہر بند ندوۃ العلماء کے بلند عزائم و مقاصد اور اعلیٰ نصب العین کا آئینہ دار ہے

ہم نازش ملک و ملت ہیں ہم ہیں درخشان صبح وطن
ہم تابش دیں، ہم نور یقیں، ہم حسن عمل، ہم خلق حسن

پھر صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد، صدر جمہوریہ مصر انور السادات، فرمانروائے سعودی عرب شاہ خالد بن عبد العزیز اور وزیر اعلیٰ اتر پردیش مسٹر ہیموتی نندن بہوگنا کے وہ پیغامات سنائے گئے۔ جو اس خاص موقع کے لیے ارسال کیے گئے تھے، پیغامات کا اصل متن اور اس کا عربی ترجمہ دونوں پڑھے گئے۔ اس کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خطبۂ استقبالیہ پڑھا گیا۔ جو عربی میں تھا۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا محمد عمران خاں ندوی نے سنایا، (یہ دونوں مطبوعہ تھے، جلسہ گاہ میں بھی اس کی کاپیاں تقسیم کی گئیں، اور اردو ترجمہ تعمیر حیات میں بھی پہلے طبع ہو چکا ہے) اس میں حضرت مولانا مدظلہ نے مہمانان کرام اور فکر کارے اجلاس کا لکھنؤ کی سرزمین پر پُرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے بڑی جامعیت اور توازن و اعتدال کے ساتھ ہندوستان میں اسلام کی آمد اور مختلف ابتلاء و آزمایش کے ادوار سے گذرتے ہوئے اس کے عروج و ارتقا کی داستان بیان کی، ہندوستان کے علماء اور دینی مدارس نے جو مختلف روشن خدمات اور کارنامے اس سرزمین میں انجام دیئے ان کا بھی بڑے موثر انداز میں ذکر کیا تھا، یہ خطبہ عربی اور اردو دونوں میں نہایت سکون سے سنا اور پسند کیا گیا۔ اس کے بعد شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود نے اپنا خطبۂ صدارت خود پڑھا جس میں انھوں نے سب سے پہلے ندوۃ العلماء کی مختلف میدانوں میں قابل تحسین و آفریں مساعی وجدوجہد اور خدمات و کارناموں کا اعتراف کیا جو اس نے ۸۵ سال کی طویل مدت میں انجام دیے ہیں، پھر عرب و ہند کے تعلقات کے آغاز پر روشنی ڈالی، اور اس سلسلہ میں البیرونی اور اس کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "بیرونی کی کتابوں کے ہی ذریعہ صدیوں پہلے عالم عرب کے تعلیم یافتہ طبقہ کو ہندوستان سے تعارف حاصل ہوا"۔ اس کے بعد

ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کے نمایاں رول کو بڑے موثر انداز اور
شاندار الفاظ میں واضح کیا۔ اور حب وطن اور جادۂ حق وصواب پر ثبات قدمی کو اسلام
کا بنیادی اصول قرار دیتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ ہمیشہ اس راہ
اور اس اصول پر قائم رہیں۔ اس کے علاوہ شیخ موصوف نے عربی زبان کی اہمیت،
تہذیب کے تقاضوں اور صاف ستھرے معاشرہ (یعنی اسلامی طرز معاشرت) پر بڑی
جامعیت سے روشنی ڈالی۔ آخر میں ہند و مصر کے درمیان گہرے اور قدیم روابط
کا بھی ذکر کیا۔ بلاشبہ امام الاکبر کے صدارتی خطبہ کا ہر لفظ اخوت اسلامی اور وحدت
ایمانی کا آئینہ دار اور ہر حیثیت سے ان کے اعلیٰ مرتبہ و مقام کے شایان شان تھا
عربوں کو خدا نے قدرت زبان اور اظہار و ابلاغ کی جس غیر معمولی قوت سے نوازا
یہ خطبہ اس کا شاہکار تھا، باوجودیکہ سامعین کی اکثریت عربی زبان سے قطعی ناواقف
لیکن جب تک خطبۂ صدارت پڑھا جاتا رہا اور اجمع پرسکون ہو کر گوش برآواز رہا
اس سکون و وقار اور غیر معمولی نظم وضبط کی مثال ایسے مواقع پر شاذ و نادر ہی مل سکتی
ہے جس کا اعتراف مولانا علی میاں نے افتتاحی اجلاس کے آخر میں اپنی تقریر میں بھی
کیا۔ عربی خطبۂ صدارت کا اردو ترجمہ استاذی مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی
(مدیر البعث الاسلامی) نے سنایا۔ جو سلاست و شگفتگی اور حسن ادب و انشاء میں اصل
خطبہ کا مثنیٰ تھا۔ اسی اجلاس میں شیخ الازہر نے جامعہ ازہر کی جانب سے قرآن مجید کا
ایک بیش قیمت نسخہ اور کتابوں کا ایک مجموعہ بطور ہدیہ ندوہ کو دیا۔ اس کارروائی
کے بعد افتتاحی اجلاس ختم ہو گیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ اس لئے خاتمۂ اجلاس کے کچھ ہی
دیر بعد شیخ الازہر کی امامت میں ہزاروں کے مجمع نے نماز جمعہ ادا کی۔

اسی دن سہ پہر کو مصر کے وزیر اوقاف وامور ازہر ڈاکٹر حسین ذہبی نے ایک علمی وثقافتی نمائش کا افتتاح کیا۔ جو کتب خانہ ندوۃ العلماء میں خاص اس مہرجان کے لیے ترتیب دی گئی تھی، یوں تو اس جشن کا ہر ہر پروگرام افادیت ومعنویت سے بھرپور اور اپنی جگہ جاذب نظر تھا۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کی علمی وثقافتی نمائش ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی بالکل منفرد چیز تھی۔ اس نمائش کا خاکہ جناب مولوی اسحاق جلیس ندوی (مدیر تعمیر حیات) نے تیار کیا تھا۔ اور موصوف نے اس کی تیاری کے سلسلہ میں جس طرح شب وروز تگ ودو کی وہ قابل رشک بھی ہے اور لائق صد آفرین بھی۔ ان کی اور ان کے معاونین کی اس محنت اور جانکاہی کا نتیجہ ہے کہ یہ نمائش اس جشن کا ایک اہم ترین اور پرکشش حصہ بن گئی تھی۔

اس نمائش کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون کے ارتقاء کی ایک بہت روشن اور جگمگاتی ہوئی تصویر نظر کے سامنے آجاتی تھی۔ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری سے لے کر عصر حاضر تک کے ممتاز باکمال مفسرین، محدثین، فقہاء، مورخین اور فلاسفہ وغیرہ کے نام، سنہ وفات اور ان کی مشہور تصانیف کے بڑے بڑے چارٹ اور نقشے ڈسپلے بورڈوں پر حسن سلیقہ سے آویزاں کئے گئے تھے۔ ہندوستانی علماء وفضلاء نے اصول حدیث وفقہ، فن اسماء الرجال، عربی زبان ولغت، عقائد وکلام، حکمت وفلسفہ، ریاضیات، ہیئت وہندسہ، علوم قرآن، صرف ونحو، تجوید وقراءت اور علم اخلاق وغیرہ علوم پر جو تصنیفی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کا ایک اجمالی خاکہ ان چارٹوں میں پیش کیا گیا تھا۔ اسی طرح "عباقرۃ الاسلام فی الہند" کے عنوان سے شعراء وسلاطین وادباء اور علماء ومشائخ کی

فہرستیں بھی متعدد چارٹوں میں درج تھیں ہندوستان میں اپنے موضوع پر جو کتابیں منفرد سمجھی جاتی ہیں ان کا ذکر بھی ایک مستقل چارٹ میں کیا گیا تھا کتبخانہ ندوۃ العلماء کے جس مشرقی حصہ میں ان خوبصورت و دیدہ زیب چارٹوں کے وسیع و عریض مگر سبک و حسین ڈسپلے بورڈ قرینے سے سجائے گئے تھے۔ وہ ذوق شناسان علم کی توجہ کا خصوصی مرکز تھا۔ خود راقم سطور نے ملک کے نامور اہل علم و فضل کو اس گوشہ میں محویت کے عالم میں پایا۔ بعض لوگ تو پورا پورا چارٹ نقل کرتے بھی دیکھے گئے واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی ارباب فضل و کمال نے اسلامی علوم و فنون کی ہر شاخ کو جس طرح ثمر بار کیا ہے۔ اس نمائش سے اندازہ ہوا کہ شاید کسی دوسرے خطۂ ارض میں اس کی مثال کم ہی مل سکے گی۔ چنانچہ ایک چارٹ ایسا بھی نظر آیا جس میں ہندوستان کے ان باکمالوں کی فہرست درج تھی۔ جن کی نظیر دوسرے ممالک میں مفقود ہے۔

کچھ ڈسپلے بورڈوں پر تحریک ندوۃ العلماء کی تاسیس اور اس کے اغراض و مقاصد کو اکابر ندوہ کے اقوال کی روشنی میں نمایاں کیا گیا تھا۔ چنانچہ جن اصحاب فکر و نظر کے قیمتی ارشادات پیش کئے گئے تھے، اُن میں حاجی امداد اللہ مکیؒ علامہ شبلی نعمانیؒ مولانا محمد علی مونگیریؒ۔ مولانا حالی، مولانا ابو الکلام آزاد، سر سید، نواب محسن الملک، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا ابو الحسن علی ندوی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ایک بڑے چارٹ میں ندوۃ العلماء کی تاریخ ساز اجلاسوں کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی لکھنؤ، مدراس، پونا اور ناگپور کے قدیم اجلاسوں کے اشتہارات، دعوت نامے اور شناختی کارڈ آویزاں کر کے قصۂ پارینہ کی بازخوانی سے بچنے کی

داغ تازہ کئے گئے تھے، ان کو دیکھکر حیرت ہوتی تھی کہ آج سے نصف صدی سے بھی زائد پہلے کتنے ترقی یافتہ طرز پر اجلاس کا کام ہوتا تھا، اس زمانہ میں مندوبین کو جو شناختی کارڈ جاری کئے جاتے تھے۔ اس کے مختلف مراتب تھے، مثلاً سامع رکن، عالم اعزازی طالب علم اور معاون وغیرہ۔ (جیسا کہ حالیہ اجلاس کے موقع پر مندوبین استقبال اور معاونین تین قسم کے بیج دئے گئے تھے۔) اس ڈسپلے بورڈ کے پاس پہونچکر ہر شخص تھوڑی دیر کے لیے عہد رفتہ میں پہونچ جاتا جب تحریک ندوۃ العلماء کے آغاز نے ہندوستان کے پُرسکون سمندر میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ اور علمی و تعلیمی حلقے اسکی ضرب کلیم سے چونک اٹھے تھے۔ ایک علیحدہ ڈسپلے بورڈ پر فرزندانِ ندوہ کے تصنیفی کارنامے اجاگر کیے گئے تھے، جن ممتاز ندوی اہل قلم نے مختلف علمی و ادبی موضوعات پر اپنی تصنیفات کا قابل ذکر ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، اُن کے ناموں اور کارناموں کے مستقل چارٹ آویزاں تھے، ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی مولانا ریاست علی ندوی، شاہ معین الدین ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، رئیس احمد جعفری، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد حنیف ندوی کے نام شامل تھے، اس کے قریب ہی ایک اور بڑے سے نمائشی بورڈ پر سَو سے زائد ممتاز و معروف ندوی اصحاب قلم کے ناموں کا چارٹ آویزاں تھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فضلاء ندوہ علم و ادب کے میدانوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

ہر نمائشی بورڈ اور چارٹ کے سامنے ایک میز پر وہ تمام کتابیں سلیقے سے سجائی گئی تھیں جن کا ذکر اسکے اوپر آویزاں نقشہ میں تھا، ... کتب خانہ ندوۃ العلماء میں علوم اسلامیہ ہند کی اس جوئے شیر کو رواں دیکھکر ہر شخص بے حد متاثر ہوا۔ ایک میز پر

طلبۂ دارالعلوم کے قلمی آرگن "الاصلاح" کی پرانی جلدیں اور ان کے عربی زبان میں لکھے ہوئے سندی مقالات بھی کثرت سے رکھے گئے تھے۔ ایک شوکیس میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا مونگیری، مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور حکیم سید عبدالحئی کے اوریجنل مکاتیب بھی تھے، اسی طرح ایک دوسرے شوکیس میں مشاہیر کی مطبوعہ کتابوں کے اصل مسودات بھی رکھے گئے تھے جن میں علامہ شبلی کی سوانح مولانا روم، مولانا عبدالسلام ندوی کی تاریخ تمدن اسلامی، مولانا ریاست علی ندوی کی تاریخ صقلیہ اور شاہ معین الدین ندوی کی حیات سلیمان کے قلمی مسودے ۔۔۔۔ تھے جن سے ان فضلاء کے شان خط اور طرز تحریر کا اندازہ ہوتا تھا۔

کتب خانہ کے مرکزی ہال میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مستقبل کا ہمہ گیر منصوبہ ایک بہت وسیع وعریض بورڈ پر نقشہ کی شکل میں بنا ہوا تھا۔ جو خوبصورت و دل آویز بھی تھا اور ندوہ کے مستقبل کا آئینہ دار بھی اور ساتھ ہی فن کاری کی مہارت اور آرٹ کا عمدہ نمونہ بھی۔ اس کو لکھنؤ کے گورنمنٹ آرٹس کالج کے ڈی ایل ساہ نے بنایا تھا۔ ہال کے درمیان میں متعدد شوکیسوں میں کتب خانۂ ندوۃ العلماء کے نادر و کمیاب مخطوطات کو سجایا گیا تھا اس کتب خانہ میں مطبوعات کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ اور مخطوطات بھی تین ہزار کے قریب ہیں۔ ان میں بعض کتابوں کے قلمی نسخے مختلف حیثیتوں سے کمیاب بلکہ نادر الوجود ہیں۔ بعض مخطوطات اپنے طلائی نقش و نگار اور رنگا رنگ آرٹ کے باعث قابل دید ہیں۔ مثلاً تفسیر میں امام نورالدین عبدالرحمن بن عمر الحنبلی (المتوفی ۷۶۴ھ) کی تالیف "منتہی العلوم فی تفسیر کتاب اللہ الحی القیوم" نہ صرف ابھی تک غیر مطبوعہ بلکہ نادر کتاب ہے اس کی کتابت مؤلف کی زندگی ہی میں ہوئی تھی۔ اور کثرت سے علماء نے اسی نسخہ میں

مؤلف سے پڑھا تھا، جن کے نام آخر کتاب میں مندرج ہیں، اس کے کاتب کا نام محمد بن یحی المقری ہے۔ سنہ کتابت ۸۶۳ھ درج ہے۔

اسی طرح کتاب الایضاح شرح التلخیص المفتاح مولفۂ علامہ جلال الدین قزوینی (المتوفی ۷۳۹ھ) کا خطی نسخہ بہت نادر اور قدیم ہے۔ ۷۸۲ھ میں اس کی کتابت ہوئی ہے، ان کے علاوہ نمائش کے لئے رکھے گئے مخطوطات میں سے کچھ اہم یہ ہیں،

(۱) راگ درپن مؤلفہ سیف الدین محمود، علم موسیقی میں نادر کتاب ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد مغلیہ میں موسیقی کا فن کتنا ترقی یافتہ تھا (۲) شاہ نامۂ فردوسی، اس مشہور کتاب کے متعدد خطی نسخے کتب خانۂ ندوۃ العلماء میں ہیں، سب میں خوبصورت رنگوں اور مطلا جدول سے مزین تصاویر کثرت سے شامل ہیں۔ (۳) شرح شرح نخبۃ الفکر مولفہ شیخ وجیہ الدین العلوی الگجراتی (المتوفی ۹۹۸ھ) اس پر ایک مہر ثبت ہے، جس پر یامحمود ۱۱۳۹ھ کندہ ہے، ابھی تک کہیں طبع نہیں ہوئی ہے۔ سن کتابت ۱۱۳۹ھ (۴) تذکرۃ الشعراء مصحفی اس حیثیت سے یہ ایک نادر مخطوطہ ہے کہ اس کے بیشتر اجزاء خود مصحفی کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں، سنہ کتابت ۱۲۰۰ھ ہے۔ (۵) دیوان آزاد بلگرامی۔ سرو آزاد اور مآثر الکرام کے مصنف آزاد بلگرامی کا ایک مجموعہ کلام سبعۂ سیارہ کے نام سے عام طور پر معروف ہے۔ پیش نظر دیوان اس کے علاوہ ہے یہ ابھی تک شرمندۂ طباعت نہیں ہو سکا ہے، جہاں تک علم ہے کسی دوسرے کتب خانے میں اس کے مکمل مخطوطے کا وجود نہیں ہے۔

(۶) دیوان شاہ ولی اللہ دہلوی۔ اس کو شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے مرتب کیا ہے، بہت نادر مطبوعہ نسخہ ہے، اس سے شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے لکھے ہوئے

.ذوقِ شعر و سخن کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے کاتب کا نام اسحاق بن محمد رائے بریلوی
ہے جو شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ کے تلمیذ رشید تھے۔ (اس دیوان کی اصلیت کے
بارے میں بعض محققین شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں) (۷) عجائب المخلوقات مولفہ
عماد الدین زکریا القزوینی (المتوفی ۶۸۲ھ) اصل کتاب عربی میں تھی ۹۵۴ھ
میں فارسی میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ یہ اسی ترجمہ کا خطی نسخہ ہے۔ پوری کتاب مصور ہے
جس میں عجیب و غریب مخلوقات جن میں سے بعض کا وجود بھی نہیں ہے۔ رنگین تصویروں
کے ذریعہ متعارف کرائی گئی ہیں۔ (۸) قرآن مجید اس نمایش میں کلام پاک کے
متعدد خوبصورت مطلا اور مذہب قلمی نسخے رکھے گئے تھے ان میں سے ہر ایک دامنِ دل
کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ لیکن ایک قرآن خصوصیت کے ساتھ قابل دید تھا اس کا
سائز ۱۸ × ۲۴ ہے اور خط بہار میں لکھا گیا ہے۔ ماہرین مخطوطات کی رائے ہے
کہ اس قرآن کا طرز کتابت خطاطی کے بعد اندلس کے اسلامی دورِ حکومت میں
رائج تھا۔ جس کو تقریباً پانچ سو سال کا عرصہ گذر گیا یہ نسخہ تکمیل الطب کالج لکھنؤ
کے پرنسپل حکیم ضیاء الدین صاحب نے ندوہ کو ہدیۃً عنایت کیا ہے۔ (۹) ترجمہ مہابھارت
اصل کتاب سنسکرت میں ہے۔ ابو الفیض فیضی نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا ہے یہ خطی
نسخہ شاہ اکبر گورگانی نے گرو نانک جی کو ہدیہ کیا تھا۔ اس کے سرورق پر شاہ عالم
کے نام کی ایک مہر بھی ثبت ہے۔ منشی منوہن لال نے ۱۲۰۰ھ میں اس کی کتابت کی
تھی۔ (۱۰) نفحات الانس۔ اس مخطوطہ کی ندرت یہ ہے کہ اس پر بہت سے سلاطین
کی مہریں اور شاہ عالم نیز شہزادی زیب النساء کے دستخط ثبت ہیں۔ (۱۱) تکملہ فتح العزیز
شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی مشہور تفسیر فتح العزیز کا تکملہ جو مولانا حیدر علی اشرف آبادی

والیۂ بھوپال سکندر جہاں بیگم کے ایما پر لکھا ہے، صفحۂ اول پر "محمد جمال الدین مدار المہام ۱۲۶۰ھ" کی مہر ثبت ہے۔ ہنوز غیر مطبوعہ اور نایاب ہے۔ (۱۲) مواہب علیہ ملا حسین واعظ کاشفی۔ مکتوبہ سنہ ۱۰۰۱ھ حسن کتابت اور تزئین و آرائش کا عمدہ نمونہ ہے پہلے صفحہ پر "خواجہ عزیز اللہ خان" کی مہر ثبت ہے۔ (۱۳) مسند عبد بن حمید اس کے مولف شیخ ابومحمد عبد بن حمید الکشی (المتوفی سنہ ۲۴۹ھ) امام بخاری و مسلم کے کبار اساتذہ میں تھے، یہ مخطوطہ مولانا شمس الحق عظیم آبادی صاحب غایۃ المقصود کے نسخہ کی نقل ہے، فتح محمد النظامانی نے سنہ ۱۳۱۰ھ میں اس کی کتابت کی ہے یہ ایک نادر اور ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ (۱۴) انوار التنزیل و اسرار التاویل مولفہ قاضی عبد اللہ بن عمر البیضاوی (المتوفی سنہ ۶۸۵ھ) کتابت و آرٹ کا بہترین نمونہ ہے (۱۵) نیل الاوطار من اسرار منتقی الاخبار تالیف علامہ بدر الدین شوکانی (المتوفی سنہ ۱۲۵۰ھ) یہ حافظ ابن تیمیہ کی کتاب منتقی الاخبار کی شرح ہے۔ اس خطی نسخہ پر کتاب کا نام خود مؤلف کے قلم سے لکھا ہوا ہے، اس سے شیخ ہادی حسن بن حسین اور بعض دوسرے علماء نے پڑھا ہے، آغاز میں "محمد جمال الدین مدار المہام" کی مہر ثبت ہے۔

اسی دن شام کو بعد نماز مغرب دوسرے اجلاس کا آغاز ہوا، تلاوت کلام پاک کے بعد پہلے مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی (معتمد دار العلوم ندوۃ العلماء) نے ندوہ کے پچاسی سالہ کارناموں کی رپورٹ پیش کی (۲۰۰ صفحات پر مشتمل یہ رپورٹ بروقت جلسہ گاہ میں تقسیم بھی کر دی گئی تھی) - - - - - - - - - - - اس میں ندوۃ العلماء کے ماضی کی مختصر سرگذشت کے ساتھ حال کا جائزہ اور مستقبل کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ موصوف نے اپنے مخصوص شگفتہ اور دلکش اسلوب

نگارشی مجلہ ندوہ کی تاریخ اور تعلیمی و اصلاحی میدانوں میں اس کے کارہائے نمایاں کی تفصیل اکابر ندوہ کی خدمات اور آئندہ اس کے عزائم و مشروعات کا بھرپور جائزہ اس دستاویز میں پیش کیا تھا۔ وقت کی تنگی کے باعث اس کو بتمام وکمال پڑھا نہ جاسکا بلکہ اس کے صرف اہم اور ضروری اقتباسات سنائے گئے۔

اس کے بعد حسب پروگرام حاضرین اجلاس سے غیر ملکی معزز مہمانوں کا تعارف کرایا گیا، وقت کی تنگی ..... کے باعث صرف اہم مہمانوں ہی کا تعارف ہو سکا عرب وفود کے سربراہوں نے اپنی چند منٹ کی مختصر تقریروں میں اس جشن تعلیمی میں اپنی شرکت کو مایۂ صد افتخار و سعادت قرار دیتے ہوئے۔ ندوۃ العلماء اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کیساتھ اپنے ملکوں کے گہرے تعلق کا اظہار کیا۔ اور یہ بھی ذکر کیا کہ عالم اسلام کا چپہ چپہ ان دو لازم و ملزوم ناموں سے نہ صرف واقف بلکہ ان کا صحیح قدرشناس ہے۔ اس اجلاس میں کویت کی وزارت اوقاف و انصاف کی جانب سے ندوہ کو ایک قرآن مجید اور کتابوں کا ہدیہ پیش کیا گیا۔ اسی طرح مصر کی جانب سے بھی کتابوں کا عطیہ دیا گیا۔

اسی دن شب میں اترپردیش کے وزیر اعلیٰ بہوگن جی نے اپنی رہائش گاہ پر اس مہرجان میں شرکت کرنے والے ملکی اور غیر ملکی مندوبین کو ایک پر تکلف عشائیہ دیا۔

یکم نومبر کی صبح اس مہرجان کا تیسرا اجلاس ٹھیک وقت پر حسب سابق تلاوت کلام پاک سے شروع ہوا۔ نظام العمل کے مطابق یہ اجلاس تعلیمی مسائل پر مذاکرہ کے لیے مخصوص تھا، جس میں بیرون و اندرون ملک کے اہل فکر و دانش کو نظام تعلیم و تربیت، علوم اسلامیہ اور دینی تعلیم کے مستقبل اور ماضی وحال کی روشنی میں نصاب

تعلیم میں تغیر و ترمیم اور توسیع کی ضرورت پر اظہار خیال کرنا تھا۔ چنانچہ اس اجلاس میں جن شخصیتوں نے تعلیمی مسائل پر اظہار خیال کیا ان میں کچھ اہم یہ ہیں۔

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۲۔ شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود مصر

۳۔ پروفیسر علی محمد خسرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی۔

۴۔ ڈاکٹر حسین ذہبی وزیر اوقاف مصر۔

۵۔ پروفیسر شرف الدین میر محمود نمائندہ اعلیٰ دینی کونسل تاشقند۔

اول الذکر دونوں مقالے عربی میں تھے، تاہم سکون اور دلچسپی سے سنے گئے۔ شیخ ازہر کا مقالہ اپنی معنویت اور فصاحت زبان و بیان میں ان کے خطبۂ صدارت ہی کا ہم پایہ تھا۔ پروفیسر خسرو صاحب کو مدارس اسلامیہ میں صنعتی تعلیم کی ضرورت کے موضوع پر مقالہ پڑھنا تھا۔ اور غالباً وہ اپنا مقالہ ساتھ لائے بھی تھے، لیکن اسکو پیش کرنے کے بجائے انھوں نے اس موضوع پر تقریر کرنا پسند کیا۔ اور نہایت مؤثر و دلنشین الفاظ اور مسحور کن انداز بیان کے ساتھ اس سلسلہ میں اپنے ذاتی خیالات و آراء کا اظہار کیا۔ موصوف کی رائے تھی کہ اب دنیا کے حالات جس برق رفتاری سے بدل رہے ہیں علمائے کرام کے لیے ان سے واقفیت اشد ضروری ہے۔ اب ان کو مذہبی اور جدید تعلیمات کا خوشگوار امتزاج پیش کرنا چاہیے۔ پوری دنیا میں ہونے والی زبردست تبدیلی کے ضمن میں شتر مرغ جیسا رویہ اپنانا دانشمندی کے خلاف ہے اب وقت آگیا ہے کہ علماء پر دنیا اور دنیا والوں پر دین کے دروازے کھلنے چاہئیں جس طرح قدیم زمانہ میں مساجد کے ساتھ دینی مکاتب منسلک رہے ہیں اسی طرح

اب صنعتی اداروں کو بھی ان سے وابستہ کیا جانا چاہیئے۔ پروفیسر خسرو نے خیال ظاہر کیا کہ مدارس اسلامیہ میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو پیشہ ورانہ تربیت دینے کا انتظام کیا جانا چاہیے تاکہ وہ تعلیم سے فراغت کے بعد کارگاہ حیات میں قدم رکھیں تو معاش کی طرف سے بے فکر ہوں۔ اس سلسلہ میں موصوف نے یہ تجویز بھی رکھی کہ عربی و اسلامی مدارس میں ایسے ٹیکنیکل انسٹیٹوٹ قائم کئے جائیں، جن میں بجلی، گھڑی سازی، ریڈیو میکنک اور جوتا سازی وغیرہ کی تربیت دی جائے۔ پروفیسر خسرو کی یہ فکر انگیز تقریر ختم ہونے پر مولانا علی میاں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کے خیالات وتجاویز پر سنجیدگی سے غور کرنے کا وعدہ کیا۔ اور موصوف کے پُرخلوص جذبات واحساسات کو قابل قدر قرار دیتے ہوئے ان کی تعریف کی نیز یہ بھی کہا کہ پروفیسر خسرو نے ہم کو دراصل جھنجھوڑ دیا ہے۔

روسی نمایندے میر شرف الدین محمود نے جب اچانک اردو میں لکھا ہوا اپنا مقالہ اپنے مخصوص لب ولہجہ میں پڑھنا شروع کیا تو اس خلاف توقع بات پر سامعین میں ایک عجیب لہر سی دوڑ گئی۔ میر شرف الدین محمود نے روس میں مسلمانوں کے نظام تعلیم وتربیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ذکر کیا کہ وہاں کے مسلمان ندوۃ العلماء اور اس کے رسالہ البعث الاسلامی کے بڑے قدردان ہیں اور دینی تعلیمی اسکیموں میں اسی کو خضرِ راہ بناتے ہیں۔

اسی دن عصر کی نماز کے بعد غیر ملکی معزز مندوبین کے اعزاز میں طلبہ ندوۃ العلماء کی یونین انجمن جمعیۃ الاصلاح کی جانب سے ایک استقبالیہ جلسہ منعقد کیا گیا۔ جمعیۃ الاصلاح اور النادی العربی نے طلبہ کی ادبی، ثقافتی علمی اور تقریری مشق وتربیت کے میدان میں جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں ذمہ دار طلبہ نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں ان کا اجمالی تعارف کراتے ہوئے مہمانان کرام کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ ایک عرب نمایندے نے

چند منٹ میں طلبہ کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں کو سراہا۔ اور اس خیر مقدم کے لیے صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا۔

یکم نومبر کو بعد نماز مغرب مہرجان کے چوتھے اجلاس کی کارروائی حسب معمول تلاوت کلام پاک سے شروع ہوئی۔ صبح کی نشست میں ممالک اسلامیہ کے نظام تعلیم اور نصاب درس پر جو مذاکرہ (سیمینار) نامکمل رہ گیا تھا۔ شام کے اجلاس میں اسکے بقیہ حصہ کی کارروائی پوری کی گئی۔ اس میں جن ماہرین تعلیم اور اہل فکر نے اظہار خیال کیا ان میں کچھ اہم شخصیتیں یہ تھیں۔

۱۔ پروفیسر مسعود حسین خان وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

۲۔ پروفیسر تیسیر الظبیان صدر رابطہ علوم اسلامیہ اردن۔

۳۔ شیخ محمد علوی المالکی لکچرار ملک عبدالعزیز یونیورسٹی مکہ

۴۔ ڈاکٹر یوسف القرضاوی پرنسپل ٹریننگ کالج قطر

۵۔ ڈاکٹر عباس المہاجرانی چیف اڈیٹر ماہنامہ "الفکر الاسلامی" ایران

۶۔ شیخ احمد بن عبدالعزیز آل مبارک رئیس القضاء الشرعی ابوظبی

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی تقریر کا آغاز ہی ڈاکٹر علی محمد خسرو کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے کیا۔ موصوف کے خیال میں عربی مدارس میں صنعتی تعلیم کو داخل کر دینے سے ان کے قیام کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ انھوں نے فرمایا یہ درست ہے کہ دارالعلوم کے مقاصد کو پیش نظر رکھکر اس کے نصابی ڈھانچہ میں مناسب تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ تاکہ اس سے فارغ ہونے والے طلبہ احساس کمتری میں مبتلا ہوئے بغیر عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوسکیں۔ لیکن جہاں تک ان مدارس میں ٹیکنیکل انسٹیٹوٹ کے قیام کا معاملہ ہے اس سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر موصوف نے اسی تقریر میں

یورپ کے بارے میں جو یہ تنقیدی شعور پیدا کرنے پر زور دیتے ہوئے نئے نئے افق کی تلاش اور توسیع کی سمت پیش قدمی کرنے کی اہمیت ظاہر کی۔ عربی مدارس میں بعض نئے اقدامات کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کی سخت ضرورت ہے کہ طلبہ کو تنیر بذیر عرب بالخصوص شرق اوسط کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معاشرتی، سیاسی اور لسانی معلومات سے واقف کرایا جائے۔

اس خیال انگیز اور پرمغز تقریر کے ختم ہونے پر مولانا علی میاں نے فرمایا کہ عربی مدارس میں صنعتی تعلیم کا معاملہ واقعتہً آسان نہیں ہے یہ بڑا اچھا ہوا کہ آج ہی دو موقر یونیورسٹیوں کے فاضل سربراہوں کے باہم مختلف نقطہ نظر سامنے آگئے، اور بلاشبہ دونوں ہی نظریے قابل غور وفکر ہیں، انشاء اللہ وقت پر ان دونوں سے پورا استفادہ کیا جائے گا۔ جہاں تک طلبہ دارالعلوم کی عالم عرب سے واقفیت کا معاملہ ہے اس کا پورا سامان بحمد اللہ ہمارے یہاں موجود ہے اور طلبہ اس سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔

آج کے اس اجلاس کی ایک اہم تقریر قطر کے مشہور ادیب ومصنف اور جادو بیان مقرر ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی تھی، جو عربوں کی ضرب المثل خطابت وزبان آوری کا بہترین مرقع اور مقرر کے علم وفضل اور وقار ومتانت پر شاہد عدل تھی، فصاحت وبلاغت اور زور بیان کا ایک مواج سمندر تھا جس نے حاضرین اجلاس کو مبہوت کر دیا تھا، پروفیسر قرضاوی نے ندوۃ العلماء اور مولانا علی میاں سے اپنی واقفیت کے آغاز کی داستان بیان کرتے ہوئے اس جشن میں اپنی شرکت پر فخر ومسرت کا اظہار کیا، انھوں نے کہا کہ ایک عرصہ تک ہم لوگ "ندوی" کو خاندانی نسبت سمجھتے رہے پھر حضرت مولانا علی میاں سے تعارف حاصل ہونے کے بعد حقیقت حال واضح ہوئی کہ یہ دراصل ہندوستان کی ایک درسگاہ ندوۃ العلماء کی طرف نسبت ہے،

جشن کی شہرت اور مقبولیت سے آج سارا عالم عرب گونج رہا ہے۔ موصوف نے مزید کہا کہ ندوی فضلاء کو ہم بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جب حضرت مولانا علی میاں عرب ممالک کو اپنے قدوم سے سرفراز کرتے ہیں تو ہم ان کو دنیائے عرب کے لیے ہندوستان کا ایک قیمتی تحفہ تصور کرتے ہیں۔ پروفیسر قرضاوی کی اس خیال انگیز اور ادبی حیثیت سے بلند پایہ تقریر کا خلاصہ اردو زبان میں ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے بیان کیا۔

متحدہ عرب امارات کی سپریم کورٹ کے رئیس القضاء الشرعی (چیف جسٹس) شیخ احمد بن عبدالعزیز آل مبارک کا تعارف کراتے ہوئے مولانا تقی الدین صاحب ندوی نے بتایا کہ موصوف ہندوستانی علماء کے ہمیشہ سے بیحد قدر دان اور خصوصاً شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی تصنیفات کے بہت دلدادہ و عقیدت کیش ہیں، قاضی صاحب نے اپنی نسبۃً مختصر تقریر میں ندوۃ العلماء کے تعلیمی و اصلاحی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے اس مہرجان کے انعقاد اور کامیابی پر اس کو ہدیہ تہنیت پیش کیا۔ اور اپنے اور اپنے ملک کی طرف سے کارکنان ندوۃ العلماء کو ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔

ڈاکٹر عباس المہاجرانی نے اپنے مقالہ میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں اتحاد و اتفاق کو وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیا تھا انھوں نے قرآن و حدیث کے حوالوں سے اپنی اس رائے کو مدلل کرتے ہوئے کہا کہ اسلام گروہ بندی کا شدید مخالف ہے اس لیے اس وقت جب کہ باطل قوتیں اسلام کے قلعہ پر حملہ آور ہیں، تمام مسلمانوں کو اپنے جزوی اختلافات پس پشت ڈال کر ان کے مقابلہ کے لیے اپنی صفوں کو متحد کر لینا چاہیے۔

۳۰ر نومبر کو اس چار روزہ مہرجان تعلیمی کا پانچواں اجلاس حسب معمول نو بجے تلاوت کلام پاک سے شروع ہوا۔ گذشتہ دن کی طرح یہ اجلاس بھی تعلیمی مسائل پر سیمینار کے لئے

خاص تھا، جن مشاہیر و اکابر اہل علم نے اس مذاکرہ میں حصہ لیا ان میں کچھ اہم نام یہ ہیں۔

(۱) مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر برہان دہلی۔ (۲) ڈاکٹر مشیر الحق ندوی ریڈر ادارہ دراسات مغربی ایشیا مسلم یونیورسٹی۔ (۳) ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی ریڈر شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی۔ (۴) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی پرنسپل جامعہ کالج جامعہ ملیہ دہلی۔ (۵) جناب محمد سمیع صدیقی۔ سابق پرنسپل ممتاز کالج لکھنؤ۔ (۶) جناب ریاض الدین پرنسپل مجیدیہ کالج الٰہ آباد۔ (۷) جناب اطہر حسین آئی۔ اے۔ ایس لکھنؤ۔

ڈاکٹر علی محمد خسرو نے کل صبح کے اجلاس میں دینی تعلیم کے ساتھ جدید تقاضوں کے مطابق صنعت و حرفت کی تعلیم شامل کرنے پر جو زور دیا تھا، اس کی گونج آج کے اجلاس میں بھی زور وشور سے سنائی دیتی رہی، اور مقررین و مقالہ نگاروں نے خسرو صاحب کے نقطۂ نظر کی موافقت و مخالفت میں اپنی آراء کا اظہار کیا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی تعلیم کے اسلامی تصور پر طویل مقالہ لکھکر لائے تھے، مگر وقت کی تنگی کے باعث مقالہ کے بجائے ایک مختصر و جامع تقریر میں اپنے خیالات ظاہر کئے۔ موصوف نے اصلاح نصاب اور تعلیم و تہذیب کے میدان میں ندوۃ العلماء کے رول کو سراہتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ مرکزی دینی مدارس کا بنیادی مقصد مذہبی تعلیم دینا ہے۔ اس کے نصاب میں سوشل سائنس اور ٹیکنالوجی کو شامل کرنے سے یہ اصل مقصد فوت ہو جائے گا، ڈاکٹر مشیر الحق نے اپنے مقالہ میں دینی تعلیم کے متعلق بعض تجاویز پیش کیں جن میں سب سے اہم تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے عام عربی مدارس کے لیے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا جانا چاہیے، جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرح تمام اہم فیصلے کرے اور انکو ملک کے تمام مدارس میں یکساں نافذ کرائے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا مقالہ بھی بہت فکر انگیز اور پر مغز تھا، انھوں نے پروفیسر خسرو کے

نقطۂ نظر کی مشروط حمایت کرتے ہوئے کہا کہ عربی مدارس کے نظام تعلیم کی تشکیل نو ضروری ہے۔ اس کو چار مرحلوں میں تقسیم کر کے اس میں صنعت وحرفت کی تعلیم کو پہلے مرحلہ تک محدود رکھا جائے (اور میرا خیال ہے کہ خسرو صاحب کا مقصد بھی یہی ہوگا)، ثانوی مرحلے میں ایسی تعلیم کا انتظام کیا جائے جس سے تیار ہونے والے افراد فقہ کے معمولی مسائل کو حل کرنے اور عوام کو دینی مشورے دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ تیسرے مرحلے میں صرف منتخب باصلاحیت لوگوں ہی کو داخل کیا جائے جن کو دین کی وسیع و عمیق تر تعلیم دی جائے۔ موصوف نے سفارش کی کہ اس تعلیمی مرحلہ میں جدید علوم کا بھی اضافہ کیا جانا چاہئے تاکہ اس سے ایسے ماہرفن اساتذہ فارغ ہو کر نکلیں جو جدید تقاضوں سے باخبر ہوں، ڈاکٹر صدیقی نے اس مجوزہ نظام تعلیم کے آخری مرحلہ کو "تخصص"[1] کا نام دیا، جس میں کسی ایک موضوع پر طلبہ خصوصی مہارت حاصل کریں گے موصوف نے اپنی اصلاحی تجاویز کا خاکہ بہت شرح وبسط کے ساتھ مدلل طور پر پیش کیا، جو بے حد پسند کیا گیا۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے "نظام تعلیم اور فکر اسلامی" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا، جس میں تعلیم کے قدیم وجدید فلسفوں کا بہت تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا جناب محمد سمیع صدیقی نے اپنے انگریزی مقالہ "ندوۃ العلماء اور اس کا رول" میں ندوہ کے ان کارہائے نمایاں کا ذکر کیا جو اس نے پچاسی سال میں تعلیمی، سماجی اور فکری میدان میں انجام دیئے ہیں، پرنسپل ریاض الدین صاحب نے بھی ایک مقالہ پڑھا۔ اطہر حسین صاحب نے جو حکومت اتر پردیش کے ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہونے کے ساتھ علم وادب سے بھی خاص دلچسپی رکھتے ہیں اپنے انگریزی مقالہ میں دینی تعلیم کی اہمیت واضح کی۔ اور کہا کہ اس کے حصول سے خیر وشر کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت اور شعور پیدا ہوتا ہے۔

اسی دن سہ پہر کو اس مہرجان کے غیر ملکی مندوبین کے اعزاز میں لکھنؤ شہر کے مسلمانوں کی

---

[1] ندوۃ العلماء میں ادب فقہ اور حدیث میں تخصص کی تعلیم کا انتظام ہے۔

طرف سے اودھ کلارک ہوٹل میں ایک استقبالیہ پر تکلف عصرانہ دیا گیا جس میں ڈاکٹر شفیق حسین قریشی نے شہریوں کی نمایندگی کرتے ہوئے معزز مہمانوں کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا، جس کا عربی ترجمہ مولانا محمد رابع صاحب ندوی نے کیا مصری وزارت تعلیم اور امور شرعیت کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبد المعید عبد الستار نے اس تاریخی شہر میں استقبالیہ دینے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سپاس نامے کے جواب میں کہا کہ آج پوری دنیا اضطراب و بےچینی کا شکار ہے۔ اسکی اہم وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے بلند مقام کو بھول کر اخلاقی انحطاط میں مبتلا ہو گیا ہے، اس نے مذہب کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا، اور موجودہ فلسفہ و نظام کی تقلید شروع کر دی ہے، شیخ موصوف نے کہا کہ خاص طور سے مسلمان اسلامی اصولوں پر صحیح معنوں میں عمل کر کے تسکین حاصل کر سکتے ہیں، اس جوابی تقریر کا اردو ترجمہ مولانا سعید الرحمن صاحب ندوی نے کیا۔ اسی دن شب میں دینی تعلیمی بورڈ اور جمعیۃ علمائے ہند یو۔پی کی طرف سے بھی عرب مہمانوں کو استقبالیہ و عشائیہ دیا گیا۔

آج کے اس اجلاس میں اسٹیج عرب نمائندوں سے تقریباً خالی رہا۔ کیونکہ گذشتہ دن مختلف امور پر غور کرنے اور قراردادیں مرتب کرنے کے لیے جو چار تحتی کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں ان کے جلسے علحدہ علحدہ ہوتے رہے اور شیخ الازہر اور دوسرے عرب مندوبین انہی میں شریک رہے۔

اس دن شام کے چھٹے اجلاس میں بھی مختلف عرب ممالک کے مندوبین نے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا، جس میں ڈاکٹر عبد العزیز الخویطر [?] الفدا، وائس چانسلر ریاض یونیورسٹی، شیخ یوسف حسین الحجی صدر، اصلاح اجتماعی کویت اور شیخ ہاشم الرفاعی ممبر پارلیمنٹ اور سابق وزیر حکومت کویت خاص طور سے قابل ذکر ہیں، بیشتر مقررین نے ندوۃ العلماء کی خدمات کو سراہا اور اس مہرجان تعلیمی کے انعقاد اور اسکی غیر معمولی کامیابی پر خراج تحسین و تہنیت پیش کیا، لیکن راقم سطور کے نزدیک اس وقت کے اجلاس کا حاصل مولانا ابو الحسن علی ندوی مد ظلہ کی پر تاثیر اور ولولہ انگیز تقریر تھی، جس میں انہوں نے [illegible]

غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کی تھی۔

موصوف محترم نے فرمایا کہ "اس جشن تعلیمی کا مقصد محض دعوت ہے، اور ہندوستان میں جو تعلیمی اصلاحی اور تجدیدی کوششیں ہوئی ہیں ان کی ایک تصویر ممالک اسلامیہ کے اہل علم و دانش کے سامنے رکھکر ان کے تجربات وخیالات سے فائدہ اٹھانا ہے اور بس، اس جشن کے انعقاد کے فیصلہ سے آج تک کبھی حاشا وکلا اس کے ذریعہ حصول زر کا خیال بھی حاشیۂ دماغ میں نہیں آیا، بعض عرب ممالک کے نمائندوں نے جن امدادی رقوم کا اعلان کیا ہے، وہ ہماری منشا کے خلاف ہے"۔ مولانا نے بڑے موثر جذباتی انداز میں مزید کہا کہ "یہ سونے کی چڑیاں تو اڑ جائیں گی، لیکن ہمارے مدارس ہندوستان ہی کے مسلمانوں کے تھوڑے تھوڑے عطیات سے چلتے رہیں گے، ہم ان دولت مند ممالک کے سامنے کاسہ گدائی لے کر نہیں جاتے اگر ایسا ہوتا تو آج میری دعوت پر ممالک اسلامیہ عربیہ کے اتنے جلیل المرتبت اشخاص یوں کھنچے چلے نہ آتے" ہندوستانی مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا "ہم آپ کو چھوڑنے والے نہیں، آپ جو چار آٹھ آنے دیں گے وہی ہمارے لیے اصل نعمت ہیں، کیونکہ ہمارے یہ مہمان جو کچھ دیں گے وہ اللہ کی ان کو دی ہوئی بے شمار دولت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہوگا، اور آپ کا عطیہ آپ کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے، یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہئے کہ ہم پیسوں کی خاطر اصول کا سودا کبھی نہیں کر سکتے۔ اب ہماری قسمت اسی ملک کے ساتھ وابستہ ہے، اس لیے ہم اس ملک کی فلاح و بہبود کی خاطر اس کو ایک پیغام دینا چاہتے ہیں، اور اس مہرجان کا یہی اصل مقصد ہے" حضرت مولانا کی تقریر کے لفظ لفظ سے خلوص و صداقت کا جو چشمہ ابل رہا تھا اس سے حاضرین جلسہ بے حد متاثر ہوئے۔

اسی اجلاس میں خانقاہ مجددیہ سرہند کے سجادہ نشین مولانا زید ابوالحسن صاحب کا فاضلانہ

مقالہ بھی پڑھا گیا جس میں انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے اس عہد ظلمت اور ناسا عد حالات کا تفصیلی جائزہ لیا اور شیخ احمد سرہندی نے کفر و باطل کی بادِ صرصر میں جس طرح تجدید و اصلاح دین کی قندیلیں فروزاں کیں اس کی اہمیت واضح کی تھی۔

مہرجان تعلیمی کے آخری دن ۳ر نومبر کی صبح کو متحدہ عرب امارات کے چیف جسٹس ابوظبی کے شیخ احمد بن عبدالعزیز آل مبارک نے کتب خانہ ندوۃ العلماء کی مجوزہ نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس عمارت کی تکمیل پر پندرہ لاکھ روپیے کے مصارف کا تخمینہ لگایا جاتا ہے کتب خانہ ندوۃ العلماء کی موجودہ عمارت کی روز افزوں تنگی کے پیش نظر اس جدید تعمیر کی سخت ضرورت تھی۔ سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب اتنی پر اثر تھی کہ علمی نمائش کی طرح اسکو بھی مہرجان کے اہم اور قابل ذکر پروگراموں میں شمار کیا جاسکتا ہے، خاص طور پر سنگ بنیاد رکھنے کے بعد جب شیخ موصوف نے دونوں ہاتھ اٹھا کر چشم پرنم نہایت گلوگیر آواز میں دعا مانگنا شروع کی تو ساری فضا آمین آمین کی صداؤں سے گونج اٹھی، یہ منظر واقعہ یہ ہے کہ بے حد رقت انگیز تھا، ہزاروں کا مجمع پندرہ منٹ تک آنکھیں بند کیے بھرائی ہوئی آواز میں بارگاہ ایزدی میں اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے دعاگو رہا، راقم سطور اس وقت کی صحیح کیفیت قلبی کے اظہار اور مرقع کشی کے لیے ذخیرۂ الفاظ کو قاصر پاتا ہے،

اس کے بعد جلسہ گاہ میں اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی چونکہ کچھ غیر ملکی مندوبین کی آج ہی دوپہر میں واپسی طے تھی۔ اس لیے اس اجلاس کو ایک طرح سے اختتامی نشست کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، اس میں سات عرب مہمانوں نے تقریریں کیں جن میں قابل ذکر نام یہ ہیں

۱۔ عراقی وفد کے سربراہ شیخ نورالدین الکاموشی (سکریٹری جمعیۃ رابطہ علماء عراق (۲) ڈاکٹر عبدالعزیز حمید (پرنسپل اصول الدین کالج جامعہ ازہر مصر) اور (۳) شیخ عبداللہ الزاید

(۳) پروفیسر ملک عبد العزیز یونیورسٹی مکہ) (۴) شیخ عبد الفتاح ابو غدہ (پروفیسر اسلامی شریعت امام محمد بن سعود یونیورسٹی) (۵) ڈاکٹر صالح مہدی السامرائی (پروفیسر جامعہ ریاض مقیم جاپان) (۶) شیخ احمد محمد اسماعیل بیلی (منصف عدالت شرعیہ ابوظبی)

تمام مقررین نے عمومی طور پر اس مہرجان تعلیمی کو سراہا کہ اس نے مختلف ملکوں کے اصحاب فکر کو باہم ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع فراہم کیا اور توقع ظاہر کی کہ اس عظیم اجتماع سے ایسے مفید نتائج برآمد ہوں گے جن سے اتحاد کا ماحول پیدا ہوگا، شیخ زاید نے کہا کہ اگر اس عظیم اجلاس سے باہمی اخوت و مودت، میل جول اور تعاون و تعاضد کا جذبہ پیدا ہو جائے تو بلاشبہ یہ اس کا ایک بڑا کارنامہ شمار ہوگا۔

اسی اجلاس میں ندوہ کی طرف سے ہر عرب مندوب کو دو البم اور دو بیگ پیش کئے گئے، ایک البم میں عمارات دہلی کی تصاویر اور دوسرے میں دارالعلوم ندوہ کے مختلف شعبوں اور عمارتوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔

آخر میں اردن کے شیخ محمد ابراہیم شقرہ نے وہ چودہ قرار دادیں پیش کیں جن پر غور و فکر اور ترتیب کا کام چار تحتی کمیٹیاں گذشتہ روز سے کر رہی تھیں۔ ان تجاویز میں سامراجی طاقتوں کے ثقافتی و فکری غلبہ سے آزادی، بیت المقدس مسجد اقصیٰ اور فلسطینی باشندوں کی املاک پر قبضہ کرنے کی کوششوں کی مذمت، بعض ملکوں میں تحریف قرآن کی کوششوں پر اظہار ناپسندیدگی، مسئلۂ فلسطین اور اماکن مقدسہ کو اسلامی مسئلہ سمجھنے کی اپیل، اسرائیل کے قبضہ سے مقامات مقدسہ کو واپس لینے کے لیے جہاد کی اپیل، اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کرنے سے انکار پر حکومت ہند کا شکریہ، لبنان میں مسلمانوں پر ہونے والے خونی مظالم پر اظہار قلق اور اسلامی حکومتوں سے اس کا حل نکالنے کی اپیل، عربی زبان کے فروغ و ترقی، ندوہ کی دعوت

قبول کرکے اس جشن میں شرکت کرنے والی حکومتوں اور انجمنوں کے شکریہ کا، حکومت اترپردیش اور شہر لکھنؤ کے حکام وانتظامیہ کے تعاون ودلچسپی لینے پر شکریہ، عالم عرب کے تمام اسلامی مدارس اور یونیورسٹیوں سے اپنے نصاب تعلیم میں روح شریعت سے ہم آہنگ تبدیلی کرنے کی درخواست۔ اور رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نیز صحابۂ کرام پر بنائی گئی فلموں کی نمائش روکنے کا اسلامی حکومتوں سے مطالبہ، اور ندوۃ العلماء، نیز مولانا ابوالحسن علی ندوی کے شکریہ کی تجویزیں شامل تھیں۔

آخر میں شیخ الازہر نے ان قراردادوں کی تائید میں ایک مختصر مگر جامع تقریر کی، جس میں انھوں نے جشن کی کامیابی کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان تجاویز کی اہمیت مسلّم ہے، ہم بہت غوروفکر اور باہم مشورہ وتبادلۂ خیال کے بعد اچھے نتائج تک پہونچے ہیں، مولانا علی میاں مدظلہ نے اپنی اختتامی تقریر میں ایک موحد کامل اور سچے مومن کی طرح اس مہرجان تعلیمی کی کامیابی کو محض نصرت الٰہی کا کرشمہ قرار دیا، اور ان تمام معاونین کا شکریہ ادا کیا جن کی شب وروز کی جدوجہد اور محنت اس اجلاس کے سلسلہ میں شامل رہی مولانا مدظلہ کی دوسری تقریروں کی طرح یہ تقریر بھی بے حد روح پرور، خیال انگیز اور موثر تھی[1]۔ اس کے بعد شام کے معمر بزرگ شیخ حسن جبنکہ (صدر رابطہ عالم اسلام دمشق) کی جنھوں نے اپنی کبرسنی اور علالت کے باوجود مہرجان کو اپنی شرکت سے نوازا تھا، دعا پر یہ اجلاس اختتام کو پہونچا۔

اسی دن بعد نماز ظہر ندوۃ العلماء کے ابنائے قدیم کی تنظیم (اولڈ بوائز ایسوسی ایشن) کا احیاء عمل میں آیا، اس کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا علی میاں مدظلہ نے ایک مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے ابنائے قدیم کو جو اتنی بڑی تعداد میں شاید ہی کبھی یکجا ہوئے ہوں، تلقین کی کہ وہ جہاں بھی رہیں اپنے کردار وعمل سے مادر علمی کا نام روشن کریں اور علامہ شبلیؒ کی متانت تحریر وتقریر کا جو ورثہ ہم کو ملا ہے اسکو ہر لحظہ پیش نظر رکھیں۔

---

[1] یہ تقریر اس لائق تھی کہ اگر معارف کے محدود صفحات میں گنجائش ہوتی تو اسکو پورا نقل کیا جاتا۔

نظام العمل میں اسی دن شام کو ساڑھے پانچ بجے مدارس دینیہ کے اہم مسائل و مشکلات پر تبادلۂ خیالات کیلئے ایک جلسہ مخصوص کیا گیا تھا، لیکن عراق سے تین ارکان پر مشتمل ایک اور وفد تاخیر سے اسی دن یہاں پہونچا تھا، ان کی تقریروں اور تاثرات میں اس اجلاس کا کافی وقت لگ گیا، اس نشست کا مقصد یہ تھا کہ سکیولر ہندوستان میں مدارس دینیہ نے اسلامی شعائر و روایات کی جس طرح پوری پوری حفاظت کی بلکہ ان کو مزید پروان چڑھایا، اس کی تصویر بھی غیر ملکی معزز مندوبین کے سامنے آجائے، بہرکیف وقت کی گنجائش کے مطابق جن اشخاص کو اپنے مقالے پیش کرنے یا تقریر کرنے کا موقع مل سکا ان میں اہم نام یہ ہیں :-

(۱) شیخ ابراہیم منیر (عراق) (۲) ڈاکٹر محسن احمد ہارون (جدہ) (۳) ڈاکٹر علی اشرف (صدر شعبہ انگریزی ملک عبد العزیز یونیورسٹی مکہ) (۴) مولانا سید الرحمٰن صاحب ندوی (مدیر البعث الاسلامی و استاذ دار العلوم ندوۃ) (۵) مولانا ظفیر الدین مفتاحی (دار العلوم دیوبند) (۶) مولوی محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی۔

ان میں مولانا سید الرحمٰن صاحب ندوی کا مقالہ "ہندوستان میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" خصوصیت سے قابل ذکر ہے، موصوف نے اسلامیت اور مغربیت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے پر مغز مقالہ میں بہت مدلل طور پر یہ دکھایا تھا کہ جب ہندوستان میں اسلامیت کا مغربیت سے ٹکراؤ ہوا تو اسکا موثر مقابلہ چار محاذوں سے کیا گیا، جہاد کی راہ سے (جیسے سلطان ٹیپو وغیرہ کی کوششیں) مدارس اسلامیہ کے ذریعہ، تصنیف و تالیف کے ذریعہ اور سیاسی محاذ سے (مثلاً تحریک خلافت کانگریس اور مسلم لیگ وغیرہ)، اصلاً عربی میں پڑھا گیا تھا لیکن بعد میں خود فاضل مقالہ نگار نے اردو میں بھی اسکا خلاصہ بیان کر دیا تھا، مولوی اجمل ایوب اصلاحی نے بھی مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے تعارف میں ایک عربی مقالہ پڑھا چونکہ اس درسگاہ کا شجرہ نسب بھی کسی منزل کے ندوۃ العلماء ہی سے ملتا ہے اسلئے اس موقع پر یہ مقالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

آخر میں مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار کی دعا پر جن کی صدارت میں یہ جلسہ ہوا تھا، یہ چار روزہ مہرجان تعلیمی اپنی معنویت اور صوری محاسن کے دائمی چراغ روشن کر کے ختم ہو گیا، اسکا غیر معمولی نظم و ضبط، مختلف الخیال اور قدیم و جدید اہل علم و فکر کا اتصال اور ایمان و یقین سے بھری تقریروں کی دعا پر ڈیا ہمیشہ تابندہ رہیگی۔

مطبوعات جدیدہ

اردو مصادر نامہ، مرتبہ جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲۴، قیمت عہ، پتہ: دفتر انجمن ترقی اردو بکڈپو، اردو بازار دہلی، مشتاق بکڈپو، اردو بازار دہلی، درس کتب خانہ رشیدیہ اردو بازار دہلی۔

مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف مہتمم مدرسہ امینیہ دہلی، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی مرحوم کے فرزند اور شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، ان کی نشو و نما دہلی میں ہوئی ہے، اس لیے وہ اردو زبان کے رگ و پے سے اچھی طرح واقف ہیں، زیر نظر کتاب میں انھوں نے اردو زبان کے تقریباً تیرہ سو (۱۳۰۰) کثیر الاستعمال مصادر اور ان کے مشتقات، حاصل مصدر جمع کرکے ان کی مختصر تشریح و وضاحت کی ہے، تشریح و وضاحت میں اصلی و مجازی معانی اور استعمالات وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے، اور سند میں اساتذہ خصوصاً داغ دہلوی کا کلام اور اردو کے محاورے اور کہاوتیں پیش کی گئی ہیں، شروع میں مصنف کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے، اس میں اردو زبان، اس کے رسم الخط، اس کے الفاظ و اصطلاحات کے متعلق مفید باتیں تحریر کی گئی ہیں، اور اردو کی مقبولیت اور اس کے خالص ہندوستانی زبان ہونے کو واضح کیا گیا ہے، اسی ضمن میں مغلیہ عہد کے اردو بازار اور اس کے قرب و جوار کے مقامات کا حال بھی تحریر کیا گیا ہے، [illegible] کی طرح اردو کے مصادر پر ابھی تک کوئی کتاب مستقل نہیں لکھی گئی تھی، اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی، یہ بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھی گئی ہے، اور اردو طلبہ اور اساتذہ کی قدردانی کے لائق ہے۔

"ض"

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی وتحقیقی وادبی وتنقیدی وتاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ وبصیرت تجربہ ومشاہدہ اور فکر ونظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات وتراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے،

۱۔ مہاجرین جلد دوم قیمت: ۹-۱۲

۲۔ سیر الصحابہ جلد ۹ " ۴-۹
امام حسینؓ کے حالات زندگی کے ضمن میں واقعۂ محزنۂ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

۳۔ سیر الصحابہ جلد ۷

۴۔ تابعین: ۱۰۹ اکابر تابعین کے سوانح،
قیمت: ۵۰-۱۲

۵۔ تاریخ اسلام اول (عہد رسالت، خلافت راشدہ)
قیمت: ۵۰-۱۲

۶۔ تاریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۰۰-۱۱

۷۔ تاریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اول)
قیمت: ۰۰-۱۴

۸۔ تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)
قیمت: ۰۰-۱۵

۹۔ اسلام اور عربی تمدن قیمت: ۶۵-۱۵

۱۰۔ عرب کی موجودہ حکومتیں،
قیمت

۱۱۔ ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲۔ دین رحمت قیمت ۰۰-۱۰

۱۳۔ خریطۂ جواہر ۷۵-۴
زندگی کی آخری کتاب

۱۴۔ حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی حالات وواقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب وطرز انشا، اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا ثانی، دلکش، دلچسپ، قابل مطالعہ اس میں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت: ۵۰۰-۲۷

معارف کے گذشتہ اشاعتوں کے مکمل فائل

اور

متفرق پرچے

معارف علمی و ادبی مضامین کا گنجینہ، مشرق و مغرب علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک ذخیرہ ہے۔ اس کی اسی علمی و دینی اہمیت کی بنا پر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چہار دیواری سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا ہے، مغرب کے بعض غیر مسلم فضلا نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور ان کی نگرانی میں دارالمصنفین کے رفقاء محققین نے ان کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل سنوں کے فائل تو مکمل موجود ہیں۔

۱۹۲۹ء - ۱۹۳۳ء - ۱۹۳۴ء - ۱۹۳۶ - ۱۹۳۸ - ۱۹۳۹ء

۱۹۵۱ء - ۱۹۵۴ء - ۱۹۵۵ء - مع سلیمان نمبر ۱۹۶۱ء

ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیے۔

منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰۰

نومبر ۱۹۷۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۔ عبدالسلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد

جلد ۱۱۶ ماہ دسمبر ۱۹۷۵ء مطابق ماہ ذوالحجہ ۱۳۹۵ھ عدد ۶

مضامین

شذرات — عبدالسلام قدوائی ندوی — ۴۰۲-۴۰۴

مقالات

بنات اسلام کی علمی و دینی خدمات — جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری اڈیٹر البلاغ بمبئی — ۴۰۵-۴۲۷

ابوزکریا رازی اور اسکی کتاب حاوی — جناب حکیم مولوی محمد عطاء الرحمٰن صاحب ندوی لٹریری ریسرچ یونٹ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، — ۴۲۸-۴۳۸

جاوید نامہ کے کردار — جناب جگن ناتھ آزاد کشمیر — ۴۳۹-۴۴۷

فخرالملک فضل اللہ العبید (تومسکی) — جناب ڈاکٹر نور السعید اختر صاحب استاد شعبۂ فارسی مہاراشٹر کالج بمبئی — ۴۴۸-۴۶۲

عربی شاعری خلدون کے عہد میں — مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم — ۴۶۳-۴۷۱

استدراک

مولانا شیخ حیدر حسن خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ — جناب مولانا حبیب اللہ صاحب ندوی — ۴۷۲-۴۷۴

ادبیات

غزل — جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری — ۴۷۵

جذبات سالک — جناب سالک رحمانی — ۴۷۵

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۴۷۶-۸۰

شذرات

پچیس تیس برس پہلے اردو کے خلاف جو فضا پیدا ہو گئی تھی وہ ابھی ذہن سے فراموش نہ ہوئی ہوگی اس وقت حالات ایسے تھے کہ عام طور سے یہ یقین کیا جانے لگا تھا کہ بس اس کا آخری وقت آگیا ہے اور اب ہندوستان میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس وقت تقسیم ملک کے اثر سے فضا بےحد مسموم تھی فرقہ وارانہ فسادات نے تلخیوں اور بدگمانیوں میں بہت اضافہ کر دیا تھا، حالانکہ اردو کو تقسیم سے کوئی سروکار نہ تھا، وہ نہ اسلام کی زبان تھی نہ مسلمانوں کی، اسلام کا صحیفہ ربانی عربی میں نازل ہوا تھا، اور مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف زبانیں بول رہے تھے خود ہندوستان میں بنگالی مسلمان بنگلہ، پنجابی مسلمان پنجابی، گجراتی مسلمان گجراتی، مہاراشٹر کے مسلمان مرہٹی، تامل ناڈ کے مسلمان تامل، کرناٹک کے مسلمان کنڑی، آندھرا کے مسلمان تلگو، کیرالا کے مسلمان ملیالم، آسام کے مسلمان آسامی، اور کشمیر کے مسلمان کشمیری زبان بول رہے ہیں، لیکن فرنگی ساحروں نے دلوں کو ایسا مسحور اور فرقہ وارانہ ہنگاموں نے دماغوں کو اس قدر مفلوج کر دیا تھا کہ اتنی واضح حقیقت بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دیا جا رہا تھا، حالانکہ اردو کی ساخت اور اس کی تاریخ پکار پکار کر یہ کہہ رہی تھی کہ یہ کسی ایک فرقہ کی نہیں بلکہ تمام ہندوستانیوں کی ایک مشترک زبان ہے جس کی تشکیل و تعمیر اور ترویج و اشاعت میں ملک کے سبھی علاقوں کے باشندے اور سبھی مذاہب کے پیرو شریک رہے ہیں، اور اب بھی اس سے وابستہ اور اس کی توسیع و ترقی کی جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں،

جن لوگوں نے ۱۹۴۷ء اور اس کے آس پاس کا زمانہ دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس وقت تعصب اور فرقہ پرستی کا کیا حال تھا ہر طرف اتحاد و اتفاق کے بجائے انتشار و افتراق، اور میل و محبت کے بجائے مخالفت و عداوت کا بازار گرم تھا اس وقت عقل کے بجائے لوگ جذبات کے دھارے میں بہے چلے جا رہے تھے، جنون و مدہوشی کا عجب عالم تھا، کھلے ہوئے حقائق نظر نہیں آتے تھے اور دل اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا تھے، ایسی فضا میں اردو جو قوموں کے اتحاد کی علامت اور میل ملاپ کی نشانی تھی تفرقہ کا باعث سمجھی گئی، اور چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ اسے ختم کر دو، ورنہ

ملک ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا، ہندوستانی روایات مٹ جائیں گی، اور ہندی تہذیب تمدن کا خاتمہ ہوجائیگا،

اس مخالفانہ فضا میں کسے یارائے سخن تھا، بپھرے ہوئے مخالفوں کا رام کرنا تو بڑی بات تھی، ان سے گفتگو کی جرأت بھی کسی کو نہ ہوتی تھی، اپنی حرمت و آبرو اور جان و مال کو کون خطرہ میں ڈالتا، اردو کے بلند بانگ حامیوں نے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی ہی میں عافیت سمجھی، یہ وقت بہت نازک تھا، اور ایسا نظر آرہا تھا کہ اس ملک سے اردو کا چل چلاؤ ہے، لیکن مایوسی کے اس عالم میں کچھ لوگوں نے ہمت کی، اور صحرا میں صدا لگانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، بظاہر حالات بہت ناسازگار تھے، مگر ان جیالوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور نہ دیکھنے والوں کو دکھانے اور نہ سمجھنے والوں کو سمجھانے کی جد و جہد میں لگ گئے، آخر ان کی سعی پیہم کامیاب ہوئی، حقیقت کے رخ سے پردے ہٹنے لگے، رفتہ رفتہ صورت حال سامنے آئی، اردو نے دلوں میں گھر کرنا شروع کیا، اور اس کی اہمیت و افادیت عوام اور حکومت سب ہی کی سمجھ میں آگئی، اور سرکاری اور عوامی دونوں سطحوں پر اس کی ترویج و ترقی کی فکر ہونے لگی،

مرکزی حکومت نے اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے اردو بورڈ قائم کیا، اور اس کے لئے ایک خطیر رقم منظور کی، اردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بھی پیش کی گئی، ریاستوں نے بھی اردو کی طرف توجہ کی، اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم کے مواقع پیدا کئے گئے، ہزاروں کی تعداد میں اردو اساتذہ کا تقرر کیا گیا، دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے داخلہ کی راہیں نکالی گئیں، سرکاری ملازمین کو اردو سیکھنے کی ترغیب دی جانے لگی، ان کے لئے اردو کے امتحانات رائج کئے گئے، اور اردو دانی ان کی صلاحیت کار میں اضافہ کا باعث قرار پائی، اردو کی ترقی کے لئے اردو اکاڈمیاں قائم کی گئیں، اردو اخبارات و رسائل جو مدت سے کس مپرسی میں مبتلا تھے، ان کی جانب بھی توجہ شروع ہوئی، چنانچہ گذشتہ سال لکھنؤ میں مدیران رسائل و اخبارات کا کل ہند اجتماع ہوا، اور ابھی حال میں کلکتہ میں ان کی دوسری کانفرنس ہوئی، حکومت نے ان اجتماعات کی حوصلہ افزائی کی، اور ارباب حکومت نے اپنی تائید و اعانت سے ان کی قوت عمل اور نشاط کار میں اضافہ کیا،

حکومت کی طرف سے تائید و اعانت کا یہ رویہ فال نیک ہے، امید ہے کہ اس توجہ میں مزید اضافہ ہوگا، اور اس کی سرپرستی سے اردو کی نشوونما میں بہت مدد ملے گی، لیکن محض حکومت پر تکیہ کر لینا کافی نہیں ہے، اردو والوں

کہ خود بھی ہاتھ پیر ہلاتے رہنا چاہئے، انھیں لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بٹھا دینا چاہئے کہ اردو کی ترویج و ترقی کیلئے جدوجہد ان کا فرض ہے، ان کے بجٹ میں دوسری مدوں کے ساتھ اردو کی بھی ایک مد ہونا چاہئے، آج حالت یہ ہے کہ فضول رسم و رواج اور لاحاصل تفریحات اور بیاہ تقریبات پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں، مگر اردو کتابیں یا رسالہ کتب کا خریدنا بیکار سمجھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو کے اخبارات و رسائل سسک رہے ہیں، کتب خانے کس مپرسی میں مبتلا ہیں، اردو ادارے اشاعت دم توڑ رہے ہیں، یہ صورت حال باعث افسوس ہے، دوسروں کی شکایت کا موقع ہوتا ہے تو ہم بڑھ چڑھ کے باتیں کرتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں منہ ڈال کر بھی دیکھنا چاہئے کہ اردو کے ساتھ خود ہمارا رویہ کیا ہے۔

ابھی یہ سطور تمام نہیں ہوئی تھیں کہ پروفیسر سید مسعود حسن کی وفات کی اطلاع ملی، افسوس ہے کہ اردو کے چمن سے یہ گلزار شگفتہ جا رہے ہیں اور کوئی ان کی جگہ لینے والا نظر نہیں آتا ہے، مسعود صاحب نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف دونوں میدانوں میں بڑا قابل قدر کام کیا ہے، وہ صاحب زبان بھی تھے اور صاحب قلم بھی، وہ بات کرتے تو ادب کے پھول جھڑتے، درس دیتے تو طلبہ ان کے علم سے مرعوب اور حسن بیان سے مسحور ہو جاتے، اور قلم ہاتھ میں لیتے تو تحقیق کے موتیوں سے کاغذ کا دامن بھر دیتے، وہ سرسری مضمون نویسی کے عادی نہ تھے، لکھنے سے پہلے موضوع کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے، سارا مواد جمع کرتے اور پوری چھان بین کے بعد قلم ہاتھ میں لیتے، اور پھر تحقیق کا شاہکار پیش کرتے، ممکن ہے ان کے نتائج تحقیق سے کسی کو اختلاف ہو مگر ان کی وسعت علم و دقت نظر اور تلاش و تفحص سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، وفور علم کے ساتھ وہ بڑے خلیق، وضعدار اور بامروت تھے، ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، یہی وجہ تھی کہ سب ان کے غم میں اشکبار تھے، وہ شیعہ تھے، مگر سنیوں میں بھی اتنے مقبول تھے کہ فرنگی محل کے نامور عالم مولانا محمد ہاشم کی امامت میں سنیوں نے بھی جنازہ کی نماز پڑھی، اللہ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے، اور ان کے عزیزوں اور شاگردوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مقالات

بناتِ اسلام کی علمی و دینی خدمات

از جناب مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

اسلام اور مسلمانوں کے خاص معاملات میں یہ سنت الہیہ ہمیشہ جاری رہی کہ جس دور میں جس قسم کے علوم و فنون اور علماء و فضلاء کی ضرورت ہوئی اس میں مردوں کے علاوہ عورتوں کی ایک بڑی تعداد نے بھی پورے نشاط و انبساط کے ساتھ نمایاں خدمات انجام دیں۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں پورے عالم اسلام میں احادیث و آثار کی روایت و تدوین کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور دینی ضرورت کے پیش نظر ان کے ساتھ خصوصی اعتناء کیا گیا تو گھر کے باہر کی طرح گھر کے اندر بھی احادیث و آثار کو تلاش کر کے مدون و مرتب کیا گیا صحابیات و تابعیات اور دیگر بنات اسلام نے اپنے اپنے خاندانوں کی بڑی بوڑھیوں سے احادیث کی روایت کر کے گھر کے مردوں تک یہ امانت پہونچائی جن خواتین اسلام کے پاس احادیث کے مجموعے تھے، ان کا پتہ چلا کر وہ مجموعے حاصل کئے گئے، چنانچہ حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ مدنیہ کے مجموعۂ احادیث کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حضرت ابوبکر بن محمد بن حزم کو خاص طور سے تاکید کی کہ وہ اسے حاصل کرلیں۔[1] اور جن کے پاس حدیثیں محفوظ تھیں انھوں نے اپنے خاندان کے لوگوں سے

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۳۰۸

ان کی روایت کی، یہی حضرت عمرہ بنت عبد الرحمن انصاریہ مدنیہ ہیں جنہوں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ اپنی بہن ام ہشام، حبیبہ بنت سہل، ام حبیبہ اور حمنہ بنت جحش سے احادیث کی روایت کی تھی، اور ان سے ان کے صاحبزادے ابوالرجال، بھائی محمد بن عبد الرحمن، پوتے حارثہ بن ابوالرجال، دونوں بھتیجے یحییٰ بن عبداللہ بن عبد الرحمن، اور ابوبکر بن محمد بن عبد الرحمن، اور ان کے بیٹے عبداللہ بن ابوبکر بن محمد بن عبداللہ نے روایت کی۔

امام حسن بصری کی والدہ خیرہ نے اپنی مولاۃ و مالکہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت کی، اور ان سے انکے دو صاحبزادوں یعنی حسن بصری اور سعید بصری نے روایت کی۔ صفیہ بنت علیہ عنبریہ نے اپنے دادا حرملہ بن عبداللہ عنبری، اور دادی قیلہ بنت مخرمہ سے روایت کی، اور ان سے ان کے پوتے عبداللہ بن حسان عنبری نے روایت کی۔

رائطہ بنت مسلم نے اپنے والد مسلم سے اور ان سے ان کے بیٹے عبداللہ بن حارث انبری مکی نے روایت کی، فاطمہ بنت حسین بن علی ہاشمیہ مدنیہ نے اپنے والد ماجد حضرت حسینؓ بھائی علی بن حسین (زین العابدین) پھوپھی حضرت زینب بنت حضرت علیؓ اور دادی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہم سے روایت کی، اور ان سے ان کی اولاد میں سے عبداللہ، ابراہیم اور ام جعفر نے روایت کی۔

ام یحییٰ حمیدہ بنت عبید بن رفاعہ انصاریہ مدنیہ نے اپنی خالہ کبشہ بنت کعب بن مالک سے، اور ان سے ان کے شوہر اسحاق بن عبداللہ بن ابوطلحہ اور بیٹے یحییٰ بن اسحاق نے روایت کی۔ حلیمہ بنت امیمہ نے اپنی والدہ امیمہ بنت رقیقہ سے اور ان سے ان کے گھر کے افراد نے روایت کی، اسماء بنت یزید قیسیہ بصریہ نے اپنے چچازاد بھائی انس سے روایت کی، حبیبہ بنت میسرہ سے ان کے غلام عطاء بن ابورباح نے روایت کی۔

حکیمہ بنت ابی حکیم اخنسی نے حضرت ام سلمہؓ سے، اور ان سے ان کے بیٹے یحییٰ بن ابوسفیان اخنسی نے روایت کی۔

ام الرائع رباب بنت صلیع ضبیہ بصریہ نے اپنے چچا سلمان بن عامر ضبی سے، اور ان سے حفصہ بنت سیرین نے روایت کی۔

کبشہ بنت ابوبکرہ ثقفیہ بصریہ نے اپنے چچا سے اور ان سے ان کے بھتیجے بکار بن عبدالعزیز ابن ابوبکرہ نے روایت کی[1]

ام مکیہ آمنہ بنت عثمان بن حسن عذریہ مکیہ نے اپنے شوہر شیخ ابوالعباس قسطلانی اور بیٹے امین الدین قسطلانی کو اپنی مرویات کی اجازت دی،[2]

ام عبدالرحمٰن جرجانیہؒ سے ان کے شوہر شیخ محمد بن علی جرجانی نے روایت کی[3]

ام عمر بنت حسان بغدادیہ نے اپنے والد ابوالفضل حسان بن زید، اور شوہر سعید بن یحییٰ ابن قیس سے احادیث کی روایت کی[4] خدیجہ بنت قاضی شہاب الدین احمد مکیہ نے اپنی نانی حسنہ بنت محمد بن کامل سے احادیث کا سماع کیا[5] زینب بنت عبدالرحمٰن عجلیہ جرجانیہ اپنے دادا شیخ محمد بن معروف جرجانی کے مجموعۂ مرویات کی روایت کیا کرتی تھیں[6] ان چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ صدر اول اور بعد کے ادوار میں بنات اسلام کے ذریعہ خاندانی احادیث و آثار کی ترویج و اشاعت کس طرح ہوئی ہے، درحقیقت ان راویات و محدثات نے اپنے گھروں کو دارالحدیث اور دارالعلم بنا رکھا تھا،

تحصیل حدیث کے لیے سفر | احادیث رسول کی تلاش و طلب میں محدثین نے عالم اسلام کی خاک

---

[1] ان راویات و محدثات کے تذکرے تہذیب التہذیب ج ۱۲ میں ملاحظہ ہوں [2] العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین فاسی ج ۸ ص ۲۰۱، [3] تاریخ جرجان سہمی ص ۵۰۶ [4] تاریخ بغداد خطیب ج ۱۴ ص ۴۴۳ [5] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۰۶ [6] تاریخ جرجان ص ۲۲۳،

... برکت ملا ہے اور ان سے نوائب و مصائب دور کئے گئے ہیں، ابتدائی ادوار میں بڑی ریاستوں کی مسند درس سے عام طور سے احادیث و آثار کی روایت اور ان کی تدوین کے لیے ہوا کرتے تھے بعد میں سند عالی کی طلب بھی ان اسفار کا سبب بن گئی، حدیث کی تحصیل کے لیے محدثین و علما کی طرح محدثات و راویات نے بھی گھر بار چھوڑ کر دور دراز ملکوں کا سفر کیا ہے اور اپنی صنفی حیثیت و صلاحیت کے مطابق غربت و بے وطنی کی زندگی بسر کرکے علم دین کی تحصیل کی ہے۔ ام حسین جمعہ بنت احمد محمیہ نے اپنے وطن نیشاپور سے بغداد کا سفر کرکے وہاں کے شیوخ و محدثین سے روایت کی، چنانچہ سنہ ۴۴۶ھ میں شیخ ابوالحسین محمد بن محمد شرطی بغدادی نے ان سے بغداد میں روایت کرکے ان کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔[1]

ام علی تقیہ بنت ابوالفرج غیث بن علی صوریہ بغدادیہ نے بغداد سے مصر جاکر مدتوں قیام کیا اور اسکندریہ میں امام ابوطاہر احمد بن محمد سلفی سے اکتساب علم کیا۔[2]

زینب بنت برہان الدین ابراہیم بن احمد اربیلیہ کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہوئی ہوش سنبھالنے کے بعد انھوں نے اپنے چچا کے ساتھ بلاد عجم کا سفر کیا اور تیس سال کے بعد مکہ مکرمہ واپس آئیں۔[3]

زلیخا بنت الیاس الواعظ شہر غزنین کی رہنے والی تھیں، یہاں سے مکہ مکرمہ گئیں اور علما و محدثین سے روایت کرکے کئی سال تک حرم محترم کی مجاورت کے بعد فارس کے شہر ساوہ چلی گئیں، اس سفر و اقامت میں زلیخا الواعظ نے حرم میں روایت اور عبادت دونوں نعمتیں حاصل کیں۔[4]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۲، ص ۲۲۴ [2] ابن خلکان ج ۱، ص ۱۰۳ [3] العقد الثمین ج ۸، ص ۲۲۴ [4] ایضاً ص ۲۳۶

ام احمد فاطمہ بنت نفیس الدین محمد بن حسین ملک شام کے شہر حماۃ کی رہنے والی تھیں۔ انھوں نے یہاں سے مصر اور طرابلس کا سفر کرکے اپنے چچا سے روایت کی۔[1]

ام محمد زینب بنت احمد بن عمر کا وطن بیت المقدس تھا، امام ذہبی نے ان کو "المعمرۃ الرحلۃ" کے القاب سے یاد کیا ہے، کیونکہ دور دراز ملکوں کا سفر کرکے تحصیل علم اور حدیث کی روایت میں مشہور تھیں اسی وجہ سے بعد میں دور دراز ملکوں کے طلبۂ حدیث ان سے روایت کرتے تھے۔[2]

حرمین شریفین کا سفر اہل علم اور محدثین کے لیے بڑا پرکشش ہوتا تھا، فریضۂ حج کی ادائیگی کے ساتھ مقامی اور بیرونی علماء سے ملاقات و استفادہ اور روایت کا موقع ملتا تھا، بلکہ کتنے محدثین اس نیت سے حج و زیارت کا سفر کرتے تھے کہ حرمین شریفین کے فلاں عالم سے روایت و درایت کی سعادت حاصل ہوگی، اس بارے میں بھی علماء و محدثین کی طرح عالمات و محدثات نمایاں مقام رکھتی تھیں، اور وہ بھی حرمین شریفین میں اقامت و مجاورت کرکے عبادت کے ساتھ افادہ و استفادہ کا بازار گرم کرتی تھیں، چنانچہ اسماء بنت محمد بن سالم نے بار بار حرمین شریفین میں حاضری دی اور یہاں کے علماء سے استفادہ کیا۔[3]

کریمہ بنت احمد مروزیہ، خراسان کے مشہور شہر مرو کی رہنے والی تھیں، انھوں نے مستقل طور سے مکہ مکرمہ میں اقامت و مجاورت اختیار کرکے ایک زمانہ تک حدیث کا درس دیا، خطیب بغدادی نے مکہ مکرمہ ہی میں ان سے پانچ دن میں صحیح بخاری پڑھکر روایت کی، نیز امام سمعانی، ابن المطلب اور ابوطالب زینبی جیسے ائمۂ حدیث نے

---

[1] ذیل العبر ذہبی ص ۸۹۔ [2] ،، ص ۱۲۲۔ [3] ،، ص ۱۸۰

ان سے صحیح بخاری کی روایت کی[1]

بہت سی محدثات دروایات کسی مشہور امام حدیث اور شیخ وقت سے سماع و روایت کے لیے سفر کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں، چنانچہ ام محمد ہدیہ بنت علی بن عسکر ہراس بغدادیہ نے امام ذبیدی سے روایت کے لیے ان کے وطن کا سفر کیا[2]۔ امۃ الرحمن ست الفقہاء بنت شیخ تقی الدین صرف جزر ابن عرفہ کے سماع کے لیے شیخ عبدالحق کی خدمت میں حاضر ہوئیں[3]۔ عائشہ بنت عمر حرانیہ نے امام زین الدین عراقی اور امام نجی سے روایت کے لئے ان دونوں حضرات کی درسگاہ کا سفر کیا، عائشہ بنت معمر اصفہانیہ نے محدثہ فاطمہ جوزدانیہ کی خدمت میں حاضری دی،

ست العرب بنت یحیٰی دمشقیہ نے امام ابن طبرزد کی درسگاہ میں پہونچکر کتاب الغیلانیات کا سماع کیا، اسی طرح مریم بنت احمد بعلبکیہ نے شیخ بہاء الدین اور ام محمد شہدہ بنت کمال الدین نے شیخ کاشغری کے یہاں جاکر روایت کی[4]

عام طور سے ان تعلیمی اسفار میں طالبات کی صنفی حیثیت و ضرورت کا پورا خیال رکھا جاتا تھا، اور ان کی راحت و حفاظت کا پورا اہتمام ہوتا تھا، خاندان اور رشتہ کے ذمہ داران کے ساتھ ہوتے تھے، امام سہمی نے تاریخ جرجان میں فاطمہ بنت ابوعبداللہ محمد بن عبدالرحمن طلقی جرجانی کے حال میں لکھا ہے کہ میں نے فاطمہ کو اس زمانہ میں دیکھا ہے کہ جب ان کے والدان کو اٹھا کر امام ابواحمد بن عدی جرجانی کی خدمت میں لیجاتے تھے اور وہ ان سے حدیث کا سماع کرتی تھیں۔[5]

---

[1] العبر فی خبر من غبر ذہبی ج ۳ ص ۲۵۴ [2] ذیل العبر ذہبی ص ۰۰ [3] ایضاً ص ۱۴۱ [4] ذیل العبر وغیرہ [5] تاریخ جرجان ص ۲۶۳

فاطمہ بنت محمد بن علی لخمیہ اندلس کے مشہور محدث ابو محمد باجی اشبیلی کی بہن تھیں، انھوں نے اپنے بھائی ابو محمد باجی کے ساتھ رہکر طالب علمی کی، اور دونوں نے ایک ساتھ بعض شیوخ و اساتذہ سے حدیث کی روایت کی اور اجازت لی[1]، ام محمد فاطمہ بنت عبد الرحمن بن ابو صالح بغداد میں پیدا ہوئیں، اور بچپن ہی میں بغداد سے مصر لیجائی گئیں جہاں انھوں نے اپنے والد اور دیگر شیوخ سے حدیث کا سماع کیا[2]، شمس الضحیٰ بنت محمد بن عبد الجلیل عالمہ فاضلہ اور عابدہ، زاہدہ خاتون تھیں، انھوں نے شیخ الطریقت شیخ ابو النجیب سہروردی کی خدمت میں رہ کر زہد و تصوف کی تلقین و تربیت پائی، اور ان کے ساتھ دیگر محدثین سے حدیث کا سماع کیا۔

محدثین کی طرف سے محدثات کو اجازت، طالبات و عالمات کے علمی اور دینی ذوق و شوق اور ان کی سفری مشکلات کے پیش نظر بہت سے شیوخ و اساتذہ نے ان کو اپنی طرف سے حدیث کی روایت کی اجازت دیدی ہے، محدثین کے نزدیک اجازت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ شیخ اپنے سماع و روایت کے اصل نسخہ یا اس سے مقابلہ کئے ہوئے نسخہ کو یہ لکھکر اپنے تلمیذ کو دے کر ھذا سماعی او روایتی عن فلان فاروہ عنی او اجزت لک روایتہ یعنی یہ فلاں محدث اور شیخ سے میری مسموع یا مروی احادیث ہیں تم ان کو میری طرف سے روایت کرو، یا میں نے تم کو اپنی طرف سے ان کی روایت کی اجازت دی، بسا اوقات کسی ملک اور شہر کے طالب علم اور محدث کو دوسرے ملک اور شہر کے شیوخ تحریری اجازت دیتے ہیں، اور جن کو اجازت دی جاتی ہے وہ اپنے شیخ کے تلمیذ اور شاگرد مانے جاتے ہیں، بہت سے محدثین نے اس طرح روایت کی اجازت دیگر محدثات وراویات

---

[1] بغیۃ الملتمس ص ۱۳۵ [2] تاریخ بغداد ج ۱۴، ص ۴۴۴ [3] العقد الثمین ج ۸، ص ۲۲۲۔

کو اپنی شاگردی میں لیا ہے، محدثات کے تذکرہ میں، اجازلنا فلان، ولنا اجازۃ عن فلان وغیرہ کے الفاظ اسی کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں، نیز بہت سی محدثات نے مردوں کو اسی طرح اپنی طرف سے حدیث کی روایت کی اجازت دی ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

محدثات کو محدثین کی طرف سے اجازت بالروایۃ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں، شیخ صدر الدین قواس کی صاحبزادی ام محمد عائشہ دمشقیہ کو ابو القاسم بن قیرہ، ابن مسلمہ، مکی بن علوان، بہاء الدین زہیر، ابن زیاق، ابن دفترخوان، سلیمانی، اور نور بن سعید نے اپنی مرویات کی اجازت دی۔[۱] ام کمال عائشہ بنت قاضی شہاب الدین احمد بن ظہیرہ کو محمد بن علی قسطلانی، محمد بن یعقوب بن رصاص، قاضی ناصر الدین محمد بن محمد تونسی مالکی، ابو الحرم محمد بن محمد قلانسی کے علاوہ اور بہت سے محدثین نے اپنی مرویات کی اجازت دی۔[۲] ام الہدیٰ عائشہ بنت خطیب تقی الدین طبریہ مکیہ کو ان کے دادا محب الدین طبری، والد خطیب تقی الدین طبری، چچا قاضی جمال الدین طبری کے علاوہ رضی الدین بن خلیل، اور ان کے بھائی علم الدین بن خلیل وغیرہ نے اجازت دی۔[۳] ام ابراہیم فاطمہ بنت خطیب عز الدین ابراہیم بن عبد اللہ مشہور محدث ابراہیم ابن خلیل کی سب سے آخری شاگرد تھیں، اسی طرح وہ محمد بن عبد القادر، ابن سروری، ابن عروہ اور خطیب مردا سے روایت بالاجازۃ کرنے والوں میں سب سے آخری شاگرد تھیں۔[۴] عجیبہ بنت محمد باقداریہ بغدادیہ اپنے شیوخ حدیث مسعود دار رستمی وغیرہ سے روایت بالاجازہ میں سب سے آخری تلمیذہ تھیں۔[۵]

---

[۱] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۲۶۔ [۲] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۷۰، [۳] ایضاً ص ۲۷۸،
[۴] ذیل العبر حسینی ص ۲۵۹، [۵] العبر ج ۵ ص ۱۹۲،

ام الخیر جویریہ بنت قاضی زین الدین طبریہ مکیہ کو مختلف بلاد وامصار کے علماء محدثین نے اپنی مرویات کی اجازت سے نوازا تھا، مصر سے محمد بن قماح، ابن عالی، دمیاطی، ابن کشتغدی، ابن اسعردی، احمد بن علی مشتولی، اور دیگر شیوخ نے اور دمشق سے احمد بن علی جزری اور بہت سے محدثین نے اجازت دی، زینب بنت ضیاء الدین محمد بن عمر قسطلانیہ مکیہ کو بغداد سے ابراہیم بن خیر الدین ابوجعفر بن سید، فضل اللہ بن عبدالرزاق جیلی، اور امام رضی الدین حسن صغانی لاہوری نے تحریری اجازت روانہ کی، ست الکل بنت امام رضی الدین کو مصر کے محدثین کی ایک جماعت نے اجازت دی، جس میں سیدہ بنت موسیٰ بن عثمان اور درباس مارانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ام الحسن ست الکل بنت احمد قبیہ کو مصر سے یحییٰ بن یوسف مصری، محمد بن غالی دمیاطی، احمد بن علی مشتولی، ابونعیم اسعردی، قاضی شرف الدین بن قماح، عائشہ بنت عمر صنہاجیہ وغیرہ نے، اور دمشق سے ابوبکر رضی الدین، زینب بنت کمال الدین، اور دوسرے محدثین نے اجازت دی، دمشق کی اجازت ست الکل کی خالہ زاد بھائی کے ذریعہ آئی تھی،[1]

ام المؤید زینب بنت ابوالقاسم عبدالرحمٰن نیساپوریہ کے بارے میں ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ زبردست عالمہ تھیں، انھوں نے علماء کی ایک جماعت سے روایۃً اور اجازۃً علم حدیث حاصل کیا تھا، ان کو اجازت دینے والے اعیان علماء میں حافظ ابوالحسن عبدالغافر بن اسمٰعیل فارسی، اور علامہ محمود بن عمر زمخشری صاحب کشاف جیسے حفاظ و سادات شامل ہیں،[2] صفیہ بنت عبدالوہاب قرشیہ محدثۂ وقت تھیں، حالانکہ انھوں نے کسی شیخ اور محدث سے سماع و روایت نہیں کی تھی، بلکہ ان کو محدث مسعود ثقفی

---

[1] ان کے لئے العقد الثمین ج ۱۲ ملاحظہ ہو [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۱۶،

اور دیگر محدثین کبار نے روایت کی اجازت دی تھی،[1]

مُسندات | محدثات میں بہت سی بڑے پایہ کی عالمات و فاضلات گزری ہیں، جو اسنادِ حدیث میں ایسا ممتاز مقام و مرتبہ رکھتی تھیں کہ علماء و محدثین نے ان سے سند لی، ان میں سے چند مسندات یہ ہیں۔

مسندۃ الشام

ام محمد اسماء بنت محمد بن سالم بن ابو مواہب، ام محمد فاطمہ بنت ابراہیم بن محمود بعلبیہ ام عبداللہ زینب بنت احمد بن عبدالرحیم قدسیہ (مسندۃ الشام) کریمہ بنت عبدالوہاب ابن علی بن خضر قرشیہ زبیریہ (مسندۃ المکہ) فاطمہ بنت احمد بن قاسم حرازیہ (مسندۃ وقتہا) ست الوزراء بنت عمر بن اسعد بن منجا تنوخیہ

علمی و دینی القاب و خطابات | علماء و محدثین کی طرح عالمات و محدثات بھی بڑے بڑے علمی و دینی القاب و خطابات سے نوازی گئی ہیں، ذیل میں ان چند بناتِ اسلام کے القاب درج کئے جاتے ہیں جو اقلیم علم کی ملکہ ہیں، اور مسلمانوں نے ان کی علمی و دینی قیادت و امامت کو تسلیم کیا ہے، (ست بمعنی سیدہ ہے)

ست الاجناس موفقیہ بنت عبدالوہاب بن عتیق بن وردان مصریہ،

ستّ الاھل ام احمد بنت علوان بن سعید بعلبکیہ،

ست الشام خاتون اخت الملک العادل،

ست العرب ام الخیر بنت یحییٰ بن قایماز کندیہ دمشقیہ،

ست الفقہاء شریفہ بنت خطیب شرف الدین احمد بن محمد دمشقیہ،

ست الفقہاء امۃ الرحمن بنت تقی الدین ابراہیم بن علی واسطیہ صالحیہ،

---

[1] العبر ج ۵ ص ۱۸۸

ست الكل عائشہ بنت محمد بن احمد بن علی قلیسیہ۔ ست الكل۔ بنت امام رضی الدین ابراہیم بن محمد طبریہ مکیہ، ست الكل۔ بنت احمد بن محمد مکیہ، ست الملوك۔ فاطمہ بنت علی بن علی بن ابو بدر بغدادیہ، ست الناس۔ کمالیہ بنت احمد بن عبد القادر دمرادیہ، ست الوزراء۔ بنت عمر بن اسعد تنوخیہ تاج النساء۔ بنت رستم بن ابو رجا بن محمد اصفہانیہ، شرف النساء امۃ اللہ بنت احمد بن عبد اللہ بن علی آبنوسیہ، فخر النساء شہدہ بنت احمد ابن عمر ابریہ بغدادیہ، زین الدار۔ وجیہہ بنت علی بن یحیٰ انصاریہ بوصیریہ شیخۃ الدیار۔ ام خلیل۔ ختارہ۔ ام المؤید زینب بنت ابو القاسم عبد الرحمن شعریہ نیساپوریہ، جلیلہ۔ ام عمر خدیجہ بنت عمر بن احمد بن عدیم، معلمۃ۔ عالیہ بنت محمد اندلسیہ۔ شیخہ۔ ام عبد اللہ حبیبہ بنت خطیب عز الدین ابراہیم مقدسیہ شیخہ۔ ام زینب فاطمہ بنت عباس بغدادیہ، شیخہ۔ ام الفضل صفیہ بنت ابراہیم بن احمد مکیہ، شیخہ۔ ام احمد زینب بنت مکی بن علی کامل حرانیہ

سند عالی۔ احادیث کی روایت میں سند عالی کو بڑی اہمیت حاصل ہے، علو سند کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً کسی سند میں رواۃ حدیث دوسری سند سے کم ہوں جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلۂ روایت مختصر اور قریب ہو، یا کسی امام سے قربت ہو، یا کسی کتاب کی روایت میں قربت ہو، محدثین نے اس فضیلت و خصوصیت کے لیے دور دراز علاقوں کا سفر کیا ہے، سند عالی رکھنے والے محدثین کی درسگاہ میں طلبۂ حدیث کا ہجوم رہا کرتا تھا، ان ہی کی طرح بہت سی محدثات نے بھی سند عالی کی فضیلت حاصل کی اور ان کے در پر بھی طلبۂ حدیث جوق در جوق آئے، فاطمہ بنت وقاق کے بارے میں

امام ذہبی نے لکھا ہے۔

کانت کبیرۃ القدر، عالیۃ الاسناد، من عوابد زمانہا۔[1]

وہ بڑی قدر و منزلت کی مالکہ تھیں، اور ان کی اسناد عالی تھیں۔ اپنے زمانہ میں عابدات میں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔

اور ام المؤید زینب شعریہ نیساپوریہ کے متعلق تصریح کی ہے،

وانقطع بموتہا اسناد عالٍ[2]

ان کے انتقال سے سند عالی کا سلسلہ منقطع ہوگیا

ام محمد زینب بنت احمد بن عمر مقدسیہ مسند دارمی، مسند عبد بن حمید، اور کتاب الثقفیات کی سند عالی میں منفرد تھیں، اس لئے طلبۂ حدیث نے ان کتابوں کی روایت کے لیے انکی درسگاہ کا سفر کیا، اور دور دور سے حاضر ہو کر ان سے سند حاصل کی انھوں نے خود نیشاپور سے مصر اور مدینہ منورہ آکر ان کتابوں کی روایت کی تھی۔

احادیث یا کتب احادیث میں منفردات،

محدثین کی طرح محدثات بھی بعض احادیث یا کتب احادیث کی روایت میں اپنے زمانہ میں متفرد ہوتی تھیں، اور دوسرے معاصرین و معاصرات کے یہاں ان کی روایت نہیں تھی اس تفرّد اور خصوصیت کی وجہ سے طلبۂ حدیث نے ان محدثات وشیخات سے خاص طور سے روایت کی، مسندۃ الشام ام عبد اللہ زینب بنت کمال الدین مقدسیہ کا شمار ایسی محدثات میں تھا، ام محمد اسماء بنت محمد بن سالم کو بھی تفرد کی فضیلت حاصل تھی، امۃ الحق بنت حافظ ابو علی حسن بن محمد بکریہ کے بارے میں العبر میں ہے،

وتفردت بعدۃ اجزاء[3]

وہ احادیث کے چند اجزا کی روایت میں منفرد تھیں

اور صفیہ بنت عبد الوہاب قرشیہ کے متعلق لکھا ہے۔

---

[1] العبر ج ۳ ص ۲۰۶ [2] ،، ج ۵ ص ۵۶ [3] ،، ص ۳۵۲،

تفردت فی زمانہا[1] — وہ بہت سی احادیث کی روایت میں اپنے زمانہ میں تنہا تھیں۔

زینب بنت خطیب یحیٰ بن عزالدین مسلیہ کے حال میں ہے۔

روت الکثیر، وتفردت[2] — اور انھوں نے بہت زیادہ روایت کی اور تفرد رکھتی تھیں،

زینب بنت سلیمان اسعردیہ کے متعلق لکھا ہے۔

تفردت باشیاء — کچھ احادیث کی روایت میں متفرد تھیں،

زینب بنت عبداللہ بن رضی الدین کو بھی یہ شرف حاصل تھا۔

تفردت باجزاء — چند اجزاء حدیث کی روایت میں وہ بھی متفرد تھیں،

ام الفضل بی بی بنت عبدالصمد ہرثمیہ ہردیہ کے پاس احادیث کا ایک جزء (مختصر سا مجموعہ) تھا، جو ان ہی کی نسبت سے مشہور تھا، انھوں نے اس کی روایت عبدالرحمٰن بن ابو شریح سے کی۔

[**خاتمۃ الاصحاب**] شیوخ و محدثین کے اصحاب و تلامذہ میں جو آخری شاگرد ہوتا ہے یا ان میں جو سب سے آخر تک زندہ رہتا ہے، وہ خاتمۃ الاصحاب ہوتا ہے، ایسے محدث سے بھی سند عالی ملتی ہے، اس لئے طلبۂ حدیث اس سے روایت کرتے ہیں، اس خصوصیت کی وجہ سے وہ مرجع ہوتا ہے، محدثات میں بھی ایسی خاتمۃ الاصحاب ہوئی ہیں۔

فاطمہ بنت خطیب عزالدین ابراہیم مقدسیہ، شیخ ابراہیم بن خلیل کی خاتمۃ الاصحاب ہیں یعنی ان کے بعد کسی نے شیخ ابراہیم سے روایت نہیں کی نیز وہ ابن عبدالقادر، ابن سری،

---

[1] العبر ج ۳ ص ۱۰۹ [2] ایضاً ص ۲۰۷-

ابن عتوہ، اور خطیب مرداسے اجازۃً روایت کرنے والوں میں آخری شاگرد ہیں، عجیبہ باقداریہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ وہ مسعود ثقفی، رستمی، اور محدثین کی ایک جماعت سے روایت بالاجازہ کرنے والوں میں آخری شاگرد ہیں، ام ہانی عفیفہ بنت احمد فارقانیہ اصفہانیہ نے امام ابونعیم اصفہانی کے شاگرد عبدالواحد الاشیخ سے سب سے آخر میں روایت کی ہے، اور وہ ان کی خاتمۃ الاصحاب ہیں، مشہور محدث ابوالغنائم مسلم بن احمد مازنی دمشقی سے سب سے آخر میں روایت کرنے والے دو ہیں، ایک فاطمہ بنت سلیمان، دوسرے ابوالفتوح اغاثی اسکندرانی،

تحدیث و روایت اور اسکے طریقے، محدثات اسلام جس طرح طلب علم میں سفر ہو یا حضر شرعی احکام کی پابندی اور اپنے صنفی تقاضوں کا پورا خیال رکھکر شریعت و نسوانیت کی حدود میں رہیں اسی طرح حدیث کی تدریس و روایت میں ذمہ دارانہ طور و طریقہ اختیار کیا اور کسی حال میں اپنی حد سے باہر نہیں ہوئیں، خاص طور سے حجاب اور پردہ کے بارے میں ان کا رویہ بہت سخت رہا، عاصم بن سلیمان الاحولی کا بیان ہے کہ لوگ حفصہ بنت سیرین کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ اپنی چادر کو سنبھال کر چہرہ پر نقاب ڈال لیتی تھیں. ہم ان سے عرض کرتے تھے، کہ آپ یہ تکلفات کیوں کر رہی ہیں، آپ جیسی عمر رسیدہ خواتین کے بارے میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے،

والقواعد من النساء اللاتی	جو بڑی بوڑھی عورتیں گھروں میں بیٹھنے
لا یرجون نکاحاً فلیس علیھن	والی ہیں جن کو توقع نہیں رہی نکاح کی
جناحٌ ان یضعن ثیابھنّ	ان پر گناہ نہیں ہے کہ اتار رکھیں اپنے کپڑے
غیر متبرجات بزینۃ	بشرطیکہ اپنی زیب و زینت ظاہر کرنے والی نہ ہوں ۔

تو وہ ہم سے دریافت کرتی تھیں کہ اس آیت کے بعد کیا فرمایا گیا ہے؟ اور جواب میں ہم یہ آیت سناتے تھے،

وان یستعففن خیر لھن — اور اگر وہ اس سے بچیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔

اس پر کہتی تھیں کہ چادر اوڑھ لینے میں یہی بات ہے[1]

بعض عالمات و فاضلات شرعی احکام سے فائدہ اٹھا کر شرعی حدود کے ساتھ بے نقاب بھی علماء و فضلاء کے سامنے آتی تھیں، اور ان سے علمی و دینی موضوعات پر گفتگو کرتی تھیں چنانچہ علیہ بنت حسان البصریہ بنو شیبان کی مولاۃ یعنی باندی تھیں، وہ علم و فضل میں اتنا بلند مقام رکھتی تھیں کہ بصرہ کے علماء و مشائخ اور فقہاء ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ کھل کر ان سے بات چیت کرتی تھیں، طبقات ابن سعد میں ہے۔

وکانت امرأۃ نبیلۃ	علیہ بنت حسان بڑی شان و شوکت
عاقلۃ برزۃ لھا دار	کی عقلمند اور نمایاں حیثیت کی عورت
بالعوقۃ تعرف بھا وکان	تھیں، بصرہ کے جلہ عوقہ میں ان کا
صالح المری وغیرہ من	مکان ان ہی کے نام سے مشہور تھا،
وجوہ البصرۃ وفقھائھا	حضرت مری اور بصرہ کے دوسرے
ید خلون علیھا فتبرز لھم	اعیان و فقہاء ان کے یہاں جایا
وتحادثھم وتسائلھم[2]	کرتے تھے، اور وہ ان کے سامنے
	آکر گفتگو اور سوال و جواب کیا کرتی تھیں

---

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۱۵ [2] طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۳۲۵۔

محدثات نے اپنی حدود میں رہتے ہوئے جس طرح اپنے اساتذہ و شیوخ سے سماعاً قراءۃً اجازۃً حدیث کی روایت کی ہے، اسی طرح خود بھی ان ہی طرق سے دوسروں کو حدیث کا درس دیا، اور روایت کا جو طریقہ حسب موقع رہا اسی کے مطابق روایت کی، چنانچہ ائمۂ حدیث اور حفاظ حدیث نے ان سے بھی سماعاً، قراءۃً اور اجازۃً استفادہ کیا۔

سماع یعنی استاد اپنے شاگردوں کو احادیث سنائے اور شاگرد سنے بنات اسلام نے یہ طریقہ اپنے اعزہ واقارب اور خاندان والوں کو درس حدیث دیتے ہوئے اختیار کیا ہے،

قراءۃ یعنی شاگرد اپنے استاد کے سامنے حدیث پڑھے اور استاد کے ساتھ طلبہ کی جماعت بھی سنے ایسی صورت میں گویا پوری جماعت استاد کے سامنے پڑھ رہی ہے اور وہ سن رہا ہے، اس طریقہ کو قراءۃ علی الشیخ اور عرض بھی کہتے ہیں، عام طور سے محدثات وشیخات نے اپنے تلامذہ کو اسی طریقہ سے حدیث کا درس دیا ہے، وہ پس پردہ ہوتی تھیں اور ان کا کوئی رشتہ دار یا محرم قراءت کرتا تھا، جسے وہ اور طلبہ کی جماعت سنتی تھی،

اجازۃ یعنی استاد اپنی روایت کردہ احادیث کو اپنے سامنے شاگردوں کو یہ کہکر دے کہ تم کو میری طرف سے ان کی روایت کی اجازت ہے، اس طریقہ سے بہت سے محدثین نے محدثات کو اور بہت سی محدثات نے محدثین کو اجازت دی ہے، امام ابوالقاسم سہمی جرجانی نے ہبۃ العزیز بنت احمد جرجانیہ سے روایت کرنے کی کیفیت یوں بیان کی ہے:

اخبرتنا ام الفضل ھبۃ العزیز	ام الفضل ہبۃ العزیز بنت احمد نے ہم
بنت احمد بن عبد الرحمن	سے یوں حدیث بیان کی کہ ان کے
بن عبد المؤمن بقراءتی	بھائی ابوغندان کے سامنے پڑھ رہے تھے

اخیها ابی ذرؓ علیها[1]

ام محمد فاطمہ بنت عبد الرحمٰن بغدادیہ سے عبد الرحمٰن بن قاسم حدیث کا سماع کرتے تھے۔ اور ان کے لڑکے احمد اپنے والد کے ساتھ اس سماع میں شریک تھے[2]، امام ابن جوزی نے فاطمہ بنت حسین رازیہ سے اپنے سماع کی یہ کیفیت بیان کی ہے۔

سمعت منها بقراءة شیخنا	میں نے فاطمہ سے حدیث کا سماع اپنے
ابی الفضل بن ناصر[3]	استاد ابو الفضل بن ناصر کی قرارت

سے کیا ہے۔

امام تقی الدین فاسی مکی صاحب العقد الثمین نے زینب بنت قاضی مکہ کمال الدین سے مقام بدر میں حدیث کا سماع کیا تھا۔

روت لنا ببدر من الحدیث	زینب نے مقام بدر میں اپنے شوہر
مع زوجها القاضی جمال	قاضی جمال الدین بن ظہیرہ کی موجودگی میں
الدین بن ظهیرة[4]	ہم سے کچھ حدیثوں کی روایت کی

فاطمہ بنت نفیس الدین محمد ہنبیہ مکیہ نے کتاب ابن ابی الدنیا کی روایت کی، اس کی کیفیت امام تقی الدین فاسی مکی نے اس طرح بیان کی ہے کہ صدر الدین احمد بن بہاء الدین دمشقی نے اس کی قرارت کی، اور اس مجلس میں فاطمہ کے ساجزادے شیخنا محمد بن عبد الملک مرجانی اور شیخنا ابن سکر نے صدر الدین مذکور کے ساتھ اس کا سماع کیا[5]، ام عبد الکریم فاطمہ بنت نور الدین محمد طبریہ مکیہ سے شریف ابو الخیر بن ابو عبد اللہ (فاسی) اور ان کے بھائی

۱؎ تاریخ جرجان ص ۴۶۳، ۲؎ تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۴۱ ۳؎ المنتظم ج ۱۰ ص ۴؎ العقد الثمین ج ۸ ص ۲۳۳ ۵؎ ایضاً ص ۲۹۰۔

شریف ابو المکارم نے حدیث کا سماع کیا، اور ابن قطیر نے قرارت کی،[1]

محدثات و شیخات کی درسگاہوں میں طلبۂ حدیث کا ہجوم

ان محدثات و شیخات سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے لیے دور دراز ملکوں سے طلبۂ حدیث جوق در جوق حاضر ہوتے تھے، اور ان سے روایت کو اپنے مفاخر و محاسن میں شمار کرتے تھے، ان کی درسگاہوں میں صرف طلبہ ہی نہیں بلکہ ائمہ و حفاظ حدیث آکر فیض یاب ہوتے تھے۔

ام محمد بن زینب بنت احمد بن عمر مقدسیہ نوے[9] سال کی عمر تک حدیث کا درس دیتی رہیں، اور مختلف ملکوں کے طلبۂ حدیث ان کی درسگاہ میں حاضر ہوکر فیض یاب ہوئے، انھوں نے خود بھی مختلف شہروں میں گھوم گھوم کر درس دیا، امام ذہبی نے ان کے حال میں لکھا ہے۔

دارتحل الیہا الطلبۃ و	طلبہ نے ان کے یہاں کا سفر کیا اور
حدثت بمصر و بالمدینۃ	خود انھوں نے مصر اور مدینہ منورہ
المنورۃ۔[2]	میں حدیث کا درس دیا۔

ام احمد زینب بنت مکی حرانیہ نے چورانوے[94] سال کی عمر تک حدیث کا درس دیا اور اس دور میں بھی ان کی درسگاہ میں طلبہ کا ہجوم رہا کرتا تھا، ذہبی نے لکھا ہے۔

وازدحم علیہا الطلبۃ[3]	ان کے یہاں طلبہ کی بھیڑ رہا کرتی تھی

ام عبد اللہ زینب بنت کمال الدین احمد بن عبد الرحیم مقدسیہ مسندۃ الشام تھیں ان کی پوری زندگی احادیث کی روایت اور کتب حدیث کی تعلیم میں گذری، ان کی درسگاہ میں طلبہ کی بڑی کثرت رہا کرتی تھی،

---

[1] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۰۱ [2] ذیل العبر ص ... [3] العبر ...

وتكاثر الطلبة عليها وتفردت وسمعت كتباً كباراً رحمها الله

(العبر ذهبی۔ ص ۲۱۳)

انکے یہاں طلبہ کی کثرت ہوا کرتی تھی وہ بہت سی احادیث کی روایت میں منفرد تھیں اور انھوں نے حدیث کی بڑی بڑی کتابوں کا درس دیا۔

فخر النساء شہدہ بنت احمد بن عمر بغدادیہ تقریباً سو سال کی عمر میں فوت ہوئیں، ان کو سماع عالی کا شرف حاصل تھا، اس لیے بڑے بڑے ائمہ حدیث ان کی درسگاہ میں آکر ان سے سماع کرتے تھے، ابن خلکان نے لکھا ہے،

وكان لها سماع عالٍ الحقت فيه الاصاغر بالاكابر۔

(ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵)

انکو سماع عالی حاصل تھا اسی سے انھوں نے خلف کو سلف سے ملادیا یعنی انکو ائمہ حدیث سے سماع حاصل تھا، اور انکے تلامذہ میں ان سے سماع حاصل کرکے ائمہ

امام ابن جوزی نے ان کے بارے میں تصریح کی ہے۔

وكان لها بر وخير وقرئ عليها الحديث سنين وعمرت حتى قاربت المائة۔

(المنتظم ج ۱۰ ص ۲۴۸)

وہ بڑی صالحہ اور نیک تھیں ان سے برسوں حدیث کا درس لیا گیا تقریباً سو سال کی عمر پائی۔

کریمہ بنت احمد مروزیہ کشمیہنیہ علم حدیث میں بڑے مرتبہ کی مالک تھیں، صحیح بخاری کی روایت میں ان کو خاص فضیلت وشہرت حاصل تھی، اس زمانہ کے اعیان ومشاہیر ان سے شرف تلمذ حاصل کرتے تھے، ابن جوزی نے لکھا ہے۔

وقرء عليها الائمة كالخطيب وابن المطلب والسمعانی وابی طالب الزینبی،

(منتظم ج ۸ ص ۲۷۰)

ان سے خطیب بغدادی ابن مطلب سمعانی ابو طالب زینبی جیسے ائمہ حدیث نے پڑھا۔

خطیب بغدادی نے ان سے یوں روایت کی کہ جب وہ ۴۴۵ھ میں حج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ گئے تو وہیں پانچ دن میں ان سے صحیح بخاری پڑھی،

ام محمد زینب بنت احمد تو نسیتہ مکیہ بنت المغربی کی کنیت سے مشہور تھیں، انکے بارے میں امام فاسی نے لکھا ہے۔

حدثت وسمع منها الفضلاء[1]	انھوں نے حدیث کا درس دیا اور ان سے فضلاء نے سماع کیا۔

مسندہ مکہ فاطمہ بنت احمد مکہ مکرمہ میں حدیث کا درس دیا کرتی تھیں جس میں اعیان محدثین شریک ہوتے تھے، امام تقی الدین فاسی کا بیان ہے۔

حدثت وسمع منها الاعيان من شيوخنا وغيرهم وسمعت عليها الثقفيات[2]	انھوں نے حدیث کا درس دیا اور ان سے ہمارے اساتذہ وغیرہ میں بڑے ممتاز حضرات نے سماع کیا، خود میں نے ان سے کتاب الثقفیات کا سماع کیا ہے

مسندۃ الشام کریمہ بنت عبد الوہاب سے شرف تلمذ حاصل کرنے کیلئے طلبۂ حدیث ہی نہیں حفاظ حدیث اور مسندین وقت ان کی درسگاہ میں حاضر ہوتے تھے، چنانچہ حافظ زین الدین محمد بن ابوبکر صولی شافعی ابیوردی نے چالیس سال کی عمر میں ان سے حدیث کا سماع کیا اسی طرح امام عماد الدین مرتضیٰ مسندی دمشقی اور مسند شام امام بہاء الدین ابن قاسم نے ان کی خدمت میں آکر روایت کی اجازت حاصل کی۔

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں وہاں کی محدثات کا تذکرہ کیا ہے۔ ... کے ذکر میں

---

[1] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۲۶ [2] ایضاً ص ۲۵۶

ان سے روایت کرنے کو نہایت فخریہ انداز میں بیان کیا ہے، اور بعض محدثات سے استفادہ نہ کرنے پر افسوس ظاہر کیا ہے، چنانچہ خطیب نے لکھا ہے کہ میں نے فاطمہ بنت ہلال بن احمد کرجیہ سے سماع کیا ہے، وہ صادقہ تھیں، بغداد کے مشرقی حصہ میں سشینیہ بازار کے کنارے رہتی تھیں، ستیتہ بنت قاضی ابو القاسم عبد الواحد بن محمد بجلیہ صادقہ فاضلہ تھیں، بغداد کے مشرقی علاقہ میں حریم دار الخلافہ کے قریب رہتی تھیں، میں نے ان سے بھی حدیث کی تعلیم حاصل کی ہے، خدیجہ بنت محمد بن علی الواعظ شاہجانیہ صالحہ صادقہ تھیں، بغداد کے محلہ قطیعۃ الربیع میں رہتی تھیں، میں نے ان سے حدیث لکھی ہے، ام سلمہ خدیجہ بنت موسیٰ بن عبد اللہ الواعظ صالحہ، ثقہ، فاضلہ تھیں، بغداد کے مقام توثہ میں رہتی تھیں میں نے ان سے بھی حدیث لکھی ہے، طاہرہ بنت احمد بن یوسف تنوخیہ سے میں نے قاضی ابو القاسم تنوخی کے گھر میں سماع کیا ہے، طاہرہ کی مسموعات قاضی تنوخی کے پاس انکی کتاب میں تھیں، ام عمر بنت ابو الغصن حسان بن زید ثقفیہ بغداد میں معاذ بن مسلم کے گھر کے پاس رہتی تھیں، میں نے ان سے سماع کیا ہے نیز لکھا ہے۔

وحدثت ام عمر هذه	انھوں نے ہمارے معاصرین کو
غير واحد من اصحابنا	حدیث کا درس دیا جیسے محمد بن صباح
منهم محمد بن الصباح	جرجرائی اور دواہی وغیرہ۔

الجرجرائی والدواهی،

بغداد کی محدثات وشیخات میں فاطمہ بنت محمد بن عبید بن سشخیر صیرفیہ مشہور شیخۂ حدیث تھیں، ابو الفتح محمد بن ابو الفوارس کے پڑوس میں قیام کرتی تھیں، بہت سے محدثین نے ان سے روایت کی ہے، خطیب بغدادی کو ایک واسطہ سے ان سے شرف تلمذ حاصل تھا

اس کے باوجود براہ راست ان سے روایت نہ کر سکنے پر افسوس رہا جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے،

لم یقدر لی السماع عنہا	ان سے سماع میرے مقدر میں نہیں
ولکن حدثنی ابو طاہر محمد	تھا، مگر ابو طاہر محمد بن احمد الکتانی
بن احمد بن الاشنانی عنہا	نے ان کی روایت مجھ سے بیان
وکانت ثقۃ[1]	کی ہے،

ست الوزراء بنت عمر بن اسعد تنوخیہ مسندۃ الوقت تھیں، ان کا حلقۂ درس دمشق سے مصر تک پھیلا ہوا تھا، وہ دونوں شہروں میں حدیث کا درس دیا کرتی تھیں، خاص طور سے صحیح بخاری اور مسند امام شافعی کے درس میں ان کو شہرت حاصل تھی، انھوں نے مصر و دمشق میں یہ دونوں کتابیں متعدد بار پڑھائیں[2]

شمس الضحیٰ بنت محمد بن عبد الجلیل محدثہ عابدہ زاہدہ تھیں، ان کا باقاعدہ حلقۂ درس تھا جس میں طلبۂ حدیث شریک ہو کر تعلیم حاصل کرتے تھے، تقی الدین فاسی مکی کا بیان ہے کہ

وسمع منہا جماعۃ من طلبۃ	ان سے طلبۂ حدیث کی ایک جماعت
الحدیث[3]	نے سماع کیا ہے۔

فاطمہ بنت حسین الواعظ رازیہ کے حال میں امام ابن جوزی نے لکھا ہے کہ میں نے ان سے اپنے استاد ابو الفضل بن ناصر کی قرارت کے ذریعہ ابراہیم حربی کی کتاب ذم الغیبۃ

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ بغداد ج ۱۴ بالترتیب ص ۴۴۵ و ۴۴۴ و ۴۴۴ و ۴۴۴ و ۴۴۳ و ۴۴۳ و ۴۴۲ و ۴۴۲ و ۴۴۳ و ۴۴۵ [2] ذیل الجوزی ص ۵۵ [3] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۰۵

ابن سحنون کی کتاب المجالس اور امام شافعی کی مسند کا سماع کیا ہے[1] امام ذہبی نے ام محمد
شہدہ بنت کمال الدین کے تذکرہ میں ان سے اپنے سماع کی تصریح کی ہے محدث ابن
نقطہ کا بیان ہے کہ میں نے عائشہ بنت معمر اصفہانیہ سے مسند ابی یعلیٰ کا سماع کیا
ہے۔ اور عائشہ نے اس کا سماع امام صیرفی سے کیا تھا، امام تقی الدین
فاسی مکی کا بیان ہے کہ ام محمد علماء بنت ابو الیمن محمد نے اپنی پھوپھی ام الحسن فاطمہ
بنت احمد بن رضی الدین سے حدیث مسلسل بالاولیۃ کا اور اپنے نانا شیخ رضی الدین
طبری سے تساعیات رازی کا سماع کیا تھا، اور میں نے علماء بنت احمد سے ان دونوں
کا سماع کیا ہے[2] اور مسند مکہ فاطمہ بنت احمد بن قاسم سے ہمارے شیوخ نے سماع کیا
تھا، اور میں نے ان سے ثقفیات کا سماع مدینہ منورہ میں کیا جب کہ وہاں مقیم تھیں[3]
امام احمد بن علی صالحی حنفی متوفی ۷۶۵ھ نے زینب بنت معلم سے سماع کیا ست الوزراء
سے صحیح بخاری پڑھی،[4] ابو العباس احمد بن علی قرشی بکری، کرمزی، ذہبی، ابن الجزری
کی طرح فاطمہ بنت ابراہیم مقدسیہ نے بھی حدیث کی اجازت دی تھی،[5] (باقی)

---

[1] المنتظم ج ۱۰ ص ۹ [2] العقد الثمین ج ۸ ص ۱۸۱ و ۲۹۶ [3] طبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ ج ۱ ص ۱۰۴ [4][5] ایضاً ص ۲۷۹

تذکرۃ المحدثین

یعنی صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی
صدی کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات و سوانح اور
ان کی شاندار خدمات کی تفصیل۔　　مولانا ضیاء الدین اصلاحی
رفیق دار المصنفین،　　قیمت - ۱۳ - ۵

ابوبکر زکریا رازی اور اسکی کتاب الحاوی

از جناب حکیم مولوی محمد عطاء الرحمن صاحب سیوانی ندوی انچارج ریسرچ یونٹ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

علم طب کی تاریخ میں آٹھویں صدی عیسوی کے جلیل القدر اور جدت پسند طبیب ابوبکر محمد بن زکریا رازی کو بہت ممتاز مقام حاصل ہے، اس کا مولد و منشا ایران کا مشہور مردم خیز شہر رے تھا، اس نے اسی شہر کی نسبت سے شہرت پائی۔ وہ بچپن ہی سے علوم عقلیہ کا دلدادہ تھا چنانچہ منطق و فلسفہ اور ہندسہ و ہیئت کی تحصیل میں اس نے بڑی محنت کی تھی، اس کو موسیقی سے بھی خاص شغف تھا، اور عود بجانے میں بڑا ماہر تھا،[۱] شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی، لیکن اسکے فکر و نظر کی اصل جولانگاہ فن طب ہے۔ اس کی تحصیل کے لیے وہ بغداد گیا تھا، اور وہاں متوکل باللہ کے طبیب خاص ابوالحسن علی بن زین الطبری کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرکے اس فن کی تکمیل کی۔ گو اس کو طب کی تحصیل کا شوق اس وقت پیدا ہوا جب کہ اسکی عمر چالیس سے متجاوز ہو چکی تھی، پھر بھی اس نے اس فن میں اتنا کمال پیدا کیا کہ کم از کم مسلمان اطباء میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے، اسی باعث قفطی اس کو طبیب المسلمین غیر مدافع لکھتا ہے۔[۳]

ابن خلکان رقمطراز ہے،

کان امام وقتہ فی الطب　　وہ اپنے زمانہ میں طب کا امام اور

---

[۱] عیون الانباء ج ۱ ص ۳۰۹ [۲] ابن خلکان ج ۲ ص ۳۰۰ [۳] اخبار الحکماء ص ۱۸۰

والمشار اليه في ذلك العصر
وكان متقناً لهذه الصناعة
حاذقاً بها عارفاً بأوضاعها
وقوانينها تشد اليه
الرحال لأخذها عنه[1]

مرجع انام تھا نیز اس فن کا ماہر و
تجربہ کار اور اس کے مختلف حالات و
قواعد کا واقف کار تھا۔ اس فن کی
تحصیل کرنے کے لیے لوگ دور دور
سے سفر کر کے اس کے پاس آتے تھے۔

ابن ندیم لکھتا ہے۔

أوحد دهره وفريد عصره
قد جمع المعرفة بعلوم القدماء
لاسيما الطب[2]

وہ یگانۂ دہر اور منتخب روزگار تھا،
متقدمین کے تمام علوم خصوصاً طب کا
ماہر اور جامع تھا۔

عہد حاضر میں سارٹان (Sarton) اس کے بارے میں لکھتا ہے۔

The greatest Clinician of Islam and of The middle Ages Galnic in Theory: he combined with his immuselear-ning true. Hippocratie wisdom.

(Sarton, Intraduction To The History of Science. Vol. 1 Page 609)

اسی طرح کیمبل (Campbell) جو اسلامی طب کی تاریخ کا مشہور مبصر ہے لکھتا ہے۔

۱؎ وفیات الاعیان ج ۲ ص ۵۰۰ ۲؎ الفہرست لابن الندیم

With The name of Ar-Razi

.......we arrive at the maturity of The classical Period of Arabian medicine ....He was The most celebrated and probably the most original. of The Arabian writers who followed both – Hippocrates and Glen in Their – methods and ideas .....He was a great clinician, and rauks with Hippocrates as one of The original Portray ers of deseas.

(Campbell: History of Arabian medicine. P. 65.)

اس طبی مہارت کے باعث ابوبکر رازی بیمارستان رے کا افسر الاطباء (چیف میڈیکل آفیسر) مقرر ہوا۔ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ وہ اسپتال میں اپنے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ سے گھرا رہتا تھا۔ جب کوئی مریض اسپتال پہونچتا تھا تو پہلے اس کے شاگردوں کے شاگرد اس کا طبی معائنہ کرتے تھے۔ اگر وہ مرض کی تشخیص کر لیتے تو فبہا ورنہ پھر اسکو رازی کے براہ راست شاگرد دیکھتے تھے۔ اگر مرض اتنا غیر الفہم ہوتا کہ وہ بھی اس کو

سمجھنے سے قاصر رہتے تو آخر میں وہ مریض رازی کے سامنے پیش کیا جاتا تھا[1] اور وہ اپنی ذکاوت و حذاقت اور مہارت فن سے اس کے مرض کی تشخیص کر کے علاج کرتا۔ اور اس کی شفایابی کے لیے ہر امکانی جدوجہد کرتا تھا۔ بقول ابن ابی اصیبعہ وہ مریضوں سے نہایت شفقت و محبت اور ملائمت سے پیش آتا تھا۔ وہ طب کے اسرار و غموض پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اس کا بیشتر وقت متقدمین فضلا اور علمائے فن کی کتابوں کے مطالعہ میں گزرتا تھا۔ یہاں تک کہ معالجات و ادویہ کے باب میں اس کی بعض ایسی نادر تحقیقات تھیں جن تک بہت سے اطباء کے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی تھی[2]۔

اس کے بعد ابوبکر رازی بغداد کے مشہور اسپتال "بیمارستان عضدی" کا افسر الاطباء مقرر ہوا۔ اور طویل مدت تک اس منصب پر فائز رہا۔ ابن ابی اصیبعہ نے ابوالقاسم بغدادی کاتب کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب عضد الدولہ نے مذکورہ اسپتال کو قائم کیا تو اس کی خواہش ہوئی کہ اس میں ماہرین فن اطباء اور فضلائے عصر کی ایک جماعت موجود ہو۔ چنانچہ اس کے حکم سے پچاس مشہور طبیبوں کا انتخاب عمل میں آیا۔ جس میں رازی کا نام ... سرفہرست تھا، پھر اس تعداد میں سے بھی منتخب کر کے دس طبیبوں کی فہرست بنائی گئی تو رازی اس میں بھی شامل رہا۔ اور اس کے بعد پھر جب دس میں سے بھی صرف تین کو منتخب کیا گیا تو بھی رازی نہ صرف ان میں سے ایک رہا بلکہ اسی کو افسر الاطباء بنایا گیا[3] لیکن اس بیان کو نقل کرنے کے بعد ابن ابی اصیبعہ نے اپنی رائے یہ ظاہر کی ہے کہ رازی عضد الدولہ سے متقدم تھا۔ اور وہ جس اسپتال سے متعلق تھا وہی بعد میں "بیمارستان عضدی" کے نام سے موسوم ہوا (جب کہ عضد الدولہ نے اسکی

---

[1] الفہرست لابن ندیم [2] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۱ ص ۳۱۱ [3] ایضاً ص ۳۱۰
[4] اخبار الحکماء ص ۱۰۹

الرسالۃ تعلیم [illegible] کی

ابوبکر زکریا رازی کے اکثر سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ آخر عمر میں نزول الماء موتیابند کے سبب سے نابینا ہو گیا تھا۔ اور جب اس سے آپریشن کے بارے میں کہا گیا تو یہ کہکر انکار کر دیا کہ

قد انصرت من الدنیا حتی مللت[1] — میں دنیا دیکھتے دیکھتے اکتا گیا ہوں

ابوبکر رازی نے مختلف علوم و فنون میں بکثرت کتابیں تالیف کی ہیں جن کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے۔ چنانچہ ابن ابی اصیبعہ، ابن القفطی اور ابن ندیم نے اس کی چھوٹی بڑی کتابوں اور رسائل کی بہت طویل فہرست نقل کی ہے، ان میں اکثر تصنیفات فن طب سے متعلق ہیں ان کتابوں میں کتاب الحاوی کل سرسید کی حیثیت رکھتی ہے، یہ کتاب اسلامی طب کی انجیل مقدس سمجھی جاتی رہی ہے چنانچہ علی بن العباس المجوسی جو رازی کے نصف صدی بعد ہی پیدا ہوا تھا اور جس کی کتاب کامل الصناعۃ قانون سے پہلے طب کی معتمد علیہ کتاب سمجھی جاتی تھی، بلکہ شائد اسی کو سامنے رکھ کر شیخ الرئیس نے کتاب "قانون" مرتب کی تھی، وہ اس کے بارے میں لکھا ہے۔

فاما کتابہ المعروف بالحاوی	اس کتاب جو الحاوی کے نام سے معروف
فوجدتہ قد ذکر فیہ جمیع	ہے، اس میں اس نے وہ تمام باتیں بیان
ما یحتاج الیہ المتطببون	کر دی ہیں جن کی اطبا کو حفظان صحت
من حفظ الصحۃ والمداواۃ	اور علاج امراض میں ضرورت ہوتی ہے
بالادویۃ والعلل التی تکون	نیز اس نے دوا و غذا کا بھی ذکر کر دیا ہے جو

[1] اخبار الحکماء ص ۹ ۱

بالتجربة بالادوية والا — اس سلسلہ میں کام آتی ہیں، امراض کی
غذية بعلاماتها ولم — علامات بھی بیان کر دی ہیں الغرض
يغفل عن شئ مما يحتاج — کوئی ایسی بات نظر انداز نہیں کی جسکی
اليه الطالب لهذه الصناعة — اس فن کے طالبوں کو ضرورت ہوتی ہے
من تدبير الامراض والعلل"

مشرق تو مشرق ہے مغرب میں بھی اسکی مقبولیت اور جلالت قدر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ چودہویں صدی مسیحی میں پیرس (Tario) کی میڈیکل فیکلٹی کی لائبریری جن نو کتابوں پر مشتمل تھی، ان میں سے ایک الحاوی (Liber continens) تھی چنانچہ کیمپل (Campbell) لکھتا ہے۔

Razes' Al-Havi (کتاب الحاوی) Liber cont-inens") The largest and most important of His productions, was an encyclopaedia of medicine and Surgery containing As Summary of All The branches of Art And Science of medicine in Twenty Five books. This work Exceeds in bulk The Canon of Avicenna And was one of The nine volumes which composed The

Whole Library of The medical Faculty of Baris in 1395.

رازی کی کتاب الحاوی اس کی تصانیف میں سب سے بڑی اور سب سے اہم ہے، وہ فن طب و جراحت کی انسائیکلوپیڈیا ہے، اس کی ۲۵ جلدوں میں طب کی تمام شاخوں کا خلاصہ آگیا ہے، یہ کام اپنی مقدار میں ابن سینا کے کام سے بھی بھاری ہے الحاوی ان نو طبی کتابوں میں سے تھی جن پر ۱۳۹۵ء میں پیرس کی فیکلٹی آف میڈیسن مشتمل تھی

مگر اس قبول عام کے باوجود یہ کتاب ہمیشہ کمیاب رہی ہے، اس کی غیر معمولی ضخامت کی بنا پر شائقین نقل کرنے سے عاجز تھے، آج بھی مشرق و مغرب کی کسی لائبریری میں اس کا کامل نسخہ موجود نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے دائرۃ المعارف حیدرآباد اور اس کے جنت آشیاں ڈائرکٹر ڈاکٹر نظام الدین مرحوم کو جن کی انتھک کوششوں سے یہ کتاب کسی نہ کسی طرح شائع ہو کر منصۂ شہود پر آگئی۔

دائرۃ المعارف کے اس احسان سے طبی دنیا عہدہ برآ نہیں ہو سکتی کہ اس کی سعی سے یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو کر شائقین طب کے ہاتھوں میں پہونچ گئی ظاہر ہے کہ اتنی ضخیم کتاب جو پچیس جلدوں پر مشتمل ہے، اور ہر جلد میں دو ڈھائی سو صفحات ہیں، اس کا شائع ہو جانا معجزہ سے کم نہیں، تنقیدی متن کی ترتیب و تحریر تو بعد کا کام ہے۔ وہ بھی اتنا ہی اہم جتنا کہ نفس طباعت۔

ادھر گورنمنٹ آف انڈیا نے جب قدیم طب کے احیاء پر توجہ کی تو آیوروید ک وغیرہ کے ساتھ یونانی طب کی ترقی کا بھی انتظام کیا گیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی تگ و دو سے جس میں اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم کے علاوہ

شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب فلسفی خاص طور سے قابل ذکر ہیں اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ میں ایک سنٹرل ریسرچ یونٹ قائم کرنے کی تجویز منظور کی اور طبی دنیا حکیم عبدالرزاق صاحب کی بھی ممنون ہے کہ ان کی مساعی جمیلہ سے اس یونٹ نے عملی شکل اختیار کی۔

اس یونٹ میں جب تحقیقی کام کی انجام دہی کا منصوبہ بنا تو اس میں اولیت کا شرف کتاب الحاوی کے ترجمہ کو دیا گیا۔

شفاء الملک مرحوم کی شفقت اور ڈاکٹر عبدالعلیم کی علم دوستی نے یہ کام راقم سطور کے سپرد کیا۔

میں نے اکتوبر ۱۹۶۹ء سے کام شروع کیا۔ اس وقت میں یونٹ کے اندر تنہا ریسرچ ورکر تھا مجھے جو دقتیں اس فرض کے انجام دینے میں پیش آئیں ان کا اندازہ وہی اصحاب کر سکتے ہیں جنھیں ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی علمی و فنی کتاب کے ترجمہ کا اتفاق ہوا ہو۔ میں نے صرف یہی کوشش نہیں کی کہ میرے محسنوں نے جو توقعات مجھ سے وابستہ کی تھیں ان میں انھیں مایوسی نہ ہو بلکہ اس بات کو بھی ہمیشہ ملحوظ رکھا کہ ایک طبی کتاب کے صحیح ترجمہ پر مریضوں کی صحت کا مدار ہے، بسا اوقات ایک لفظ کی غلطی زندگی اور موت کے لیے فیصلہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ایک سال میں جلد اول کا ترجمہ مکمل ہو گیا، اسی اثناء میں یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد نے سینئر ریسرچ آفیسر کی جگہ پر جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے (علیگ) کا تقرر کیا اور میرے ترجمہ پر نظر ثانی کا فریضہ بھی انھیں تفویض کیا موصوف نے لفظاً لفظاً عربی عبارت کی خواندگی کے ساتھ احقر کی معیت میں نظر ثانی فرمائی

بعض اوقات ایک ایک سطر پر گھنٹوں ہم دونوں نے طبی امداد کے مباحث طبی کتابوں کی جانب مراجعت اور لغات عرب سے استمداد کیا۔ بعض مقامات پر اختلاف رائے بھی ہوتا۔ بحث و تحقیق کے بعد جب کامل اتفاق ہو جاتا اور صحیح مفہوم متعین ہو جاتا تو ہم ترجمہ کو باقی رکھتے۔ ورنہ بسا اوقات پورے ترجمہ کو حذف کر کے دوسرا ترجمہ کرتے

اس کام کی اہمیت کا صحیح اندازہ کچھ وہی صاحبان علم کر سکتے ہیں جو عربی زبان و ادب اور طبی علوم و فنون کے ماہر بھی ہوں اور ان کو ترجمہ و تالیف کی پُر خطر سنگلاخ وادیوں سے گذرنے کے مواقع بھی حاصل ہوئے ہوں۔ مختصر یہ کہ

خطرہ قدم قدم پہ ہے کانٹے بچھے ہیں راہ میں

مثال کے طور پر ایک مقام پر خرء کلب مصین مرقوم ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد پنجم ص ۱۵ س ۱۱) خرء، بجائے معجمہ کے معنی گوبر۔ بیٹ۔ پاخانہ کے ہیں لیکن اس مقام کی عبارت اس معنی کی ہرگز متحمل نہیں ہے، کیونکہ مریض کو اپنے شکم سے چھوٹے بچہ کو چمٹانے کا مشورہ دیا جا رہا ہے، مگر اس حال میں کہ اس بچہ کے جسم پر پسینہ یا کسی قسم کی تری بالکل نہ ہو، اگر بچہ دستیاب نہ ہو سکے تو دوسری شکل یہ تجویز کی گئی ہے کہ "خرء کلب" کو اپنے شکم سے چمٹایا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر خرء کے یہ معنی بغیر حذاقت طبی کے اختیار کر لئے جائیں۔ تو اولاً اس کے تصور سے طبیعت کو سخت تکدر و اسکراہ ہوتا ہے اور کوئی شخص جو احساسات انسانی کا کسی درجہ میں بھی شعور رکھتا ہوگا۔ وہ اس علاج پلید کے لیے خود کو ہرگز آمادہ نہیں کر سکے گا۔ ثانیاً بچہ کو شکم سے چمٹانے کی ہدایت کے لوازمات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ پسینہ اور تری سے خالی و پاک ہو۔ اور خرء کلب یقیناً تر ہوگا۔ لیکن اگر اسکو خشک کر کے استعمال کیا جائے جس کا کوئی اشارہ اس مشورہ میں موجود نہیں ہے۔ تو وہ فوائد

حاصل نہیں ہو سکیں گے ان وجوہ سے اس لفظ (خرذ) کے ترجمہ کو میں نے خالی رکھ چھوڑا۔ طوری صاحب اور میں اس کی تحقیق اور تعیین معنی کے لیے کئی دن تک گھنٹوں الجھن میں مبتلا رہے۔ آخر معلوم ہوا کہ یہ لفظ خرذ کے بجائے لفظ جرذ بالجیم المعجمہ کی جانب منتقل ہوا، جرذ بالجیم المعجمہ کے معنی کتے کا پلا یا چھوٹا بچہ ہے، لغت کی کتابوں کے استقصاء نے (اب معنی کو پورے طور پر منشرح کر دیا، یعنی کتے کے پلے کو جو فربہ ہو مریض اپنے شکم سے چمٹائے۔ الحاوی کے کاتب نے نادانی سے اوپر کا نقطہ نیچے لکھ دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کتابت کے وقت جو قلمی نسخہ پیش نظر ہو اسی میں یہ غلطی ہو۔

دوسری جلد کا ترجمہ ہمارے یونٹ کے ایک اور رفیق کار نے شروع کیا، تھا جو اب اللہ رب العزت کو پیارے ہو چکے ہیں، وہ زہد و تقوی کے علاوہ علم و فضل بالخصوص فن طب کے اندر دستگاہ عالی رکھتے تھے، وہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ توضیحی تعلیقات بھی سپرد قلم کرتے جاتے تھے' ان کے ذاتی علم اور تجربہ کا نتیجہ تھیں، اور چونکہ اور بھی کام ان کی ذات سے متعلق تھے۔ اس لیے وہ تقریباً ایک ثلث کتاب کا ترجمہ کر سکے۔ تیسری جلد ایک اور صاحب کے سپرد ہوئی ہے، خدا جانے انھیں اس جلد کے ترجمہ میں کتنی کامیابی ہوئی انھوں نے ابھی تک یہ ترجمہ یونٹ کو دکھایا نہیں ہے۔

چوتھی جلد کے ترجمہ کا کام پھر اس عاجز کو تفویض ہوا جو امراض الریہ کے معالجات پر مشتمل ہے، حسب سابق میں نے اسے بھی ان دقتوں کے باوجود جو اس قسم کے کارہائے خطر کی انجام دہی میں مضمر ہیں پایۂ تکمیل تک پہونچایا، اور حسب سابق سطراً سطراً اسکی عربی عبارت کی خواندگی جناب شبیر احمد خان صاحب غوری سینیر ریسرچ آفیسر آف یونٹ کی معیت میں پوری توجہ سے کی گئی، اور ترجمہ پر کافی غور و خوض کیا گیا۔ بحمدہ تعالےٰ

اس چوتھی جلد کا ترجمہ بھی مسودہ کے بعد مبیضہ کی شکل اختیار کر چکا ہے اور یونٹ کے اندر محفوظ ہے۔ اور اب پروردگار عالم کی توفیق سے پانچویں جلد کا ترجمہ کر رہا ہوں جو امراض المیری والمعدہ پر مشتمل ہے، اس کے بعد کتاب کی تین جلدیں اور باقی ہیں دیکھئے کس طرح اور کتنے عرصہ میں ان کا ترجمہ مکمل ہوتا ہے، پھر اتنی بڑی کتاب کی طباعت کا معاملہ بھی بڑا کثیر المصارف ہے، خدا کرے حکومت ہند اس جانب متوجہ رہے، اور ہمارے طبیہ کالج کے ارباب بست و کشاد تجربہ کار اور لائق افراد سے ترجمہ کرا کر اس کو زیور طبع سے آراستہ کرتے رہیں اس طرح اردو میں ایک طبی انسائیکلوپیڈیا تیار ہو جائے گی، اور ہمارے کالج کی خدمت اور حکومت ہند کی سرپرستی تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف سے لکھی جائے گی۔

(دار المصنفین کی نئی کتابیں)

خریطۂ جواہر

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم ناظم دار المصنفین کی یہ آخری تصنیف ہے، اس میں مرزا مظہر جان جاناں کی بیاض خریطۂ جواہر کے منتخب اشعار کی تشریح و ترجمہ کے ساتھ خود مصنف مرحوم کے اپنے خیالات بھی درج ہیں، ضخامت ۱۳۲ صفحے قیمت - ۵ - ۴

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

اس میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی تفصیلات درج ہیں، مرتبہ۔ سید صباح الدین عبد الرحمن

ضخامت - ۱۶۰ صفحے - قیمت - ۵ -

جاوید نامہ کے کردار

از

جناب جگن ناتھ آزاد صاحب کشمیر

"جاوید نامہ اقبال کا شاہکار ہے، اس طویل نظم میں جو بقول مصنف ڈیوائن کامیڈی کے طرز پر لکھی گئی ہے، زندہ رود سمیت انتالیس ۳۹ کردار نظم کی تشکیل و تکمیل میں شاعر کا ساتھ دیتے ہیں، ان کرداروں میں مشرق و مغرب کے شاعر و مفکر بھی ہیں، مذہبی اور روحانی ہستیاں بھی اور ایسے کردار بھی ہیں، جو اقبال کے ذہن کی اختراع ہیں، جاوید نامہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے ذیل میں ان تمام کرداروں کا ایک تعارف پیش کیا جا رہا ہے"

(جگن ناتھ آزاد)

رومی:۔ مولانا جلال الدین رومی، نام محمد، لقب جلال الدین، اقبال کے روحانی استاذ اور رہنما، ۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء کو بلخ میں پیدا ہوئے، ۱۷ ستمبر ۱۲۷۳ء کو قونیہ میں انتقال کیا، تصانیف: مثنوی، خطوط کا مجموعہ اور دیوان شمس تبریز،

زروان:۔ روح زمان و مکان، اقبال نے یہ اصطلاح اوستا سے لی ہے، جس کے معنی ہیں زمان حقیقی، اقبال نے اسے صرف زمان ہی نہیں، بلکہ زمان و مکان کی علامت کے طور پر بھی استعمال کیا ہے، اور گویا ایک طرح سے اس ضمن میں آئن اسٹائن کا تتبع کیا ہے،

عارف ہندی (جہاں دوست)، شیو جی مہاراج جنہیں اقبال نے ہندوستانی فلسفہ اور روحانیت کی تجسیم کے روپ میں دیکھا۔ بعض شارحین کلامِ اقبال نے "جہاں دوست" کا لفظی ترجمہ کرتے ہوئے عارف ہندی کا نام وشوا متر لکھا ہے جو محض سہل انگاری اور عدم احتیاط پر مبنی ہے۔

سروش:- پہلوی زبان کا لفظ ہے [illegible] فرشتے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ زرتشتیوں کے نزدیک اُس فرشتے سے مراد ہے جو یزداں کی طرف سے انسان کے نام پیغام لاتا ہے۔ اقبال نے اُسے جبریلی شان رکھنے والی [illegible] ایک نازنین کے روپ میں پیش کیا ہے۔

گوتم:- مہاتما بدھ، اصل نام سدھارتھ گوتم، ساکیہ منی بھی کہلاتے ہیں۔ ۵۶۳ء قبل مسیح میں کپل وستو کے مقام پر مہاراج سدھودھن کے گھر میں جنم لیا۔ ۴۸۳ء قبل مسیح میں گیا کے مقام پر اس دنیا کو خیر باد کہا۔

زنِ رقاصہ:- کسی مندر کی دیوداسی تھی اور مہاتما بدھ کے مخالفوں نے اُسے مہاتما بدھ کی آزمائش کے لیے بھیجا تھا لیکن ہوا یہ کہ مہاتما بدھ کی تعلیم اس کے دل میں گھر کر گئی، اور وہ گناہوں سے تائب ہو گئی۔ نظم میں لذاتِ دنیوی کی علامت کے طور پر آئی ہے۔

اہرمن:- زرتشتیوں کے مذہب کی رو سے روحِ بد کا نام، گویا ابلیس کا مترادف۔ اُس کے مقابل میں مذہبِ زرتشت کی رُو سے ایک روحِ خیر موجود ہے، اسے اہورا مزدا کہتے ہیں۔

زرتشت:- قدیم ایران کے ایک مذہب کا داعی۔ اس کا زمانہ ۶۰۰ قبل مسیح تصور کیا جاتا ہے۔ مذہبِ زرتشت کو ساتویں صدی قبل مسیح سے ساتویں صدی عیسوی تک سارے ایران میں فروغ حاصل رہا۔ زرتشت نے ثنویت کی تعلیم دی ہے۔

طالسطائی:- کاؤنٹ لیو نکولائے وچ طالسطائی، مشہور روسی مصنف، مصلح، فلسفی اور صوفی۔ تاریخِ ولادت ۲۸ اگست ۱۸۲۸ء، تاریخِ وفات ۲۰ نومبر ۱۹۱۰ء۔

تصانیف : جنگ اور امن، انا کرینینا، فن کیا ہے، سوانح حیات وغیرہ،

افرنگیین : یورپی تہذیب کی علامت جس نے بقول اقبال حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کو یکسر فراموش کر دیا ہے اور اہل مادہ (الفاظ ہیں) مادہ پرستی اور لذات جسمانی کی علامت،

غرق در سیماب مروے تا کمر : یہودی نوجوان اسقروطی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حواری تھا، اسی کی غدارانہ نشان دہی پر انھیں گرفتار کر کے عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق مصلوب کیا گیا،

ابوجہل : نام عمرو بن ہشام بن مغیرہ، کنیت ابوالحکم، رسول اکرمؐ کے زمانے میں اسلام کا سب سے بڑا دشمن، اس کی جہالت کے باعث اسے ابوجہل کا لقب دیا گیا، اسے تعلیم اسلام پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس تعلیم نے بندہ و آقا کی تمیز کو ختم کر کے حسب و نسب کی فضیلت اور خاندانی آبرو کو مٹی میں ملا دیا ہے،

جمال الدین افغانی :- مولانا سید جمال الدین افغانی، تاریخ ولادت اور مقام ولادت دونوں کے بارے میں اختلاف ہے، تاریخ ولادت قاضی عبدالغفار کے نزدیک ۱۸۳۹ء اور غلام رسول مہر کی تحریر کے مطابق ۱۸۳۸ء ہے، اسی طرح مقام ولادت کے بارے میں بھی ایک رائے نہیں ہے بعض انھیں ایرانی نژاد اور بعض افغانستان کا باشندہ کہتے ہیں، انھیں افغانستان کا باشندہ سمجھنے والوں میں بھی بعض لوگوں کے نزدیک وہ اسد آباد میں پیدا ہوئے تھے، اور بعض کے خیال میں اسعد آباد میں ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو استنبول میں وفات پائی، وہیں دفن ہوئے ۱۹۴۴ء میں اُن کی میت کو افغانستان لا کر کابل میں دفن کیا گیا، سید جمال الدین افغانی تمام عمر ملوکیت کے خلاف سرگرم عمل رہے،

سعید حلیم پاشا :- ترکی کے مشہور سیاست داں اور ابراہیم حلیم پاشا کے فرزند تاریخ ولادت ۱۸۶۵ء مقام پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے، بقول سید عابد علی و اکبر حسین قریشی

قاہرہ میں پیدا ہوئے، اور بقول یوسف سلیم چشتی قسطنطنیہ میں، ترکی اور جنیوا میں تعلیم پائی، ۱۹۱۳ء میں ترکی کے وزیر اعظم مقرر ہوئے، ۱۹۱۹ء میں اُن پر مقدمہ چلا، اور مالٹا میں نظر بند کئے گئے، ۱۹۲۱ء میں وہ رہا ہوئے، اور اُسی سال روم میں قتل ہوئے،

زندہ رود:- اقبال۔ مختلف افلاک کی سیر میں شاعر کا نام "جاوید نامہ" میں یہ نام انہیں رومی نے دیا، (تاریخ ولادت ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء۔ تاریخ وفات ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء)

مردوخ:- ایک قدیم بت جس کی پرستش اہل بابل کرتے تھے،

بعل:- ایک قدیم سامی بت، جو فنیقیوں کا معبود تھا، فنیقی ۔۔۔ ۳۰۰۰ قبل مسیح لبنان میں آباد تھے، بعل کے لغوی معنی ہیں قوت، طاقت، مجازی طور پر آقا اور شوہر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا رہا، عبرانی زبان کا لفظ ہے،

فرعون:- قدیم شاہان مصر (اس کی جمع فراعنہ ہے) یہاں اُس فرعون کی طرف اشارہ ہے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ تھا،

کشنر (ذو الخرطوم) لارڈ کچنر مشہور برطانوی جنگی جرنیل تاریخ پیدائش ۱۸۵۰ء ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک ہندوستان کا کمانڈر انچیف رہا، ۱۹۱۶ء میں اُسے اُس کے جہاز سمیت جرمنوں نے سمندر میں غرق کر دیا،

کچنر نے ۱۸۹۸ء میں مہدی سوڈانی کے پیروؤں کو شکست دی، اور جوش انتقام میں مہدی سوڈانی کی قبر تک کھدوا ڈالی، انگریزوں نے اسے اس خدمت کے صلہ میں تیس ہزار پونڈ نقد انعام کے علاوہ (Lord of Khartoum) کا خطاب عطا کیا، اقبال نے لارڈ آف خرطوم کا ترجمہ ذو الخرطوم کر کے اُسے معانی کی ایک کائنات عطا کر دی ہے، انگریزی خطاب کا یہ ترجمہ تو ہے ہی، لیکن چونکہ ہاتھی اسلامیات میں دشمن کعبہ کی علامت کے طور پر

آیا ہے، اس لئے اقبال نے لارڈ کچنر کو "دو انحر طوم یعنی سوختہ والا" کہہ کے اُس جذبۂ حقارت کا اظہار بھی کر دیا ہے، جو عالم اسلام میں لارڈ کچنر کے خلاف موجود تھا۔

درویش سوڈانی: مہدی سوڈانی۔ اصل نام محمد احمد بن عبداللہ۔ تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے لیکن ۱۸۴۳ء زیادہ قرین قیاس ہے۔ بائیس ۲۲ برس کی عمر میں مہدیٔ موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ لوگ اُس کی تحریک میں شامل ہوتے گئے اور اُس نے اپنی سلطنت کی حدود مصر تک بڑھالیں۔ خدیو مصر نے اس کی طاقت کا قلع قمع کرنے کے لئے جنرل گارڈن کی سرکردگی میں فوج بھیجی۔ اس کے پیرووں نے جنرل گارڈن کو قتل کر دیا۔

مہدی سوڈانی نے ۱۸۸۵ء میں وفات پائی لیکن اس سے قبل اس کے پیرو خرطوم پر قابض ہو چکے تھے، جہاں اُن کی حکومت تیرہ برس تک قائم رہی۔ ۱۸۹۸ء میں لارڈ کچنر نے پوری تیاری سے خرطوم پر حملہ کیا، مہدی کے متبعین کو شکست ہوئی، کچنر خرطوم پر قابض ہوا، اور پہلا کام اس نے یہ کیا کہ مہدی سوڈانی کی قبر کھدوا کر اس کی ہڈیاں سربازار نذر آتش کیں۔

انجم شناس مریخی: مریخ کا ایک ستارہ شناس، اقبال کی فکری تحقیق و تجسس کی علامت۔

دوشیزۂ مریخ: مریخ کی ایک دوشیزہ جس نے نبوت کا دعویٰ کیا، اقبال کی ایک فکری کاوش، بقول انجم شناس مریخی یہ دوشیزہ مریخ کی رہنے والی نہیں، بلکہ فرزمرزا اسے یورپ سے اغوا کر کے لایا ہے۔

حلاج: حسین ابن منصور حلاج، اصل نام حسین لیکن اُردو اور فارسی ادب میں منصور اور حلاج کے ناموں سے مشہور ہیں، ۸۵۸ء میں ایران کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ صوفی تھے وحدۃ الوجود کے قائل تھے انا الحق کا دعویٰ کیا، اور اس کے صلے میں شہادت پائی۔

غالب: مرزا اسداللہ خاں غالب، پیدائش ۱۷۹۷ء بمقام آگرہ ہندوستان کے

[illegible] شاعر [illegible]
انتقال کیا، مزار بھی نظام الدین [illegible] میں ہے۔

قرۃ العین طاہرہ:- اصل نام زرین تاج تھا، حالانکہ ام سلمیٰ ... وطن قزوین، حسن و جمال میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی شادی کے بعد علی محمد باب کی تعلیمات پر ایمان لے آئی اور ان تعلیمات کی نشر و اشاعت میں سرگرمی سے مصروف ہو گئی، قرۃ العین کا خطاب اسے باب ہی نے دیا، گھر والے طاہرہ کہہ کر پکارتے تھے، چونکہ شوہر نے باب کی تعلیم قبول نہ کی اس لئے اس سے علیحدہ ہو گئی۔

۱۸۵۲ء میں ناصرالدین قاچار شاہ ایران پر قاتلانہ حملہ ہوا، تو جو لوگ اس سازش میں ماخوذ ہوئے، ان میں قرۃ العین بھی تھی، دوسرے مشتبہ بابیوں کے ساتھ اس کے قتل کا حکم بھی صادر ہوا، اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

جب قرۃ العین ایک مجرم کے طور پر شاہ ناصرالدین کے سامنے پیش ہوئی، تو اس نے کہا کہ اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اسے رہا کر دیجئے، لیکن مفتیوں نے یہ شرط عائد کی کہ اگر وہ بابی مذہب ترک کر دے تو اس کی جان بخشی ہو سکتی ہے، طاہرہ نے یہ شرط قبول نہیں کی اور موت کا جام پینا گوارا کر لیا۔

ابلیس:- شیطان - ازروئے اسلام قوت شر کا مظہر، لغوی معنی ہیں، رحمت الٰہی سے ناامید، اقبال کے یہاں جبریل و ابلیس کی علامت کے طور پر بھی آیا ہے۔

جعفر:- نام میر جعفر علی خان، اس نے اپنے محسن و مربی نواب سراج الدولہ سے غداری کر کے اس کے راز انگریزوں کو بتائے، اور غداری کے صلہ میں دوبارہ انگریزوں نے اسے گدی پر بٹھایا، پہلی بار ۱۷۵۷ء میں اور دوسری بار ۱۷۶۳ء میں ۱۷۶۵ء میں

وفات ہوئی،

صادق :- میر صادق بیدار کاٹ (جنوبی ہند) میں پیدا ہوا، ترقی کر کے حیدر علی خاں کا معتمد خاص بنا، سلطان فتح علی خاں ٹیپو کے دور میں بھی اونچے منصب پر فائز ہوا، اور ترقی کرتے کرتے وزیر کے عہدے تک پہنچا، سلطان کا مقرب بنتے ہی در پردہ اس کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گیا، اور اس کے راز انگریزوں تک پہنچانا شروع کر دیئے، نتیجہ جو نکلا وہ ظاہر ہے، اس کی غداری ہی ٹیپو سلطان کی شہادت اور سلطنتِ میسور کی تباہی کا باعث ہوئی،

روحِ ہند :- ہندوستان کی لافانی تہذیب ایک علامت کی صورت میں، اقبال کے شاعرانہ تخیل کا ایک نہایت حسین مظہر،

نیٹشے :- جرمنی کا ایک نامور مفکر، فریڈرک ولیم نیٹشے۔ تاریخ ولادت ۱۵ راکتوبر ۱۸۴۴ء تاریخ انتقال ۲۵ راگست ۱۹۰۰ء

سید علی ہمدانی :- ولادت ۱۳۱۴ء میں ایران کے شہر ہمدان میں ہوئی، سلطان شہاب الدین کے عہد حکومت میں کشمیر آئے، کشمیر کو وہ باغ سلیمان کہتے تھے، ۱۳۲۶ء میں سلطان قطب الدین کے زمانہ میں واپس ایران جا رہے تھے، کہ راستے میں انتقال ہوا، مزار ختلان میں ہے،

سری نگر میں خانقاہ معلّٰی اُن کی ایک عظیم الشان یادگار ہے،

ان کا شمار فارسی کے نامور صوفی شعراء میں ہوتا ہے، اُن کی چالیس غزلوں کا مجموعہ "چہل اسرار" کے نام سے مقبول خاص و عام ہے،

طاہر غنی :- ملا طاہر غنی کاشمیری، سرزمین کشمیر کے مایۂ ناز فارسی شاعر، محمد سعادت کشمیری نے تاریخ ولادت ۱۰۳۰ھ لکھی ہے، مگر محمد امین داراب نے تاریخ ولادت ۱۰۲۰ھ بتائی ہے،

سری نگر میں دفن ہوئے، قبر کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا ہے، کہ کہاں ہے۔

بھرتری ہری:- چین کا نامور بھرتری ہری، عالم اور شاعر، بھرتری ہری شتک اُن کی مشہور کتاب ہے، بھرتری ہری کے زمانہ کے تعین میں اختلاف ہے، مختلف محققین نے ۵۰۰ قبل مسیح سے لے کر پہلی، دوسری اور تیسری صدی تک کی نشان دہی کی ہے۔

نادر:- ایران کا بادشاہ نادر شاہ۔ اصل نام نادر قلی بیگ خراسان کے قریب ایک کاشتکار کے گھر میں پیدا ہوا، تاریخ ولادت ۲۲ نومبر ۱۶۸۸ء ہے، ۸ مارچ ۱۷۳۶ء کو ایران کا بادشاہ بنا اور نادر شاہ کا لقب اختیار کیا،

۱۷۳۹ء میں سندھ اور لاہور پر قبضہ کرتا ہوا دہلی پہنچا، اور قتل عام کا حکم دیا، یہ قتل عام سات گھنٹے تک جاری رہا اور اس میں تیس ہزار انسان تیغ و تفنگ کا نشانہ بنے، ۲۰ اپریل ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ اپنے دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوا،

ابدالی:- اصل نام احمد خاں درانی تھا، مگر احمد شاہ ابدالی کے نام سے مشہور ہوا ۱۷۲۵ء میں بہ مقام ملتان پیدا ہوا، نادر شاہ کا سپہ سالار تھا، نادر شاہ کے قتل ہو جانے کے بعد افغانستان میں اپنی حکومت قائم کی، ہندوستان کی تاریخ میں پانی پت کی تیسری جنگ کی وجہ سے زیادہ شہرت ہوئی، ۱۷۷۲ء میں انتقال ہوا،

سلطان شہید:- اصل نام سلطان فتح علی خاں تھا، مگر ٹیپو سلطان کے نام سے شہرت پائی، سلطان حیدر علی خاں والی میسور کے گھر ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوا، بہادری میں اپنی مثال آپ تھا، سولہ سال کی عمر میں پہلی بار ایک مہم کا سپہ سالار بنا،

تمام عمر برطانوی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار رہا، اور انگریزوں کے قدم سرزمین میسور پر نہ جمنے دیے، انجام کار میر صادق کی غداری کے باعث سرنگاپٹم کے معرکے میں شہید ہوا، اور میسور

انگریزوں کے ہاتھ میں آگیا،

ناصر خسرو: اصل نام ابو معین ناصر بن خسرو ہے، ۱۰۰۳ء میں بلخ کے قریب پیدا ہوا، ۱۰۷۴ء میں وفات پائی، اپنے وقت کا بہت بڑا عالم تھا، شاعری کے علاوہ نثر میں بھی کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، یہ کتابیں فلسفیانہ اور صوفیانہ مباحث سے لبریز اور اسماعیلی مذہب سے متعلق ہیں، ایک تصنیف "سفرنامہ" کا ترجمہ انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے،

حورانِ بہشتی:۔ بہشت کی حوریں جن سے بہشت میں جانے کے بعد اقبال ([illegible]) کی ملاقات ہوئی،

جمال:۔ لفظی معنی حسن یا خوبصورتی، یہاں ذاتِ مطلق مراد ہے،

اقبالِ کامل

اس میں ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانحِ حیات کے علاوہ اُن کے شاعرانہ کارناموں کے اہم [illegible] یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریۂ [illegible] تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف (عورت)، فنونِ لطیفہ اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی [illegible]

مرتبہ:۔ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

طبع چہارم قیمت: ۵۰ ۔ ۱۲ روپیہ

منیجر

سرہند میں دفن ہوئے، قبر کے بارہ میں معلوم نہیں ہو سکا ہے، کہ کہاں ہے،

بھرتری ہری :۔ چین کا مہاراج بھرتری ہری، عالم اور شاعر، بھرتری ہری سوقی شتک اُن کی مشہور کتاب ہے، بھرتری ہری کے زمانہ کے تعین میں اختلاف ہے، مختلف محققین نے ۵۶ قبل مسیح سے لے کر پہلی، دوسری اور تیسری صدی تک کی نشان دہی کی ہے،

نادر :۔ ایران کا بادشاہ نادر شاہ۔ اصل نام نادر قلی بیگ خراسان کے قریب ایک کاشتکار کے گھر میں پیدا ہوا، تاریخ ولادت ۲۲ نومبر ۱۶۸۸ء ہے ۸ مارچ ۱۷۳۶ء کو ایران کا بادشاہ بنا اور نادر شاہ کا لقب اختیار کیا،

۱۷۳۹ء میں سندھ اور لاہور پر قبضہ کرتا ہوا دہلی پہنچا، اور قتل عام کا حکم دیا، یہ قتل عام سات گھنٹے تک جاری رہا اور اس میں تیس ہزار انسان تیغ و تفنگ کا نشانہ بنے، ۲۰ اپریل ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ اپنے دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوا،

ابدالی :۔ اصل نام احمد خاں درانی تھا، مگر احمد شاہ ابدالی کے نام سے مشہور ہوا ۱۷۲۵ء میں بمقام ملتان پیدا ہوا، نادر شاہ کا سپہ سالار تھا، نادر شاہ کے قتل ہو جانے کے باوجود افغانستان میں اپنی حکومت قائم کی، ہندوستان کی تاریخ میں پانی پت کی تیسری جنگ کی وجہ سے زیادہ شہرت ہوئی، ۱۷۷۳ء میں انتقال ہوا،

سلطان شہید :۔ اصل نام سلطان فتح علی خاں تھا، مگر ٹیپو سلطان کے نام سے شہرت پائی، سلطان حیدر علی خاں والی میسور کے گھر ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوا، بہادری میں اپنی مثال آپ تھا، ۱۶ سولہ سال کی عمر میں پہلی بار ایک مہم کا سپہ سالار بنا،

تمام عمر برطانوی حکومت کے خلاف برسرپیکار رہا، اور انگریزوں کے قدم سرزمین میسور پر نہ جمنے دیئے، انجام کار میر صادق کی غداری کے باعث سرنگاپٹم کے معرکے میں شہید ہوا، اور میسور

انگریزوں کے ہاتھ میں آگیا،

ناصر خسرو: اصل نام ابو معین ناصر بن خسرو ہے، ۱۰۰۳ء میں بلخ کے قریب پیدا ہوا، ۱۰۸۸ء میں وفات پائی، اپنے وقت کا بہت بڑا عالم تھا، شاعری کے علاوہ نثر میں بھی کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، یہ کتابیں فلسفیانہ اور صوفیانہ مباحث سے لبریز اور اسماعیلی مذہب سے متعلق ہیں، ایک تصنیف "سفرنامہ" کا ترجمہ انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے،

حوران بہشتی: بہشت کی حوریں جن سے بہشت میں جانے کے بعد اقبال [illegible] کی ملاقات ہوئی،

جمال: لفظی معنی حسن یا خوبصورتی، یہاں ذات مطلق مراد ہے،

فخر الملک فضل اللہ عمید تولکی

از

جناب ڈاکٹر نور السعید اختر صاحب استاذ شعبہ فارسی مہاراشٹر کالج بمبئی

ملوکیہ سلاطین کے شمس الملوک سلطان التتمش کے انتقال ۶۳۳ھ کے بعد دس سال تک ہندوستان کے تخت و تاج کے لیے اس کے جانشینوں میں خانہ جنگی ہوتی رہی۔ اس مختصر سے عرصہ میں کم و بیش پانچ حکمرانوں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی لہٰذا اس سیاسی بحران کے باعث، فارسی ادب اور شاعری کی جانب خاطر خواہ توجہ نہ ہو سکی۔ سلطان رکن الدین فیروز (۶۳۳ھ تا ۶۳۴ھ) نہایت ادب نواز معارف دوست اور شعراء و ادباء کا قدرداں تھا۔ لیکن اس کی حکومت بمشکل سات ماہ تک قائم رہ سکی اس نوجوان علم پرور بادشاہ کی موت ادبی و ثقافتی اعتبار سے ایک سانحہ عظیم ثابت ہوئی، کیونکہ جوان سال شہزادے نے قلیل عرصے میں نصرف خسرو شاعری کے مذاق کو بلند کیا، بلکہ ان کا حقیقی دمنوی مربی بن کر صحیح خدمت انجام دی، اس فرخ نژاد بادشاہ کی موت کے ٹھیک دس سال بعد از سر نو ایک خوش آیندہ دور کا آغاز ہوا۔ اور قلندر صفت سلطان ناصر الدین محمود نے ملوکیہ حکومت کی باگ ڈور ۶۴۴ھ مطابق ۱۲۴۶ء میں سنبھالی۔ سلطان ناصر الدین کا بائیس سالہ

حکومت (۶۴۴ھ مطابق ۱۲۶۶ء) گوناگوں وجوہ کی بنا پر کافی اہم ہے، طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج الدین سراج (۶۵۸ھ) نے سلطان ناصر الدین محمود کو شمس الدین التمش کا چھوٹا لڑکا بتایا ہے، التمش کو چونکہ یہ لڑکا بہت عزیز تھا۔ لہذا اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں سلطان نے خاص توجہ کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناصر الدین پر بھی التمش کا مذہبی رنگ غالب آیا۔ اور زہد و تقویٰ، اور عبادت و ریاضت اس کی زندگی کا اہم جزء بن گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے علم و ادب کے ویرانے میں بہار آگئی۔ اسی بنا پر ابوالقاسم فرشتہ نے مختصر لکھ کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا،

صلحا و علما را دوست داشتے۔" (ص ۱۱)

سلطان ناصر الدین نے ۲۲ سال تک فقیرانہ رنگ میں حکومت کے فرائض انجام دیئے۔ سلطان کے زہد و تقویٰ کی داستانیں مشہور ہیں۔ جہاں تک ناصر الدین کی علمی و ادبی زندگی کا تعلق ہے، ہمارے پاس ایسے تاریخی شواہد بہت کم ہیں، جن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں، ناصر الدین کے صلحا و علما کی فہرست میں کون لوگ شامل تھے؟ اس میں شک نہیں کہ سلطان کو تمام اکابر علما، اور صوفیہ سے شیفتگی اور وابستگی رہی ہوگی، لیکن اس کی پوری تفصیل اس عہد کی کسی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ البتہ طبقات ناصری کے مصنف نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے، کہ سلطان ناصر الدین کو قاضی منہاج الدین عثمان بن سراج الدین الجوزجانی سے کافی دلبستگی تھی۔ وہ رزم و بزم سفر و حضر میں برابر اس کے ساتھ رہتے تھے۔ طبقات ناصری کے علاوہ ہمارے لئے دوسرا مستند ماخذ تاج المآثر بھی ہے۔ لیکن اس کی مقفیٰ و مسجع عبارت نے اس کے انداز بیان کو گنجلک بنا دیا ہے، قاضی منہاج کے علاوہ اس وقت کے مشاہیر علما میں شیخ علاء الدین

شیخ ہمہ قانی، قاضی جلال الدین کاشانی، قاضی شمس الدین بہرائچی، شیخ الاسلام حضرت جلال الدین بسطامی اور مولانا سید قطب الدین وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

دربار کی شعراء میں دو ہی قابلِ قدر ہستیاں تھیں۔ ایک قاضی منہاج الدین سراج تھے، اور دوسرے فخرالملک عمید الدین عمید سنائی۔ مولانا منہاج ایک مورخ اور واعظ کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں۔ اِن کی شاعرانہ عظمت کا ذکر سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے بزم مملوکیہ[1] میں تفصیلی طور پر پیش کیا ہے۔ موصوف نے عہد محمود کے دوسرے آفتابِ عالم تاب اور ستون قصر سخن، عمید سے متعلق کافی تحقیق و جستجو سے کام لیکر حتی امکان معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اور اس کے دستیاب شدہ کلام پر تبصرہ بھی تحریر کیا ہے۔ لیکن وہ معلومات کی کمی کے معترف ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں[2]

"عمید سے متعلق اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سے ناظرین کو اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ اپنے زمانے میں فارسی زبان کا ایک جلیل القدر، فصیح البیان اور قادر الکلام شاعر تھا۔ لیکن وہ اتنا مشہور نہیں ہوا جتنا کہ وہ مستحق تھا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے اس کی زندگی میں خسرو کی شاعری کا نیّرِ اعظم بلند ہو رہا تھا۔ اور جب وہ نصف النہار کو پہنچا تو عمید بھی اور شاعروں کی طرح ماند پڑ گیا۔ اور افسوس ہے کہ اس کا کلام زمانہ کے دستبرد کی نذر ہو گیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی ہی کے وقت میں اس کا کلام عزیز الوجود ہو گیا تھا۔ لیکن ملا صاحب نے از راہِ علم نوازی اسکے بہت سے قصائد اپنی تاریخ میں جمع کر دئے ہیں، اور کلام کے کچھ نمونے عرفات العاشقین، خلاصۃ الاشعار، اور مجمع الفصحاء میں بھی محفوظ ہیں، اور یہاں ابن شلو کی

---

[1] سید صباح الدین بزم مملوکیہ ص ۱۹۲ [2] ایضاً ص ۲۰۴

کل کائنات رہ گئی ہے۔ پھر بھی جو کچھ باقی ہے۔ اس کو ایک باکمال اور مایہ ناز اہل فن ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔[۱]

سید صباح الدین صاحب کے بیان کے مطابق ملا عبدالقادر بدایونی نے سلطان ناصرالدین محمود کے عہد میں امیر فخرالدین عمید کا طویل تعارف پیش کیا ہے بدایونی نے اپنی تاریخ میں وہ قصیدہ بھی نقل کیا جو اس نے سلطان کی تخت نشینی کے موقع پر دیگر شعراء کے مقابلہ میں پیش کیا تھا۔ بدایونی نے اس قصیدے کی تعریف کی ہے کیونکہ عمید نے اس قصیدے میں ناخن ردیف کا استعمال کیا ہے اور مضامین میں تنوع اور بوقلمونی پیدا کی ہے۔ اس قصیدے میں عمید نے اپنے ممدوح کو ان الفاظ میں یاد کیا تھا۔ ع

شہنشہ ناصر دنیا و دین محمود کز قدرش ۔۔۔ بمنقار افگند تیہو ز باز تیز پر ناخن

ردیف ناخن آورد م درین شعر کہ سحر آمد ۔۔۔ بلے در سحر کار آید بسان موئے سر ناخن[۲]

راقم السطور کو چند سال قبل عمید کا کچھ نایاب کلام دستیاب ہوا تھا لیکن اس کی عقدہ کشائی میں چند مرحلے حائل تھے۔ اور پھر ایک دن ہمارے اشٹر کالج کی نگران کتب خانہ مس خدیجہ وکیل نے اتفاقاً کچھ ایسا مواد اور حوالے بہم پہنچا دیے جنھوں نے سید صباح الدین صاحب کے روشن کردہ چراغوں کی لو اور تیز کر دی تحقیق کا میدان وسیع و عریض ہے، ہر نئی تحقیق، اختتام نہیں بلکہ تکملہ ہوتی ہے۔ اور محقق جلے ہوئے چراغوں کی مدد سے مزید تلاش و جستجو کرتا رہتا ہے۔ سید صاحب نے عمید کے حیات و کلام سے متعلق بزم مملوکیہ میں جو شمع روشن کی ہے۔ راقم نے اس کی ضو افشانی میں اضافہ کی کوشش کی ہے۔

۱۔ سید صباح الدین، بزم مملوکیہ ص ۲۲۰۔ ۲۔ منتخب التواریخ بدایونی ص ۹۶-۹۲

(بحوالہ بزم مملوکیہ)

کلام عمید کے مخطوطے کا تعارف یہ کوئی چھ برس قبل کا واقعہ ہو گا کہ راقم اپنے تحقیقی مقالے کے سلسلے میں مواد اکٹھا کر رہا تھا کہ ایک دن دوران گفتگو میں ایک صاحب[1] نے جن کا آبائی وطن اعظم گڑھ ہے۔ ذکر کیا کہ ان کے پاس ایک قدیم مخطوطہ ہے جس میں شہنشاہ محمد بن تغلق کی بابت کافی حوالے موجود ہیں۔ راقم کے اصرار پر صاحب موصوف نے مخطوطہ نہایت احتیاط سے دکھایا۔ اس مخطوطے کے مطالعہ کے بعد راقم نے اس کی اہمیت اور نایابی کا اندازہ لگایا۔ اور ضروری نوٹس حاصل کر لیے۔ اس مخطوطے کے مزید مطالعہ کے بعد یہ راز کھلا کہ اس میں دو اہم شعراء کا کلام موجود ہے۔ یہ کلیات کل ۳۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا سے لیکر ۲۶۰ صفحات تک عہد تغلق کے مشہور قصیدہ گو شاعر بدر الدین بدر چاچی (موجودہ تاشقند) کا کلام موجود ہے، اور اسکے بعد سے اختتام تک فخر الملک خواجہ فضل اللہ عمید کا کلام، جس میں قصائد، نعتیں، غزلیں اور چند رباعیاں بھی موجود ہیں۔ اس مخطوطے کا سائز ۶ × ۴ ہے ہر صفحے پر چودہ اشعار منقول ہیں کاغذ کافی قدیم، دیسی اور کہیں کہیں کرم خوردہ ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ حرف س کو واضح کرنے کے لیے اس کے نیچے تین نقطے دیے گئے ہیں دیوان کے ابتدائی صفحے مطلا و محشی ہیں۔ حاشیہ آرائی اور گل بوٹوں کے لئے سنہری سیاہی استعمال کی گئی ہے۔

مخطوطے کی ابتدا بدر چاچی کے قصیدے کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

زوند قبۂ زرین آئینہ تمثال　　　زمین نقشہ فسرد و پوشدہ آتشین سربال

---

[1] جناب فخر احمد صاحب، مدرس بیگ محمد ہائی اسکول۔ یہ مخطوطہ صاحب موصوف نے مولانا آزاد لائبریری کو ایک ہزار روپے میں فروخت کر دیا۔

تنہا عمید کے ... اور قصیدے کے ایک شعر سے ہوتی ہے۔ ؎

دستان تو از مدح شہ خاطر عمید ؎ زان سان کہ شد حریص و ہمہ دستان از بسی

عمید کا نام، خطاب اور وطن	عمید کے نام، خطاب اور وطن سے متعلق تذکرہ نگاروں اور مورخوں نے مندرجہ ذیل معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

(۱) ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ ۱۰۰۴ھ میں عمید کے نام وخطاب کی بابت دو الگ الگ باتیں لکھی ہیں۔ ایک جگہ وہ اسے ملک الکلام فخر الملک عمید تولکی لکھتے ہیں۔ اور دوسری طرف اسے ملک الملوک والکلام امیر فخر الدین تولکی لکھتے ہیں۔[1]

(۲) تذکرۂ عرفات العاشقین میں تقی اوحدی ۱۰۲۴ھ میں عمید کا نام خواجہ فخر الدولہ عمید الدین الدیلمی درج ہے۔ عرفات میں مزید یہ بھی ہے ؎

"منشائش سنام بود لہذا گفتہ آید تا ابر از وے گرفت سنام نام"[2]

(۳) مجمع الفصحاء میں رضا قلی خان نے عمید (۱۲۸۴ھ) کی نسبت تولکی بتائی ہے۔[3]

(۴) گل رعنا کا مولف لچھمی نرائن شفیق (۱۱۸۱ھ) عمید کو تولکی اور سنامی ظاہر کرتا ہے۔[4]

(۵) لطف علی بیگ آذر تذکرۂ آتشکدہ (۱۱۸۶ھ) میں عمید کا خطاب فخر الدولہ اور نام عمید الدین لکھتا ہے۔ عمید کے وطن کے متعلق آتشکدہ کا مولف رقمطراز ہے: "اصلش از دیار دیلمانست"[5]

---

[1] بحوالہ بزم مملوکیہ از سید صباح الدین ص ۲۰۳۔۲۰۲ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً
[5] ایضاً

اس ضمن میں مجمع الفصحاء کے مولف رضا قلی خان کی تحریر نظر انداز نہیں کی جا سکتی[1]

فخر الملک خواجہ عمید الدین گویند نہ از دیلم اشت و از ہندوستان و منشاش

سنام بودہ، بعضے اعدا چنانچہ ارشارتے شدہ۔ از اہل گیلان ہمن بلاد دیلما لقب

و طبرستان دانند، ہمانا از گیلان بودہ، و بہ ہندوستان رفتہ و دیالمہ اہل آن ولایت

را گویند، وے را عمید تولکی ہم نامند، سبب آن معلوم نشدہ، بہر صورت

مقصود و اشعار وگفتار است نہ مولد و مضجع[2]

مندرجہ بالا مختلف النوع بیانات کی روشنی میں، عمید کے نام، خطاب اور وطن سے متعلق کوئی مصدقہ رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں سید صباح الدین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عمید الدین تو نام اور ملک الکلام فخر الدین، فخر الدولہ، مفخر الفضلا، خطاب تھا لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ایک خطاب ہوگا۔ اور یہ خطاب یا تو دربار سے ملا ہوگا یا مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے یہ القاب شاعر کی شاعرانہ و علمی عظمت کے لحاظ سے اپنی طرف سے لکھ دیئے[3]۔ سید صاحب نے عمید کے وطن کی بابت یوں صراحت کی ہے کہ " ان گنجلک بیانات کی بنا پر یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ شاعر کا آبائی وطن دیلم قصبۂ تولک تھا[3]۔

مندرجہ بالا بیانات کو مورخوں اور تذکرہ نویسوں کی خامہ فرسائیوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ عمید کا کلام آج تک نایاب تھا۔ عمید کے دیوان کی دستیابی سے نہ صرف ہماری معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے بلکہ اس میں ایسے داخلی حوالے

---

1. بزم مملوکیہ ص ۲۰۳ 2. ایضاً 3. ایضاً

اور شواہد پائے گئے ہیں۔ جن کی مدد سے اس کے صحیح خطاب، نام اور وطن کی تصدیق ہوتی ہے۔

نام | راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق عمید کا پورا نام عمید الدین نہیں۔ بلکہ فضل اللہ تھا۔ اس امر کی تصدیق مندرجۂ ذیل اشعار سے ہوتی ہے۔ ؎

عمید اسم تو فضل اللہ نبودی منزل ار گردون   اگر بر فرق تو سایہ ندار د فضل ہستی[1]

عمید نے ایک طویل نعت میں اس حقیقت کی طرف دوبارہ ہماری توجہ مبذول کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

مبادو ورد زبان عمید سوختہ دل   بوقت شغل مگر لا الہ الا اللہ[2]

ردیف ساختم اسمی کہ خواندش بچہ بار[9]   دہد بجلد مفسر لا الہ الا اللہ[3]

خطاب | عمید کے خطاب اور عہدے کی طرف، عہد تغلق کے ملک الشعراء بدرالدین بدر شاشی (موجودہ تاشقند) نے کافی اشارے کئے ہیں۔ تذکرہ نویسوں اور مورخوں نے بھی لکھا ہے کہ خواجہ عمید شرف الممالک کے عہدے پر فائز تھے۔ خود عمید نے اپنے جیسے قصیدے میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ لہذا بدر شاشی کے اشعار ملاحظہ ہوں جو غالباً عمید کا شاگرد رہا ہوگا۔ یا اس درجہ کا ہوگا۔ کیونکہ اس نے عمید کو ایک بزرگ تسلیم کیا ہے۔

دیا بزرگ عمید می کجا پایہ قدر   بھر چہ وہم مدد رہ بزد تو روز بری[4]

ز روشنی رخ او گفتمی مثال پسند   ز زای روشن خواجہ عمید ملک پناہ[5]

فخر ار آمل مصری خواجہ عمید شرف   وزیر راو شہنشاہ ابن شاہنشاہ[6]

---

[1] کلیات بدر چاچ (تاشقندی) د عمید تو مکی۔ [2] کلیات بدر و عمید ص ۲۲۰۔ [3] ایضاً
[4] کلیات بدر [5] ایضاً [6] کلیات بدر عمید

...ا یا بہ رگِ عمیدی کہ ارمغانی خوب   عروس نظم بہ پیرو زدروح تو زند پور[1]

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ عمید ایک بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے۔ ذیل کے قصیدے میں بھی بدر چاچی عمید کی بزرگی، سخن فہمی، علمیت اور اس کی دیگر صفات کا معترف ہے۔ سہ

منتِ تو کردن من بندہ را   سخت بکبار گرانبار کرد
بندہ مدیح تو بمقدار گفت   جود تو احسان نہ بمقدار کرد
قیمت شعر تو از تو بیاموختست   ہر کہ خریداری اشعار کرد
چشم دلم تیرہ و در خواب بود   جود تو اش روشن و بیدار کرد
در شعر نامم ظاہر نبود   بخششِ تو نام من اظہار کرد
مرا رواں در بانی نہ کہ در وہ عطاست   مہر و مدح ہمی بر درم زبان و دہان
روان بہ ہر نگاری کہ اوست فخر زمین   زبان بمدحِ بزرگی کہ اوست فخر زمان
وجیہہ دولت ابو عاصم آنکہ عصمت او   ہمی حصار کند بر حریم جود و سخنان[2]

مندرجہ بالا شواہد کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عمید کی علمی فضیلت کے پیش نظر بادشاہ وقت نے اسے فخر الزماں اور ذہنی مرتبے کے مد نظر اسے فخر الملک جیسے اعلیٰ خطاب سے نوازا ہوگا۔ غالباً اسی وجہ سے منتخب التواریخ کے مصنف عبد القادر بدایونی نے عمید کو ملک الملوک و الکلام امیر فخر الدین کہا ہے۔

وطن | عمید کے وطن کے سلسلے میں تمام مورخین اور تذکرہ نگاروں کو تسامح ہوا ہے۔ حتی کہ ڈاکٹر اقبال حسین پروفیسر محمود شیرانی، اور سید صباح الدین صاحب نے بھی

---

[1] کلیات بدر و عمید [2] کلیات بدر و عمید ص ۱۴۲

کوئی محمود جیلانی نہیں کی، ڈاکٹر اقبال حسین نے عمید کا آبائی وطن تونک[1] بتایا ہے، مرحوم شیرانی صاحب اور سید صباح الدین صاحب[2] غور کے قصبہ تولک کو عمید کا آبائی وطن قرار دیتے ہیں، لیکن راقم الحروف کی تحقیق ان تمام صاحبان سے بالکل مختلف ہے، راقم کا خیال ہے کہ عمید کا آبائی وطن تومک (زابل) ایران ہے، جو کابل و ہرات کے درمیان واقع ہے، ممکن ہے کہ کسی شخص نے کلیات پر نقل کی ہے، تو فضل اللہ عمید تولکی کا دیوان بھی اسی کے ساتھ نقل کر دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تومسک کو کاتبوں نے تولکی تونکی نقل کیا ہو، تذکرۂ علماے ہند کے مولف مولوی رحمن علی نے ص، ۱۵ پر ایک بزرگ بنام حافظا کوکی کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔ ؎

حافظا کوکی تاشکندی، حافظ کے نام سے مشہور تھے،
سنہ ۹۰۰ھ میں برصغیر
ہند و پاکستان آئے اور اکبر بادشاہ کی ملازمت سے مشرف ہوئے[3]،

تولکی اور کوکی کی قرابت ہمارے خیال کو یقین میں بدل دیتی ہے، نیز خود عمید نے تولکی ہونے کا دعوی کیا ہے۔

غلط کاید بر سقف عمید تولکی کس ۔۔۔ مشہور بکاح معنی زجنس قصیدہ نظم[4]

اسی نعتیہ قصیدے میں عمید رستم کے ملک ماژندران کی طرف بھی اپنی نسبت ظاہر کرتا ہے۔

---

[1] اردو پرشین پوئٹس آف انڈیا، از ڈاکٹر اقبال حسین (انگریزی) جامعہ پٹنہ ۱۹۳۷ء۔ رسالہ اردو جنوری سنہ ۱۹۳۲ء ص ۱۱، [2] بزم مملوکیہ سید صباح الدین ص ۲۰۳ [3] تذکرۂ علمائے ہند از مولانا رحمن علی ص ۱۵۰ کراچی ۱۹۶۱ء [4] کلیات عمید ص ۱۵۳۔

حشر عزّ ما گر رفتہ ہمہ دار ملک کسریٰ — وطنی گزیدہ اکنون بجا خطاؔ و ختن [illegible]

تذکرہ مجمع النفصاء کے مولف نے عمید کو دیلمی وگیلانی الاصل قرار دیا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ پروفیسر محمود شیرانی نے دراصل ایک واضح بات لکھکر ایک بڑے منازعہ کا فیصلہ کر دیا ہے۔ شیرانی صاحب نے ڈاکٹر اقبال حسین کے مطبوعہ مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۴۲ء میں تحریر کیا کہ "پروفیسر (ڈاکٹر اقبال حسین) اس کو سنامی کیوں نہیں کہتے۔ عمید کے اشعار سے پایا جاتا ہے کہ اس کا وطن سنام ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسین بھی عمید کو فارسی کا قدیم ہندوستانی شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے اس بیان کی تائید عمید کے اس مصرعہ سے بھی ہوتی ہے:

تا ابد از وے گرفت سنام نام[۱]

لہذا اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ تومک (روس) عمید کا آبائی وطن تھا، اور ہندوستان میں اس کا اصل جنم بھوم سنام تھا۔ جسے اس نے اپنی شہرت و ناموری کے باعث زندۂ جاوید بنا دیا۔

ولادت | عمید کی تاریخ پیدائش کے تعین میں ہر گز متردد نہیں ہو سکتے۔ عمید نے ایک قصیدے میں اس طرف واضح اشارہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسین نے بھی اس امر کی تائید کی ہے، اور سید صباح الدین صاحب نے مجمع الفصحاء کی رعنا اور ریاض الشعراء میں دی گئی ولادت کی تاریخ [illegible] کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ اور عمید کے اشعار کی مدد سے صحیح تاریخ پیدائش کی ہے۔ جس کی تائید منتخب التواریخ

---

[۱] کلیات عمید، ص ۱۵۱ ۳۵۱ ارلی پرشین پوئٹس آف انڈیا از ڈاکٹر اقبال حسین ص ۱۹۲ [illegible] علیگڑھ ص ۳۰۲ [illegible]

[illegible]

کا مترجم زین کی کتاب ... [illegible]

یا رب اگر چہ شین از زین بود در دل و جگر
خستہ دلبر چگل بستہ کمر زخ یک

در سر نون و دال عمر از لب خاو نون دہا
شکر کہ مرغ ہمتم است بجہد زین شرک[۱]

سید صباح الدین لکھتے ہیں کہ "دوسرے شعر میں ن، اور د کے نو نہ ۵ اور خ، ن ھ کے ۶۵۵ ہوئے۔ شعر میں لب خاو تون یا ہے یعنی ۶۵۵ سے نہ ۵ گھٹا لیا جائے تو ۶۰۱ھ ہوئے"[۲]

علاوہ ازیں عمید کی ولادت کے سنہ کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے بیانات اور بھی بے معنی ہو جاتے ہیں۔ جب ہمیں عمید کے یہاں ایک ایسا تاریخی حوالہ ملتا ہے جس سے سید صباح الدین صاحب کی تحقیق کو مزید قوت ملتا ہے۔ عمید کے ایک قصیدے کا مقطع ہے:

من اندر شست، این صد یک بیت برستم
زبس شصد و پنجاہ ہشت از فضل ربانی[۳]

۶۵۸ھ

است و عمید عمید کے کلام میں ایسا کوئی بھی حوالہ دستیاب نہیں ہوتا جس سے اس حقیقت کا انکشاف ہو سکے۔ البتہ سید صباح الدین، عبدالقادر بدایونی کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ

Yel in The begining of The nun and dal of my age (54) after The year Kha and nun and haa (655 H.) The above shows That Amid lumaki was born in The year 601 H. Tr. Page No 159 - amunta Khad-ut TawariKh)

[۱] بزم مملوکیہ ص ۲۰۲ [۲] ایضاً ص ۲۰۲

[۳] کلیات بدر و عمید ص ۳۲۰

کہ عمید، مولانا شہاب الدین مہمرہ (سنامی) کو استاد کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں۔

"ملک الکلام فخر الملک عمید تولکی (لونکی)، او نیز شہاب الدین مہمرہ را استادی کردہ"[13]

عہدہ مستوفی و مشرف الممالک | عرفات کا مولف تقی اوحدی، عمید کے عہدے سے متعلق لکھتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"معاصر سلطان محمد بلبن بودہ ملازمت آن بادشاہ کردی و در دیوان دولت او باشراف مفوض بودی"[14]

بدر شاشی (تاشقندی) نے بھی ایک قصیدے میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

فخار آل بدری خواجہ عمید شرف وزیر زادۂ شہنشاہ و ابن شاہنشاہ[15]

عمید نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

کار بر عکس است ورنہ خود کہ زیبد کشد شغل اشرافی کہ من بر وجہ احسن کردہ ام[16]

سید صباح الدین صاحب نے مختلف بیانات اور شواہد کی روشنی میں یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچا دی ہے۔ کہ عمید سلطان بلبن کے نہیں۔ بلکہ سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں مستوفی الممالک تھا۔ اس خیال کی تائید مخزن الغرائب کے مولف کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ "مفخر الفضلا خواجہ عمید مستوفی و مشرف ممالک ہندوستان

[13] بحوالہ بزم مملوکیہ ص ۱۵۳ ۔ [14] ایضاً ص ۲۰۵

[15] کلیات بدر و عمید (منقولہ) [16] بحوالہ بزم مملوکیہ ص ۲۰۸

بدورِ عہد سلطان ناصر الدین ؒ

عمیدؔ کی قید و رہائی ۔ عمیدؔ کی حیات کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ اُس کی قید و بند کی زندگی ہے، یہ واقعہ غالباً اُس کی زندگی کے ۵۰ ویں سال سے قبل پیش آیا تھا۔ عمیدؔ نے جیسے قصیدے میں نہایت عجز و انکسار کے ساتھ خود کو ہر داو رسن سے پاک رہنے کا دعویٰ کیا ہے۔ عمیدؔ کے پاس دولت و ثروت کی کمی نہ تھی، اور دربار میں انکا دخل تھا۔ عمیدؔ یقیناً سیاسی ریشہ دوانیوں اور بادشاہ وقت کی غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ ممکن ہے۔ ان کے حاسدوں نے ناصر الدین محمود کے کان بھر دیے ہوں۔ اور بادشاہ بد دل ہو گیا ہو۔ چنانچہ ان حقائق کی نشاندہی عمیدؔ کے مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے۔[1]

در بند من ندید کسی نیم دانگ زر — در دیدہ بہر آن نکنم اختیار بند
در چشم من عزیز نبود و نبود ست کی نہم — بر زر بدہ دوازدہ چون سود خوار بند
دارم چو آب زر سخن و زر کسی دگر — اینجا کشادہ پنجہ و آنجا گمار بند

راقم الحروف کا خیال ہے کہ ..... سنہ ۶۵ھ میں عمیدؔ قید سے رہا ہوئے۔ مندرجہ ذیل شعر میں لفظ "بعد" سے ہماری توجہ اس طرف مرکوز ہوتی ہے۔

من اندر شب این صد و یک بیت بر بستم — ز بعد شصد و پنجاه و هشت از فضل ربانی

عمیدؔ کا انتقال ۔ عمیدؔ کے سالِ وفات کا صحیح طور پر علم نہیں ہے۔ تذکرۃ الشعرا کے مؤلف عبد الغنی نے عمیدؔ کے انتقال کا سنہ ۹۰۰ھ لکھا ہے۔ اس امر کی تصدیق انھوں نے کسی مستند حوالے سے نہیں کی۔ عبد الغنی صاحب کے دیئے ہوئے

---

[1] منتخب التواریخ جلد اول ص ۱۱۲ مطبوعہ ۱۸۶۸ء

سنہ کے اعتبار سے عمید کی عمر ۱۰۰ برس قرار پاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب عمید نے ہوش سنبھالا تو دہلی کے تخت پر سلطان شمس الدین التمش متمکن تھا۔ اور جب ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز ہوئی، تو سلطان علاء الدین خلجی کے رعب و دبدبہ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اگر عمید کی عمر صد سالہ تسلیم کر لی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے تخت پر دس بادشاہوں کو دیکھا تھا، لیکن ڈاکٹر اقبال حسین[۱] اس نکتہ پر ایک نہایت نازک اور قابلِ اعتنا دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: جب سلطان بلبن کا لڑکا محمد سنہ ۶۸۳ھ سے قبل منگولیوں کے حملے میں لقمۂ اجل ہوا۔ تو امیر خسرو اور میر حسن سنجری نے اس دردناک سانحہ پر مراثی لکھے۔ اور حیرت ہے کہ عمید جیسا قادر الکلام اور جلیل القدر شاعر خاموش رہا ہو۔ جس نے بقول خود تمام عمر مداحی اور غزل سرائی کا دعویٰ کیا ہو۔

عمر بسر شدم بسی در مدحت و غزل ۔۔۔ خشک نشد مر قلم تکلفم زصد ہنر[۲]

راقم الحروف کا خیال ہے کہ سنہ ۶۸۳ھ کے آس پاس عمید نے سرائے فانی سے کوچ کیا۔ سید صباح الدین نے بھی یہی نتیجہ نکالا ہے۔ البتہ عمید کے انتقال کی بابت آتشکدہ کے مولف کا بیان سراسر بے بنیاد ہے۔ آتشکدہ کے مولف نے عمید کی عمر ۹۵ برس بتائی ہے۔ اس اعتبار سے عمید کی موت ۶۵۵ھ میں ہو جانی چاہیے تھی لیکن راقم نے عمید کی قید و رہائی کے واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے عمید کا ایک ایسا شعر پیش کیا ہے، جس کے مطابق عمید کا ۶۵۸ھ تک زندہ رہنے کا داخلی ثبوت ملتا ہے۔ (باقی)

۱؎ ارلی پرشین پوئٹس آف انڈیا، ڈاکٹر اقبال حسین ص ۲۰۳

۲؎ کلیات بدر و عمید ص ۳۱۲

عربی شاعری مغلوں کے عہد میں

از، مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

(۲)

مولانا عبد السلام ندوی مرحوم کے اس مضمون کی یہ آخری قسط ہے۔ دار المصنفین کے پیش نظر تھا کہ شعر العجم اور شعر الہند کی طرح شعر العرب کے نام سے عربی ادب کی ایک تاریخ بھی شایع کی جائے، مولانا عبد السلام ندوی مرحوم کے ادبی مذاق کی بنا پر یہ خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی، یہ اب سے چالیس پچاس برس پہلے کی بات تھی، اس وقت عربی میں بھی یہ موضوع بنا تھا اور جرجی زیدان کی تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ہی قابل ذکر کتاب تھی، اب اس موضوع پر بہت کام ہو چکا ہے اور مستند تاریخیں بھی شایع ہو چکی ہیں، لیکن ہم نے مرحوم کے ادب و انشاء کے قدردانوں کی ضیافت طبع کیلئے اسے شائع کر دیا ہے" (معارف)

شہاب الدین حجازی المتوفی ۸۷۵ھ ابو الطیب احمد بن محمد الانصاری الخزرجی القضاعی نے بہت سے لوگوں سے تحصیل علم کی یہاں تک کہ خود بہت بڑا ادیب ہو گیا، اس کی تصنیفات میں چند ادبی مجموعے ہیں (۱) روضۃ الآداب، مطولات، موشحات، ازجال، قطعات، نثریات، حکایات میں اس کو چند ابواب پر مرتب کیا ہے، اور قافیہ کے اعتبار سے ہر باب کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق دی ہے، اس کے نسخے یورپ کے مشہور کتب خانوں میں ہیں، اور کتب خانہ

خدیویہ میں اوس کا نسخہ ۲۰۰ صفحات میں ہے، اور مصر میں سنہ ۱۳۰۶ھ میں چھپ گیا ہے۔

(۲) اللمع الشہابیہ من البروق الحجازیۃ اوس کا دیوان ہے، اور اسکوریال میں موجود ہے۔

(۳) نیل الرائد فی النیل الزائد ایک اور کتاب ہے۔ اور مختلف زمانوں میں نیل کا پانی جس قدر بڑھتا ہے، اوس کی فہرست ہے، اوس کے نسخے پیرس اور برٹش میوزیم میں ہیں۔

(۴) الکناس لمہا الجواری فی الحسان من الجواری } یہ دونوں کتابیں وائنا میں ہیں۔
(۵) تحفۃ الولدان فی الحسان من الغلمان

(۶) کتاب فی العروض۔ برلن اور گوتھا میں موجود ہیں۔ (حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۳۳۰)

(۶۵) ابن سودون المتوفی سنہ ۸۶۸ھ | نور الدین ابو الحسن علی بن سودون البشباوی سنہ ۸۱۰ھ میں قاہرہ میں پیدا ہوا۔ اور وہیں فقہ کی تعلیم حاصل کی، اور شام کا سفر کیا۔ اور دمشق میں سنہ ۸۶۸ھ یا سنہ ۸۶۹ھ میں وفات پائی۔ اوس کی تصنیفات یہ ہیں۔

(۱) نزہۃ النفوس ومضحک العبوس، اشعار ونکات کا مجموعہ ہے، اوس نے اس کے دو حصے کیے ہیں، ایک میں مدحیہ اور سنجیدہ کلام ہے، دوسرے میں ہزلیات ہیں، یورپ وغیرہ کے کتب خانوں میں اوس کے نسخے ہیں، اور سنہ ۱۲۸۰ھ میں مصر میں چھپا ہے۔

(۲) قرۃ الناظر ونزہۃ الخاطر یہ دوسرا مجموعہ ہے جس کو اوس نے نزہۃ النفوس سے انتخاب کیا ہے، کتب خانہ خدیویہ میں اس کا ایک نسخہ ہے۔ اور اوس کے دو مقامات برلن میں ہیں۔

(۶۶) تاج الدین ابن عربشاہ المتوفی سنہ ۹۰۱ھ | تاج الدین عبد الوہاب بن احمد بن محمد بن عربشاہ

ابن ابی بکر القرشی العثمانی مورخ تیمور کا فرزند ہے، وہ طرخان میں پیدا ہوا، اور اپنے باپ کے ساتھ دمشق میں، پھر قاہرہ میں آیا، اور وہیں انتقال کیا، اوس کے متعدد قصائد یورپ کے کتب خانوں میں ہیں، ایک قصیدہ کا نام

(۱) شفاء الکلم بمدح النبی الکریم ہے، اوس میں ایک مقدمہ اور خاتمہ بھی اور وہ گوتا میں ہے۔ دوسرے کا نام

(۲) مرشد الناسک لاداء المناسک، بارہ سو اشعار کا ہے، اور گوتا میں موجود ہے۔

اوس کے اور بھی بہت سے قصائد برلن میں ہیں۔

۱۷۔ قنصوہ الغوری المتوفی ۹۲۲ھ	دہ سلاطین مالیک میں سے ایک بادشاہ ہے۔ سلطان سلیم عثمانی کے ساتھ اوس سے نے جو جنگ کی تھی، اوس میں مرج دابق میں قتل کیا ہوا

وہ شاعر تھا، اور ایک دیوان اپنی یادگار میں چھوڑا ہے، اوس کا ایک نسخہ وائنا میں ہے، کتاب المنقطع الظریف علی الموشح الشریف بھی اوس کی ہے، اور وہ گوتا میں ہے، کشف الظنون میں سیوطی کی ایک کتاب کا بھی یہی نام مذکور ہے۔

ان کے علاوہ مصر و شام میں دوسرے شعراء نے بھی شہرت حاصل کی لیکن چونکہ انھوں نے اپنی ادبی یادگاریں بہت کم چھوڑی ہیں، اس لیے ہم نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے، البتہ صرف چند شعراء کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔

۱۸۔ برہان الدین الجعبری (م ۹۲۳ھ)	اس کا دیوان ۱۸۲۴ء میں مصر میں چھپا ہے۔
۱۹۔ شمس الدین الخیاط الصفدی (م ۹۵۰ھ)	اس کا دیوان اسکوریال میں ہے۔

۲۰۔ ابن سعید الخطابی جو ابن ... الحلبی کے نام سے مشہور ہے، اوس کا ... ایک دیوان اسکوریال میں ہے، اور ایک کتاب سر الفصاحۃ کتب خانہ خدیویہ میں۔

۲۱- اسماعیل الفرناطی ابو الولید المتوفی [illegible] ۔ ان کی تصنیفات میں کتاب البدیع فی وصف الربیع ہے، جس میں اندلسیوں کے منتخب اشعار ہیں اور وہ اسکوریال میں ہے

۲۲- ابن العطار الجزیری متوفی [illegible] ۔ موشحات بنویہ کا مصنف ہے اور وہ گوتھا میں ہے۔

۲۳- جلال الدین بن خطیب داریا متوفی [illegible] ۔ اوس کا ایک قصیدہ برلن میں ہے۔

۲۴- عز الدین بن ابی الفرات القاہری (م [illegible]) اس کا دیوان برلن میں ہے۔

۲۵- تاج الدین بن ابی الوفا المقدسی (م [illegible]) اس کا ایک دیوان حروف تہجی کے مطابق برلن میں ہے۔

۲۶- ابن عیسی المقدسی ۔ اوس نے [illegible] میں ایک کتاب "الجوہر المکنون فی سبعۃ الفنون" فنون شعر میں لکھی، جس کا ایک نسخہ اسکوریال میں ہے۔

۲۷- شہاب الدین ابن الہائم اوس کا ایک دیوان بہ ترتیب حروف تہجی ڈاکناپیرس اور اسکوریال میں ہے۔

۲۸- ابن الجیعان القبطی متوفی [illegible] ۔ اوس کی ایک کتاب "مسائل الدموع علی ما تفرق من المجموع" برٹش میوزیم میں ہے۔

۲۹- شہاب الدین احمد الغزنوی (م [illegible]) اس کا دیوان آکسفورڈ میں ہے۔

۳۰- ابن ملیک الحموی (م [illegible]) اوس کا دیوان [illegible] میں بیروت میں چھپا ہے۔

۳۱- محمد رشید الحلبی (م [illegible]) ۔ اوس نے اپنے معاصرین کے اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے، جو برلن میں ہے۔

مغلوں کے دور میں مصر و شام سے باہر کے شعراء:

۱- صفی الدین الحلی المتوفی [illegible] مغلوں کے عہد حکومت میں مصر و شام سے باہر جو شعراء

ے مدون میں سب سے زیادہ مشہور یہی ہے۔ اوس کا نام عبد العزیز بن سرایا
ابی القاسم ہے، اور صفی الدین الطائی السنبسی الحلی لقب سے مشہور ہے ۶۷۷ھ
پیدا ہوا ۷۰۰ھ ماردین کی سلطنت ارتقیہ کا شاعر تھا۔ اور سلطان الملک الناصر
میں ۷۲۶ھ میں قاہرہ کا سفر کیا، اور اوس کی مدح میں متنبی کے اس قصیدہ
کا مطلع یہ ہے۔

بابی الشموس الجانحات غواربا۔

ایک قصیدہ لکھا، پھر ماردین میں آیا۔ اور ۷۵۰ھ میں بغداد میں وفات پائی
ریں قصائد اور قطعات نہایت خوبی کے ساتھ لکھا ہے، اور فصاحت و شستگی
مشہور ہے، اوس کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) دیوان۔ اوس کو اوس نے خود جمع کیا ہے، اور مختلف ابواب مثلاً فخر
وصف اخوانیات، غزل، اور مرثیہ وغیرہ پر مرتب کیا ہے، وہ ۱۲۹۷ھ میں
میں اور ۱۲۹۷ھ میں بیروت میں ۵۰۰ صفحات میں چھپا ہے۔ اور اوس میں
کی نثر اور ہزل اور تمثیلیہ کی مثالیں بھی شامل ہیں، اوس کے قلمی نسخے یورپ کے
کتب خانوں اور کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہیں۔ اور اس میں جو ظریفانہ
ار ہیں، اون پر ہمارے زمانہ کے لوگوں نے تنقید کی ہے، اوس کی شاعری کے
ن عام اتفاق ہے، کہ وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شاعر ہے، شاعری میں اوس نے
باتیں ایجاد کی ہیں، جن میں ایک موشح مضمن ہے، چنانچہ ایک موشح میں ابونواس
قصیدہ بائیہ کی تضمین کی ہے۔

(۲) درر النحور فی مدائح الملک المنصور یعنی "قصائد ارتقیات" یہ وہ قصیدے حروف

بھی پڑھی، ہر قصیدہ کے اول و آخر میں ایک حرف کا التزام کیا ہے، اور وہ ملک المنصور ابی الفتح بن ارتق الخاتونی فرمان روائے ماردین کی مدح میں ہیں، اور اس کے نسخے لیڈن، پیرس، اسکوریال اور کتب خانہ خدیویہ میں ہیں، اور ۱۸۹۲ء میں اس کے دیوان کے ساتھ بیروت میں چھپا ہے، اس کے علاوہ ۱۸۸۶ء میں قاہرہ میں بھی چھپا ہے۔

(۳) العاطل الحالی والمرخص الغالی۔ زجل، موالی، کان وکان اور قوما میں ہے۔ اور اس کا ایک نسخہ منشن میں ہے۔

(۴) الکافیۃ البدیعیہ۔ لغت میں ہے، اور کتب خانہ خدیویہ وغیرہ میں موجود ہے، اور ۱۸۹۲ء میں اوس کے دیوان کے ساتھ چھپا ہے۔

(۵) ایک قصیدہ صالح الارتقی کی مدح میں اس کا ترجمہ لیٹن زبان میں ہوا، اور ۱۸۱۶ء میں لیپزگ میں چھپا۔

(۶) وصف الصید بالبندق۔ گولی سے شکار کرنے کا طریقہ اس میں بتایا ہے، اور چونکہ یہ طریقہ اب رائج نہیں ہے، اس لیے اس میں ایک فائدہ ہے، اوس نے اس کا نام "الخدمۃ الجلیلہ" رکھا ہے۔ اور اس کا ایک نسخہ برلن میں ہے۔

(۷) دیوان صفوۃ الشعراء وخلاصۃ البلغاء۔ اسکوریال میں ہے،

(۸) الاغلاطی لغوی غلطیوں کا معجم ہے۔ اور اسکوریال میں ہے(فوات جلد ۲ ص ۲۹)

عراق وجزیرہ کے شعراء

(۲) امیر خلیل بن احمد بن سلیمان سیف الدین الایوبی، المتوفی ۷۶۳ھ ایوبی خاندان کا ہے، اوس کی ایک کتاب "الدر النضید" دکن یا برن میں ایک مجموعہ اشعار ہے، اس کا دیوان یا جب ترکی میں ہے، اور اسی کا ایک نسخہ برلن میں ہے، اس کا دادا سلیمان

بھی شاعر تھا۔

(۳) علاء الدین المار دینی امیر خلیل کا شاعر ہے، اور اوس نے اس کے اور دوسروں کے متعلق نظمیں لکھی ہیں، جس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لیڈن اور پیٹرسبرگ میں ہے

یمنی شعراء

(۴) شرف الدین جار اللہ الآثاری القرشی۔ اس کی تصنیفات حسب ذیل ہیں،

المتوفی ۸۲۸ھ

(۱) دیوان مفتاح باب الفرج۔ نعت میں ہے، اس میں بدیع کے تمام انواع کو لیا ہے۔ اور اس کو ایک مقدمہ، دس باب اور خاتمہ پر مرتب کیا ہے، اور بانت سعاد اور قصیدہ بردہ کے محسنات بھی اس میں شامل کیے ہیں۔

(۲) البدیعیات۔ برلن میں ہے۔

(۳) الحلاوۃ السکریہ۔ یہ سو اشعار کا رجز ہے، اور اس کی ایک شرح بھی ہے جس کا نام القلادۃ الجوہریہ ہے، اور اس کا ایک نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ہے۔

(۴) العروض۔ یہ بھی کتب خانہ خدیویہ میں ہے۔

(۵) المتوکل علی اللہ المطہر بن محمد الامام الزیدی، المتوفی ۸۷۹ھ۔ اس کے دیوان کو اس کے بیٹے یحییٰ نے مرتب کیا۔ اور اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔

(۶) ابوبکر بن عبد اللہ العیدروس الیمنی المتوفی ۹۱۴ھ برلن میں ہے۔

فارس وغیرہ کے شعراء

(۷) قاضی نظام الدین الاصبہانی (۶۸۰ھ) کا دیوان جس کا نام دیوان المنشآت ہے، برٹش میوزیم میں ہے۔

۸۔ احمد بن محمد بن المعظم الرازی نے ۶۳۱ھ میں "المقامات الاثنی عشریہ" لکھا، جس کو سلیمان الحریری نے ۱۲۸۰ھ میں پیرس سے شائع کیا۔

۹۔ فضل اللہ بن الحمید الزور فی الاصل الیمنی المولد ۶۸۶ھ میں :۔

(۱) الذیل الخبذیات الابیوردی کی طرح ۹۲ صفحون میں الیضیات فی الحکم کو نظم کیا۔

(۲) کفایۃ الکافیہ۔ کافیہ ابن الحاجب کی شرح لکھی، اور یہ دونون کتابیں کتب خانہ خدیویہ میں ہیں۔

۱۰۔ ہندو شاہ بن سنجر الصاحبی الیغرائی آٹھوین صدی کا آدمی ہے، اور اوس کی کتاب "مدار والادب" برٹش میوزیم میں ہے۔

۱۱۔ جنید بن محمود۔ مظفر الدین شاہ یحیی سلطان کرمان کیلئے ۹۰۰ھ میں کتاب "حدائق الانوار۔ دبدائع الاشعار" لکھی جس کا ایک نسخہ پیرس میں ہے۔

۱۲۔ اختیار الدین بن غیاث الدین الحسینی قاضی ہرات المتوفی ۹۲۸ھ کی تصنیفات یہ ہیں

(۱) کتاب اساس الاقتباس یہ آیات، احادیث، حکم، امثال وغیرہ کا مجموعہ ہے، اوس نے کو ابواب وفصول پر منقسم کیا ہے، جن کا نام کلمات" اسطر" اور احرف مختلف حالات کے لحاظ سے رکھا ہے، غرض یہ اون باتون کا مجموعہ ہے، جو خلفاء وسلاطین کیلئے لکھی جاتی ہیں۔ یا وہ مواعظ وحکم جو پیش کیے جاتے ہیں، اوس سے انشاء پردیز رسائل کے لکھنے میں مدد لیجا سکتی ہے۔ اور وہ ۱۲۹۸ھ میں قسطنطنیہ میں چھپ گئی ہے۔

(۲) مقامات الحسینی فی نور عثمانیہ۔

مغربی شعراء

۱۳۔ برہان الدین بن زقاعہ المتوفی ۸۱۶ھ۔ اوس کے دینی اور غیر دینی اشعار کا دیوان

پیٹرسبرگ اور برلن میں ہے۔

۱۴۔ شہاب الدین احمد بن محمد بن المخلوف التونسی المتوفی ۸۹۹ھ۔ سلطان عثمان حفصی کا شاعر ہے، اور اس کی تصنیفات ہیں۔

(۱) دیوان ہے۔ جو حروف تہجی کے مطابق مرتب کیا گیا ہے، اوس کے نسخے برلن لیڈن، پیرس اور پیٹرسبرگ میں ہیں، اور وہ بیروت میں ۱۳۰۲ھ میں چھپا ہے، دوسرا

(۲) موشح ہے جو برلن میں ہے۔

۱۵۔ شہاب الدین القسطینی المتوفی ۹۰۵ھ۔ اوس کا دیوان وائنا میں ہے

اندلسی شعراء

۱۶۔ ابن مقاتل المالقی المتوفی ۹۳۰ھ اوس کے ازجال برلن میں ہیں

۱۷۔ ابن خاتمۃ الانصاری المتوفی ۷۷۰ھ۔ مریہ کا باشندہ تھا، اوس کی تصنیفات ہیں۔

(۱) دیوان اسکوریال میں ہے۔

دوسری کتاب (۲) رائق التحلیہ فی فائق التوریہ ایک مجموعۂ اشعار ہے، جو اسکوریال میں ہے

تیسری کتاب (۳) تحصیل غرض القاصد فی تفصیل مرض الوافد برلن میں ہے۔

۱۸۔ ابو عبید اللہ بن زمرک لسان الدین بن خطیب کا شاگرد ہے، اور اون کے بعد اونکی جگہ پر منذیر ہوا۔ اوس کا ایک قصیدہ برلن میں ہے۔

۱۹۔ ابو الحسن سلام الاشبیلی الباہلی۔ المتوفی ۶۳۹ھ۔ اس کی ایک کتاب الذخائر والاعلاق فی آداب النفوس ومکارم الاخلاق ۱۲۹۸ھ میں مصر میں چھپی ہے۔

شعر الہند:۔ مولفہ مولانا عبد السلام ندوی۔ حصہ اول　قیمت ۴؍ —

حصہ دوم　〃　〃　۴؍ —

استدراک

مولانا شیخ حیدر حسن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ

از مولانا مجیب اللہ ندوی

ندوہ کے فضلاء نے فکری و علمی اعتبار سے جن شخصیتوں اور اساتذہ کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا اور ان کے فیض صحبت سے وہ علم و فضل میں ممتاز حیثیت کے مالک ہوئے ان میں علامہ شبلی کے علاوہ چار پانچ شخصیتیں ممتاز ہیں، یعنی مولانا سید سلیمان ندوی، شیخ تقی الدین ہلالی، مولانا حفیظ اللہ صاحب، مولانا حیدر حسن خان صاحب، مولانا شبلی صاحب فقیہ اور مولانا شاہ حلیم عطا صاحب وغیرہ

استاذ محترم مولانا عبد السلام قدوائی ندوی نے مولانا حیدر حسن خان صاحب پر جو مفصل مضمون معارف کی تین قسطوں میں لکھا ہے وہ اتنا جامع ہے کہ اب اس میں مزید اضافہ کی ضرورت نہیں ہے، حیات شبلی کے بعد علامہ شبلی پر تو کچھ لکھنے کی کم ہی گنجائش ہے، البتہ دوسرے اساتذہ کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں پر تفصیل سے کچھ لکھ دینے کی ضرورت ہے تاکہ ندوہ کی تاریخ میں ان کے مقام کی صحیح تعیین ہو سکے

راقم الحروف نے مولانا شبلی فقیہ پر ان کی وفات دسمبر ۱۹۸۲ء کے بعد ہی ایک مختصر مضمون معارف میں لکھ دیا تھا اب مولانا شاہ حلیم عطا صاحب پر کچھ لکھنے کا ارادہ ہے جن کا سید صاحب کے بعد راقم الحروف پر سب سے زیادہ علمی احسان ہے، استاذ محترم

مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے مولانا حیدر حسن خان صاحب کے سلسلہ میں جو کچھ لکھدیا ہے، اس پر مشکل ہی سے کچھ اضافہ ہو سکتا ہے،

شیخ سے جتنا تعلق مولانا کو ہے ان کے تمام شاگردوں میں کم ہی لوگوں کو ہے، ان کا سارا بیان شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ ہے، اس لیے سب سے زیادہ قابل اعتماد ہو تاہم صرف دو تین باتیں مزید تحقیق طلب ہیں، میں نے مولانا کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور چاہا کہ وہ خود ہی اس کی مزید وضاحت فرما دیں مگر مولانا نے اپنی وسعت ظرف کی بنا پر مجھے ہی لکھنے کا حکم دیا، جو ذیل میں پیش ہے،

مولانا نے مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی اور نواب صدیق حسن صاحب مرحوم کے ذکر میں نزہۃ الخواطر کے بیان پر اعتماد کر کے مولانا سید نذیر حسین محدث کے سن ولادت اور ان سے نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے تلمذ کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تصدیق دوسرے بیانوں سے نہیں ہوتی ۔

مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے سن ولادت کے سلسلہ میں عون المعبود کے مصنف لکھتے ہیں[1]

ولد فی وطنہ سورج گڈھ من مضافات البہار سنۃ عشرین بعد الالف والمائتین وقیل سنۃ خمس وعشرین والاول اصح	مولانا نذیر حسین صاحب اپنے وطن سورج گڈھ میں جو بہار کے دیہاتوں میں ہے ۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور ان کی ولادت ۱۲۲۵ھ میں بتائی گئی ہے مگر پہلا بیان زیادہ صحیح ہے،

---

[1] عون المعبود ج ۱ ص ۳ مقدمہ کتاب۔

واکلاول اصح لکھنے کے بعد بعض ثقات کا زبانی بیان اور تحریری حوالہ بھی نقل کیا ہے، پھر انھوں نے مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی کا بیان جو انھوں نے ان کی شرح غایۃ المقصود سے نقل کیا ہے، جس میں انھوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گمان ہے ۱۲۲۵ھ میں ان کی ولادت ہوئی، [1]

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ ان کی ولادت ۱۲۲۵ھ میں نہیں بلکہ ۱۲۳۰ھ میں ہوئی۔

مولانا اسی مضمون میں نواب صدیق حسن خان صاحب کے اساتذہ کے ذکر میں مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کا نام بھی لیا ہے مگر سیرت والاجاہی موسوم بہ مآثر صدیقی سے پتہ چلتا ہے کہ نواب صاحب انکے شاگرد نہیں تھے، البتہ ان سے ملاقات ہوئی تھی، اور صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا، سیرت والاجاہی کے مصنف نواب علی حسن خان صاحب لکھتے ہیں۔

(نواب صاحب نے) مولوی سید نذیر حسین صاحب کو دیکھا مگر اتفاق صحبت کم ہوا۔[2] (ج ۲ ص ۱۵)

---

[1] میں نے اس قسم کے بیانات کی بنیاد پر ۱۲۲۵ھ لکھا ہے، زیادہ تحقیق نہیں کی (ع ق)

[2] یہی صحبت تو پہلے شاگردی کہلاتی تھی، قاضی ابو یوسف اور امام محمدؒ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں، ان کی اس شاگردی کو صاحب ابی حنیفہ کے الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے، نواب صاحب کو میاں صاحب کی مجلس میں استفادہ کی بنا پر بعض لوگوں نے شاگرد کہہ دیا ہے، انھوں نے باضابطہ ان سے سبق نہیں پڑھا تھا، (ع ق)

ادبیات

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری

غم نہیں، آہ نہیں، سوز نہیں، ساز نہیں
عشق خود راز تو ہے پردۂ در راز نہیں

چھیڑ دوں تذکرۂ عشق جہاں سے چاہوں
یہ وہ افسانہ ہے جس کا کوئی آغاز نہیں

آہ کرتا ہوں تو اس خوف سے کانپ اٹھتا ہوں
کہ زمانہ تو کہیں گوش بر آواز نہیں

آج بھی یوں تو نہیں جوشِ محبت میں کمی
ہاں مگر دل کے تڑپنے کا وہ انداز نہیں

کون منزل ہے مری دسترسِ شوق سے دور
صحنِ گلشن ہی مرا عالمِ پرواز نہیں

اس قدر ہو گئے مانوسِ قفس اے جوہرؔ
اب ہمیں شکوۂ کوتاہیٔ پرواز نہیں

جذباتِ سالک

از جناب سالکؔ رحمانی

جلوۂ حسن ہے کیا ہوشربا الا اللہ
کھو گئے راہ میں اربابِ وفا الا اللہ

طبعِ آذر نے تراشے ہیں ہزاروں اصنام
ابنِ آذر کا مگر ایک خدا الا اللہ

عشق ہر گام سبک سیر ہے منزل بکنار
قافلہ عقل کا ہے بانگِ درا الا اللہ

ہوں اگر قلب و جگر سوزِ یقیں سے محروم
گرمیٔ فکر و عمل عینِ خطا الا اللہ

زیست اک موجۂ گرداب فنا تھی لیکن
چشمِ ساقی نے دیا جامِ بقا الا اللہ

کون اب محرمِ اسرارِ جنوں ہے سالکؔ
شش جہت سے یہی آتی ہے صدا الا اللہ

مطبوعاتِ جدیدہ

تذکرہ علمائے مبارکپور ۔ مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت قدرے بہتر صفحات ۲۹۲ مجلد مع گردپوش قیمت عـــہ پتہ سلمان وحسان، دائرہ ملیہ مبارکپور۔ اعظم گڈھ۔ یو۔ پی

ہمارے ضلع اعظم گڈھ کے مردم خیز قصبات میں مبارکپور بھی ہے۔ جو پارچہ بافی کی صنعت کے علاوہ ہر دور میں علم وفن کا بھی مرکز رہا ہے، اب بھی یہاں ہر طبقہ ومسلک کے مدارس اور اہل علم موجود ہیں، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کو شیراز ہند جونپور کی تاریخ سے شغف ہے، وہ وقتاً فوقتاً مضامین لکھتے رہتے ہیں، اب انھوں نے سرکار جونپور میں شامل اپنے خاص وطن مبارکپور اور اس کے مضافات کے مرحوم علمار ومشائخ کا یہ تذکرہ لکھا ہے، شروع میں قصبہ اور اس کے قریب کی اہم بستیوں کی مختصر علمی ودینی تاریخ تحریر کی گئی ہے۔ لائق مصنف نے مختلف عقیدہ وخیال اور ہر مسلک کے مصنفین، مدرسین، شعرار اور بزرگوں کے حالات لکھے ہیں، شیعہ اور اسماعیلی فرقے کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے۔ حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان، انکے فرزند شاہ ابو اسحٰق محدث لہراوی، اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی اور کئی دوسرے ممتاز علما وصوفیا کے ذکر جمیل سے یہ کتاب مزین ہے۔ حکیم مولانا محمد احمد لہراوی کے متعلق لکھا گیا ہے کہ "لہرا میں انتقال فرمایا" حالانکہ انکا انتقال مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے اطراف راجہ پور سکرور نامی گاؤں میں ہوا تھا۔ راقم خود جنازہ میں شریک تھا۔ ان کی تصنیفات

تو ان حضرات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ مصنف کا دارومدار سماعی واقعات پر ہے۔ اس لئے دو حضرات کے تذکروں میں بھی اس طرح سہو کا امکان ہے۔ مولانا شبلی ندوی مرحوم کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے کہ "ان کے دور میں ضلع کے تین شبلی ندوہ سے فارغ ہوئے، اس لیے ان کو متکلم کے نام سے یاد کیا گیا" جبکہ باقی دونوں شبلی ندوہ کے فارغین میں نہ تھے، علامہ شبلیؒ اس کے معتمد تعلیم اور موسسین میں اور مولانا شبلی فقیہ جیراجپوری ممتاز اساتذہ میں تھے، تذکرہ کی ابتدا ملک شہ نی سے کی گئی ہے۔ اور ان کو سپہ سالار مسعود غازیؒ (م ۴۲۴ھ) کا ہمعصر قرار دیا گیا ہے۔ راقم کو ایک معتبر شخص نے رسالہ عاشقیہ (قلمی) کے حوالہ سے بتایا کہ وہ میر علی عاشقان سرائے میری (م ۹۴۹ھ) کے مرید تھے، کہیں کہیں مصنف کا قلم خودستائی سے بھی آلودہ ہوگیا ہے، مگر ان باتوں سے قطع نظر یہ کتاب تلاش و محنت سے لکھی گئی ہے۔ اور اس کیلئے مصنف اپنے ہم وطنوں کی تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

العرب والہند فی عہد الرسالۃ (عربی) مترجمہ جناب عبدالعزیز عزت عبدالجلیل صاحب متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ و خوبصورت، ٹائپ، ۱۴۰ صفحے قیمت ۳۵ قرش، ناشر الہیئۃ العامۃ المصریہ للکتاب مصر،

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے "عرب و ہند عہد رسالت میں" کے نام سے جو کتاب اردو میں لکھی تھی، اب اس کا اُن کے ایک مصری دوست عبدالعزیز عزت جلیل نے عربی ترجمہ کرکے شائع کیا ہے، اس میں دور رسالت میں عرب و ہند کے تجارتی تعلقات، اس زمانہ میں عرب جانے والی ہندوستانی مصنوعات اور مروج اشیاء، وہاں آباد ہندوستانی قوموں اور اُن کی بستیوں اور اُن کے مذہبی عقائد اور اُن کو اسلام کا پیغام دیئے جانے کا ذکر ہے، اور ہند و اہل ہند سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی واقفیت، دربار رسالت میں آنیوالے ہندوراجاؤں کے وفود ہدایا اور دونوں ملکوں کی زبانو

[illegible]

[illegible] ساحت [illegible]

[illegible] کی [illegible]

[illegible]

کا جی [illegible]

[illegible] اسلامی [illegible]

جانب [illegible]

الاسلام [illegible] مختلف [illegible]

بھی [illegible]

انکشافات کے [illegible]

اساس [illegible]

مساوات اسلامی [illegible]

[illegible]

[illegible]

اسلام [illegible] لوگ [illegible]

کرکے دکھایا گیا ہے، [illegible] اسلامی مساوات [illegible]

نسب کی مذمت کی گئی ہے، [illegible] نسب کے [illegible]

ہوتا ہے بھی میں تربیت و تقوی [illegible] سب [illegible]

[illegible]

ضرورت: [illegible]

معارف کے

و مطالعہ

دایک درجن

جرین جلد دوم

لصحابہ جلد

سین کے

محرز کربلا

یرالصحابہ جلد

تابعین

[illegible] اور تشبیہات کی ضرورت [illegible]

تشبیہ و استعارات کی دلآویزی بھی،

نظام شمسی کی پہلی تمثیل کانفرنس از جناب بدیع الزماں صاحب اعظمی [illegible]

کتابت طباعت بہتر، صفحات ۱۰، قیمت ۵۰ پیسے، پتہ: بدیع الزماں اعظمی، مسکہ پرنٹنگ ورکس ادب، محلہ کرمی ٹوڑ، اعظم گڈھ،

جناب بدیع الزماں اعظمی علامہ شبلیؒ کے ہم وطن اور صاحب ذوق شخص ہیں، ان کے مضامین اور سائنسی مضامین مختلف رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں، اور انھوں نے بچوں کے لئے بعض مفید کتابیں بھی لکھی ہیں، اس دلچسپ تمثیل میں سورج اور نو مشہور سیاروں نے حصہ لے کر اپنے متعلق دلچسپ انکشافات کئے ہیں، جو بچوں کے لئے معلومات افزا ہیں، یہ گذشتہ سال شبلی کالج میں اسٹیج کی جا چکی اور اس پر اردو اکاڈمی اتر پردیش نے انعام بھی دیا ہے،

مساوات اسلامی اور مسئلہ کفاءت مرتبہ مولوی سید محمد عبید اللہ بستوی قاسمی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۴، قیمت ۵۰ پیسے، پتہ: سید ظفر الحسن بستوی، شیشے والی مسجد، مرلی نگر، حسین گنج، لکھنؤ،

اسلام نے نکاح میں کفو کی رعایت کا جو حکم دیا ہے، اس مقالہ میں اس کی بعض وجہیں تحریر کرکے دکھایا گیا ہے، کہ یہ نہ تو اسلامی مساوات کے خلاف ہے، اور نہ ان روایتوں کے، جن میں حسب نسب کی مذمت کی گئی ہے، علاوہ ازیں حسب نسب کے علاوہ کفو کا اعتبار اور کئی باتوں میں بھی ہوتا ہے جن میں دین و تقوی سب میں مقدم ہے، یہ مقالہ نگار کی طالب علمی کے زمانہ کی تحریر ہے، اس لئے کور کسر رہ گئی ہے، "ض"

[illegible] کی تصنیفات

[illegible] تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے [illegible] مطالعہ [illegible] فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم [illegible] ایک [illegible]

[illegible]اجرین جلد دوم قیمت : ۱۲-۰۰

[illegible]یر الصحابہ جلد ۶ " ۹-۰۳

[illegible] امام حسین کے حالات زندگی کے ضمن میں واقعہ حرتہ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

[illegible] سیر الصحابہ جلد ۷

[illegible] تابعین : ۹۰ اکابر تابعین کے سوانح،

قیمت : ۱۲-۵۰

[illegible] تاریخ اسلام اول (عہد رسالت و خلافت راشدہ)

قیمت : ۱۲-۵۰

[illegible] تاریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۱۱-۰۰

[illegible] تاریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اوّل)

قیمت : ۱۴-۰۰

[illegible] تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)

قیمت : ۱۵-۰۰

۹- اسلام اور عربی تمدن قیمت: ۱۵-۶۵

۱۰- عرب کی موجودہ حکومتیں،

قیمت

۱۱- ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲- دین رحمت قیمت ۱۰-۰۰

۱۳- خریطۂ جواہر ۴-۷۵

زندگی کی آخری کتاب

۱۴- حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب، طرز انشاء اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا ثانی، دلکش، دلچسپ، قابل مطالعہ اس میں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت : ۲۷-۵۰

عاشقانہ اور رنگین جذبات کی مصوری کی گئی ہے، ان مثنویوں میں زبان و بیان کی صفائی کی بجائے تشبیہ و استعارات کی دلآویزی ہے،

نظام شمسی کی ایک تمثیل کا نفرنس از جناب بدیع الزمان صاحب اعظمی تقطیع خورد، کاغذ کتابت طباعت بہتر صفحات ۱۰، قیمت:۔ ۵ پیسے، پتہ بدیع الزمان اعظمی سکریٹری، باب ادب اعلیٰ کری ٹولہ، اعظم گڈھ،

جناب بدیع الزمان اعظمی علامہ شبلیؒ کے ہم وطن اور صاحب ذوق شخص ہیں، ان کے جغرافیائی اور سائنسی مضامین مختلف رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں، اور انھوں نے بچوں کے لئے بعض مفید کتابیں بھی لکھی ہیں، اس دلچسپ تمثیل میں سورج اور نو مشہور سیاروں نے حصہ لے کر اپنے متعلق دلچسپ انکشافات کئے ہیں، جو بچوں کے لئے معلومات افزا ہیں، یہ گذشتہ سال شبلی کالج میں اسٹیج کی جا چکی ہے اور اس پر اردو اکاڈمی اتر پردیش نے انعام بھی دیا ہے،

مساوات اسلامی اور مسئلہ کفاءت مرتبہ مولوی سید محمد عبید اللہ بستوی قاسمی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۴، قیمت ۵۰ پیسے، پتہ: سید ظفر احسن بستوی، تیلی والی مسجد، مرلی نگر حسین گنج، لکھنؤ،

اسلام نے نکاح میں کفو کی رعایت کا جو حکم دیا ہے، اس مقالہ میں اس کی بعض وجہیں تحریر کرکے دکھایا گیا ہے، کہ یہ نہ تو اسلامی مساوات کے خلاف ہے، اور نہ ان روایتوں کے، جن میں حسب نسب کی مذمت کی گئی ہے، علاوہ ازیں حسب نسب کے علاوہ کفو کا اعتبار اور کئی باتوں میں بھی ہوتا ہے جن میں دین و تقویٰ سب میں مقدم ہے، یہ مقالہ نگار کی طالب علمی کے زمانہ کی تحریر ہے، اس لئے کور کسر رہ گئی ہے، ض

ضرورت:۔ دار المصنفین کو اچھے کاتبوں کی ضرورت ہے، اجرت معقول دیجائیگی نمونہ کے ساتھ خط و کتابت کریں۔ منیجر

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی و تحقیقی ادبی و تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

مہاجرین جلد دوم قیمت: ۱۲-۰۰

سیر الصحابہ جلد ۹ " ۹-۳۰

امام حسین کے معرکہ زندگی کے ضمن میں واقعۂ کربلا کی غم انگیز تفصیل۔

سیر الصحابہ جلد ۷

۴- تابعین: ۹۰۰ اکابر تابعین کے سوانح،

قیمت: ۱۲-۵۰

تاریخ اسلام اوّل (عہد رسالت و خلافت راشدہ)

قیمت: ۱۲-۵۰

تاریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۱۱-۰۰

تاریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اوّل)

قیمت: ۱۴-۰۰

تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)

قیمت: ۱۵-۰۰

۹- اسلام اور عربی تمدن قیمت: ۱۵-۹۵

۱۰- عرب کی موجودہ حکومتیں،

قیمت

۱۱- ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲- دین رحمت قیمت ۱۰-۰۰

۱۳- خریطۂ جواہر ۳-۷۵

زندگی کی آخری کتاب

۱۴- حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی و ملی اور سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب و طرز انشاء اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا ثانی، دلکش، دلچسپ قابل مطالعہ، اس میں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت: ۲۷-۵۰

[illegible]

اور

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]